

اخلاقی و روحانی بیماریوں کے نقصانات اور ان کا علاج

www.KitaboSunnat.com

ترکِ رذائل

احمد جاوید

مرتب
ڈاکٹر محمد امین

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب

← عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔

← مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق و اجازت کے بعد آپ لوڈ (Upload)

کی جاتی ہیں۔

← دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹوکاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات نشر و اشاعت کی مکمل اجازت ہے۔

☆ تنبیہ ☆

← کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔

← ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی و شرعی جرم ہے۔

﴿اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں﴾

← نشر و اشاعت، کتب کی خرید و فروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں۔

kitabosunnat@gmail.com

www.KitaboSunnat.com

ترکِ رزائل

یعنی اخلاقی بیماریوں کے نقصانات اور ان کا علاج

احمد جاوید

مرتب: ڈاکٹر محمد امین

www.KitaboSunnat.com

تحریک اصلاحِ تعلیم (ٹرسٹ)

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

طبع اول: ۲۰۰۵

طبع دوم: ۲۰۱۲

پتہ تحریک اصلاح تعلیم (ٹرسٹ): A-71 فیصل ٹاؤن، لاہور

فون: 0300-4609522--0300-4354673

اہتمام: پورب اکادمی اسلام آباد

فون: 0301-5595861

ISBN: 978-969-8917-74-6

تقسیم کار:

پورب اکادمی، اسلام آباد

فہرست مضامین

۶	باب اول: تمہیدی مباحث
۲۲	باب دوم: امراضِ احوال (طبیعت) اور ان کا علاج
۲۳	نفاق
۲۸	حبِ دنیا
۳۳	تکبر
۳۸	حبِ جاہ
۴۳	ریا
۵۰	عُجب
۵۸	غضب
۶۳	حسد
۶۷	بغض و کینہ
۷۱	حُبین (بز دلی)
۷۱	حُبین
۷۵	کسل
۸۰	بخل
۸۳	حرص و طمع
۸۷	قساوت قلبی

۹۳	شہوات نفس
۹۳	شکم پروری
۹۷	جنس پرستی
۱۰۳	بعض معاشرتی خرابیاں
۱۰۴	سخت مزاجی
۱۰۹	بے مروتی
۱۱۳	بیوی بچوں کے ساتھ سختی
۱۱۹	بیٹے کو بیٹی پر ترجیح دینا
۱۲۳	رسوم و رواج کی بے جا پابندی
۱۲۸	کام چوری
۱۳۳	باب سوم: امراض افعال (ارادہ) اور ان کا علاج
	آفات لسان
۱۳۴	جھوٹ
۱۳۸	غیبت
۱۴۸	بہتان تراشی
۱۵۱	چغلی
۱۵۵	فحش کلامی
۱۵۸	خوشامد
۱۶۳	وعدہ خلافی

۱۷۱	بد نظری
۱۷۵	طول امل
۱۸۳	بے ادبی اور غلو ادب
۱۹۶	بدعت
۲۰۳	تجسس
۲۰۷	اسراف
۲۱۱	خود رائی
۲۲۳	لہو و لعب
۲۲۹	تن آسانی
۲۳۳	فریب دہی
۲۳۸	مایوسی و ڈپریشن
۲۴۸	غصب حقوق
۲۵۵	کسب حرام
۲۶۱	باب چہارم: امراض ذہن اور ان کا علاج
۲۶۲	بے یقینی
۲۷۱	تشکیک
۲۷۶	حیلہ جوئی
۲۸۲	مکاری و عیاری
۲۸۷	عبادات میں عدم یکسوئی

پیش لفظ

تزکیہ نفس کے لیے مسلمانوں کے قائم کردہ ادارے کی ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس میں مسترشدین اپنے مربی سے غایت درجے کی محبت اور اس کی انتہائی تکریم کرتے ہیں جو بسا اوقات مبالغے پر جانچ ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے جناب احمد جاوید سے محبت کرنے والے اور ان سے استفادہ کرنے والے بعض افراد اگر انہیں غزالی دوراں یا رومی ثانی سمجھتے ہیں تو اس کا جواز سمجھ میں آتا ہے۔ البتہ ہماری رائے میں احمد جاوید صاحب کی جاذبیت کی ایک وجہ یہ ہے کہ تزکیہ نفس کے حوالے سے وہ نہ صرف اسلاف کے علم، تجربے اور تقویٰ کے امین ہیں بلکہ ان کے تنقیدی شعور نے انہیں تصوف کی مروجہ خرابیوں سے دور ہونے کا موقع بھی فراہم کیا ہے اور اہل تزکیہ کی روایتی دانش کے ساتھ جدید نفسیات اور فلسفے میں ان کا تعمق اس پر مستزاد ہے۔

مجھ جیسے لوگ یہ محسوس کرتے تھے کہ جناب احمد جاوید کی عزالت پسندی اور شہرت سے گریز کی وجہ سے ان سے استفادہ محدود ہے لہذا اس کا کوئی حل نکالنا چاہیے (یہ سطور بھی ان کو دکھائے بغیر شائع کی جا رہی ہیں ورنہ وہ اس کی بھی اجازت نہ دیتے)۔ ہم نے انہیں تصنیف و تالیف کی طرف مائل کرنا چاہا لیکن ان کے شاعر و ادیب ہونے اور قلم پر دسترس رکھنے کے باوجود ہمیں اس میں کامیابی نہیں ہوئی اور ان کی 'تصنیف رجال' کی مشغولیت اور مخصوص ذوق و مزاج اس میں آڑے آیا۔ اس کا حل راقم نے یہ سوچا کہ کسی خاص موضوع پر ان سے تنہائی میں گفتگو کروں اور بعد میں اسے قلم بند کر لوں لیکن یہ تجربہ ابتداء ہی میں ناکام ہو گیا کیونکہ معقولات کا فاضل ہونے کی وجہ سے ان کا اسلوب عمیق اور اداق ہوتا ہے اور راقم سوئے اتفاق سے، کبھی

معقولات کا طالب علم نہیں رہا لہذا ان کی گفتگو میرے سر کے اوپر سے گزر جاتی اور میں اسے بعد میں صحیح طور پر قلم بند نہ کر پاتا۔ اس پر انہوں نے میری یہ تجویز مان لی کہ وہ مجھے املا کروا دیا کریں، اگرچہ میری تجاویز اور مشورے (بلکہ دخل در معقولات) ساتھ جاری رہتا جسے وہ مناسب سمجھتے تو قبول کر لیتے۔ ان کی (اور کچھ میری) مصروفیت کی وجہ سے ہم اس کے لیے ہفتے میں صرف ایک دن نکال پاتے اور وہ بھی عصر سے مغرب تک اور اس میں بھی رمضان شریف کے علاوہ، بوجہ، کافی ناغے ہوتے رہتے۔ یوں یہ کتاب، جو اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے، تقریباً اڑھائی سال میں مکمل ہوئی۔ پھر اس کی ترتیب و تخریج کے بعد اشاعت کے روایتی مراحل نے بے حال کیے رکھا۔ بہر حال، اب یہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

اس کام کا بنیادی خاکہ یہ تھا کہ اصلاح اعمال و اخلاق کے دو اساسی پہلو ہیں: ایک رذائل و منکرات و معصیت سے بچنا اور دوسرے خیر، معروف اور فضائل کا اکتساب۔ خیال یہ تھا کہ تین چار سو صفحات کی ایک کتاب میں ان دونوں پہلوؤں کو سمیٹا جاسکے گا لیکن جب ترک رذائل والے حصے کے مرتب کرنے میں طویل مدت لگ گئی اور مباحث بھی کچھ پھیل گئے تو خیال آیا کہ اسے حصہ اول کے طور پر الگ شائع کر دیا جائے۔ دوسرے حصے پر اس وقت تقریباً اسی سست رفتار سے کام جاری ہے اور مکمل ہونے پر اسے الگ سے شائع کر دیا جائے گا، ان شاء اللہ۔

میرے ذہن میں جناب احمد جاوید صاحب کے ساتھ مل کر کام کرنے کے مزید کئی منصوبے ہیں مثلاً:

- قرآن حکیم کی تفسیر، تزکیہ و تربیت کے نقطہ نظر سے
- مغربی نفسیات اور فلسفے پر نقد اور مسلم نفسیات اور فلسفے کی عصری تناظر میں تشکیل جدید و تدوین نو۔
- عصر حاضر میں تزکیہ نفس کے ادارے کی تشکیل نو۔

ظاہر ہے یہ سب بڑے علمی منصوبے ہیں (اور ان پر مستزاد وہ عملی منصوبہ ہے جس میں راقم کے پیش نظر احمد جاوید صاحب کے زیر نگرانی ایک نئی طرز کے تربیتی مرکز [جدید خانقاہ] کا قیام ہے جہاں طالبانِ تزکیہ کچھ عرصہ قیام کر سکیں) لیکن عملاً کیفیت یہ ہے کہ ان کے پاس وقت ہے (اور نہ میرے پاس)۔ منجملہ دیگر دینی مصروفیات کے وقت کا بڑا حصہ ہماری ملازمتیں لے جاتی ہیں اور صحت کا معاملہ بھی دونوں طرف کچھ ایسا ہی ہے۔ اپنی برسوں کی خواہش اور کوشش کے باوجود ابھی تک ایسے وسائل میسر نہیں آ سکے کہ وہ یا میں ان کاموں کے لیے فارغ ہو سکیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اخلاص عطا فرمائیں، کام کے موانع دور فرمائیں اور اپنی رضا و توفیق سے نوازیں۔

اس کام کی افادیت اور فنی پہلوؤں پر گفتگو میں دوسرے اہل علم کے لیے اٹھا رکھتا ہوں۔

”ربنا تقبل منا انک انت السميع العليم“

محمد امین

لاہور
کیم مارچ ۲۰۰۵ء

باب اول

تمہیدی مباحث

دین کا اصل مقصود

س: اسلام کا اصل مقصود کیا ہے؟

ج: اللہ کی رضا کا حصول، جیسا کہ قرآن حکیم میں ہے:

﴿مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا﴾ (الفتح ۲۸: ۲۹)

”محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھی ہیں وہ کافروں کے مقابلے میں سخت اور آپس میں مہربان ہیں۔ تم انہیں رکوع میں اور سجدے میں دیکھو گے۔ وہ اللہ کا فضل اور اس کی رضامندی کی طلب میں لگے رہتے ہیں۔

نیز دیکھئے البقرہ ۲: ۲۰۷ اور المائدہ ۵: ۱۶ وغیرہ۔

س: اس مقصد کے حصول کا ذریعہ کیا ہے؟

ج: اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اطاعت جیسا کہ قرآن حکیم میں ہے: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ

وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾ (الذاریات ۵۱: ۵۲)

”اور میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لئے پیدا کیا کہ وہ میری بندگی اور اطاعت کریں۔“

﴿وَمَنْ يَأْتِهِ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصَّالِحَاتِ فَأُولَٰئِكَ لَهُمُ الدَّرَجَاتُ الْأَعْلَىٰ﴾ (طہ ۲۰: ۷۵)

”اور جو شخص اللہ کے ہاں مومن ہو کر آئے گا اور اس نے نیک عمل بھی کیے

ہوں گے تو ایسے لوگوں کے لئے بڑے اور اونچے درجے ہوں گے۔“

نیز دیکھئے المائدہ ۵: ۱۱۹، اور آل عمران ۳: ۸۵ وغیرہ۔

س: بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ اصل مقصد جنت کا حصول ہے؟

ج: غالباً ”اصل مقصد“ کے الفاظ سے غلط فہمی پیدا ہوئی ہے ورنہ جب اللہ تعالیٰ کی رضا کا یقینی نتیجہ جنت ہے تو دونوں لازم و ملزوم ہیں جیسا کہ قرآن حکیم میں کئی جگہ فرمایا گیا ہے (دیکھیے مثلاً المائدہ ۵: ۱۱۹، اور التوبہ ۹: ۱۰۰)

س: بعض لوگ کہتے ہیں کہ اصل چیز تقرب الی اللہ ہے؟

ج: رضائے الہی کے حصول اور تقرب الی اللہ میں کوئی اصولی فرق نہیں ہے، محض عنوان کا فرق ہے۔ تقرب کا نتیجہ بھی جنت ہے (الواقعہ ۵۶: ۱۱، ۸۸، ۸۹ وغیرہ) اور مومن جنت میں اعلیٰ درجات کی تمنا اسی لئے کرتے ہیں کہ وہاں تقرب زیادہ ہے۔

س: بعض لوگ اس کے لئے وصول الی اللہ کی اصطلاح بھی استعمال کرتے ہیں؟

ج: یہ قرآن و سنت کی نہیں، بعض صوفیاء کی اصطلاح ہے۔ اگر اس کے ڈانڈے وحدۃ الوجود اور حلول سے ملائے جائیں تو یہ ناقابل قبول ہے۔ اور اگر اس کے معنی بعض عملی صوفیاء کی طرح ”اللہ کے رنگ میں رنگے جانا“ لئے جائیں تو یہ شرعی اعتبار سے درست ہیں (دیکھیے البقرہ ۲: ۱۳۸) اس لحاظ سے وصول الی اللہ کے معنی تقرب الی اللہ ہی کے ہوں گے گو وصول میں شدت اور مبالغہ ہے۔ تاہم یہ اصطلاح چونکہ اپنے غلط استعمال کی ایک طویل تاریخ رکھتی ہے لہذا اسے استعمال کر کے ہم محفوظ پوزیشن میں نہیں رہیں گے اور جس چیز میں خرابی کا احتمال ہو اس کا ترک اولیٰ ہے، لہذا اس مقصد کے لئے یہ اصطلاح استعمال نہیں کرنی چاہیے۔

س: صبغة اللہ کی یہ کیفیت کیسے حاصل کی جاسکتی ہے؟

ج: اللہ کا رنگ آدمی پر اس وقت چڑھتا ہے جب وہ اللہ سے محبت کرنے لگے اور اللہ اس سے محبت کرنے لگے اور اس کا طریقہ ہے اطاعت رسول (ﷺ) یعنی اتباع سنت

جیسا کہ قرآن حکیم میں ہے:

﴿قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ﴾ (آل عمران ۳: ۳۱)

”اے نبی! آپ ان لوگوں سے کہیں کہ اگر تم واقعی اللہ سے محبت

کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ بھی تم سے محبت کرے گا۔“

س: اللہ کا محبوب بننے کے لئے اتباع سنت ضروری ہے لیکن کیا محبت بننے کے لئے بھی یہ ضروری ہے؟

ج: اتباع سنت پورے دین کا لازمی تقاضا ہے۔ پورے دین کا مطلب ہے ایمان اور عمل صالح (البینہ ۹۸: ۷ اور مریم ۹۶: ۱۹ وغیرہ)۔ عمل میں آنحضرت ﷺ کی اتباع کا حکم ابھی آپ نے پڑھا، ایمان میں بھی اتباع لازمی ہے بلکہ ایمان پورے کا پورا اتباع رسول ﷺ ہی کا نام ہے۔

س: ایمان کو اتباع رسول کہنے کا مطلب کیا ہے؟

ج: پہلا مطلب یہ ہے کہ ایمان ہم رسول اکرم ﷺ کی صداقت پر یقین کرتے ہوئے ہی لاتے ہیں، اس جہت سے محرک ایمان آپ ﷺ کی اتباع ٹھہرا۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ ایمان جن عقائد کا مجموعہ ہے انہیں لفظ لفظاً انہی معانی میں مانا جائے جو رسول اکرم ﷺ سے واضح اور یقینی طور پر ثابت ہیں۔ ان میں کسی بھی عنوان سے کوئی تبدیلی یا کمی بیشی جائز نہیں۔

س: صحیح ایمان لانے کی لازمی پہچان کیا ہے؟

ج: مقتضیات ایمان پر عمل یعنی ایمان کا ہر جزو ہم سے کچھ اعمال کا تقاضا کرتا ہے۔ ۱۔ تقاضے کو پورا کر کے ہی یہ ثابت ہوگا کہ ہم ایمان پر اچھی طرح سے قائم ہیں۔

س: مقتضیات ایمان پر عمل کے لازمی نتائج کیا ہیں جو ہر کس و ناس مشاہدہ کر سکے؟

ج: ارکان ایمان تین ہیں: ① توحید ② رسالت ③ معاد (آخرت)

توحید کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی شرک بلکہ احتمال شرک کے بھی قریب نہ جائے، صرف اسی کی عبادت کرے، صرف اسی سے مدد مانگے، صرف اسی کو خالق و مالک اور رازق جانے۔ زندگی اور موت، عزت و ذلت، خوشی و غم، نفع اور نقصان سب اسی کے قبضہ قدرت میں سمجھے وغیرہ۔ رسالت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ غیر مشروط طور پر نبی کریم ﷺ کی پیروی کرے اور معاد کا تقاضا یہ ہے کہ معصیت کو ترک کرے اور آخرت کو یاد رکھے۔

س: یہ سب باتیں تسلیم! مگر ہوتا یہ ہے کہ بعض اوقات آدمی چاہنے کے باوجود مطلوبہ اعمال بجا نہیں لاپاتا اس کا سبب کیا ہے؟

ج: اس کے بنیادی اسباب دو ہیں: ① ضعف ارادہ ② نقص طبیعت

س: ارادے اور طبیعت کی اصلاح کیسے کی جائے؟

ج: نیت کو خالص کیا جائے یعنی ہر کام اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے اور اس کے احکام کو مدنظر رکھتے ہوئے کیا جائے۔ یہاں تک کہ حسن نیت بالآخر شعور سے تجاوز کر کے طبیعت کا داعیہ بن جائے۔ یہی خلاص ہے۔

س: حسن نیت پیدا کرنے کی تدابیر کیا ہیں؟

ج: اس کی تدابیر کے بیان سے پہلے یہ سمجھ لیا کہ طبیعت میں بگاڑ پیدا ہونے کے کچھ اسباب و محرکات ارادی و شعوری ہوتے ہیں اور کچھ غیر ارادی و لا شعوری۔

پہلے ہم فسادِ نیت کے ارادی و شعوری اسباب کے ازالے کی تدابیر بیان

کرتے ہیں:

— فسادِ نیت کے ارادی اسباب کا علاج ہے تعلق بالصلوٰۃ، اور

— فسادِ نیت کے شعوری اسباب کا علاج ہے تعلق بالقرآن۔

س: اور فسادِ نیت کے غیر اختیاری اور لاشعوری اسباب کا علاج کیا ہے؟

ج: فسادِ نیت کے غیر ارادی محرکات کا علاج استغفار ہے اور اس کے لاشعوری محرکات کا علاج ذکر ہے۔

س: تعلق بالصلوٰۃ سے آپ کی کیا مراد ہے؟

ج: نماز میں بہتری کی تمام صورتیں اختیار کرنا مثلاً اذان کا جواب دینا، اچھی طرح وضو کرنا، زینت اختیار کرنا، ذکر کرتے ہوئے مسجد جانا، جماعت سے پہلے اچھی نماز کے لئے دعا کرنا، اقامت کا جواب دینا، قرأت پر دھیان جمانا..... وغیرہ

س: اور تعلق بالقرآن سے آپ کی مراد کیا ہے؟

ج: تلاوت کرنا

مقررہ حدود میں رہ کر تدبیر کرنا۔

قرآنی احکام کی تعمیل کرنا۔

س: فسادِ نیت کے غیر اختیاری محرکات کا علاج آپ نے استغفار بتایا تھا۔ استغفار سے یہاں کیا مراد ہے؟

ج: اس کا مطلب ہے زبان کو طلب مغفرت کے مسنون صیغوں میں مشغول رکھنا اور دل کا اس کی کیفیت سے معمور رہنا۔

س: اور ذکر سے کیا مراد ہے؟

ج: ذکر سے مراد یہ ہے کہ تسبیح، تحمید، تہلیل، تقدیس وغیرہ کے مسنون کلمات (مثلاً سبحان اللہ، الحمد للہ، اللہ اکبر، لا الہ الا اللہ، لاحول ولا قوۃ الا باللہ وغیرہ) میں زبان کو ایسے اہتمام کے ساتھ مشغول رکھنا کہ دل اس کا اثر محسوس کرے۔

س: آپ نے بتایا تھا کہ طبیعت کے تزکیے کا نتیجہ اخلاص ہے، یہ بھی بتا دیجیے کہ طبیعت کے تزکیے کے اصول کیا ہیں؟

ج: یہ اصول تین ہیں: ① تعلیم ② تذکیر، اور ③ صحبت
— تعلیم سے مراد ہے دین کے مقاصد اور ان کے حصول کے ذرائع کا علم۔
— تذکیر سے مراد ہے ان مقاصد اور ذرائع کا استحضار، اور
— صحبت سے مراد ہے صحیح العقیدہ و العمل حضرات کی ہم نشینی و رفاقت۔

س: اور طبیعت کے تزکیے کی عملی شرط کیا ہے؟

ج: رغبت پیدا کرنا
س: اور ترغیب کے ذرائع کیا ہیں؟
ج: ترغیب کے ذرائع تین ہیں:

۱۔ محبت، ذاتِ رسول ﷺ ہے

۲۔ محبت، اسوۂ رسول ﷺ سے

۳۔ استحضارِ جنت

س: فسادِ نیت کی بات شروع ہونے سے وہ بات تو بیچ میں ہی رہ گئی کہ حسن نیت پیدا کرنے کی تدابیر کیا ہیں؟

ج: حسن نیت پیدا کرنے کی اصولی تدابیر دو ہیں، کو شخصی ضروریات کے حوالے سے ان کی تفصیل میں کچھ اختلاف ہو سکتا ہے:

ایک: ہر کام کو اللہ کے نام سے شروع کرنا، اللہ کی حمد پر ختم کرنا اور اس کے مطلوبہ نتائج کے حصول کے لئے اپنی کوششوں اور صلاحیتوں سے زیادہ اللہ کے فضل پر انحصار کرنا۔

دوم: جس کام کے بارے میں یہ شبہ پیدا ہو جائے کہ اس کے پیچھے حسن نیت کا فرما نہیں ہے اس کام کو، اس کی نوعیت کے اعتبار سے، یا تو: (۱) چھوڑ دینا، یا (۲) موقوف کر دینا، یا (۳) دہرا لینا۔

س: یہ دونوں تدابیر اجمالاً تو سمجھ میں آ گئیں لیکن بعض چیزوں کی وضاحت مطلوب ہے مثلاً پہلی تدبیر میں کیا اللہ کے فضل پر انحصار کرنے کا مطلب یہ تو نہیں کہ اپنی سعی کے مقابلے میں دعا پر زیادہ زور اور انحصار مطلوب ہے؟

ج: یہ بات جزو الصبح ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوشش اور استعداد دونوں اللہ ہی کی دین ہیں لہذا اللہ کی ان نعمتوں کو پوری طرح استعمال کرتے ہوئے نتائج کے حصول کے لیے دعا کرتے رہنا زیادہ مفید عمل ہے۔ بلکہ کوشش بھی تو دراصل زبانِ حال سے دعا ہی ہے۔

س: اور دوسری تدبیر میں آپ نے فسادِ نیت کے ساتھ کیے جانے والے کاموں کے بارے میں جو تجاویز دی ہیں ان کی تفصیل کیا ہے؟

ج: پہلی تجویز ایسے کام کے ترک کی تھی۔ اس تجویز پر عمل اس صورت میں ہوگا جب وہ کام محض ایک شخص کے ذاتی فائدے کا ہو اور شرعی طور پر واجب نہ ہو۔ اس کی مثال محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

اس تاجر کی ہے جو ناج کی تجارت کرتا ہو۔ اگر اس کی نیت میں یہ فساد آجائے کہ وہ ذخیرہ اندوزی سے زیادہ منافع کمائے تو اسے چاہیے کہ اجناس کی تجارت چھوڑ کر کسی دوسری چیز کی تجارت شروع کر دے۔

دوسری تجویز ایسے کام کو وقتی طور پر موقوف کر دینے کی تھی۔ اس تجویز پر عمل ان دنیاوی کاموں میں ہوگا جن میں شرعی فائدہ بھی ہے مثلاً ایک شخص ایک مسجد و مدر سے میں ملازم ہے اور اس کے ذمہ جمعہ کا وعظ کہنا بھی ہے۔ اب اگر اس کی نیت میں فساد آجائے اور فی سبیل اللہ لوگوں کی تعلیم اور اصلاح کی بجائے خود کو بڑا عالم اور مقرر کہلوانا اس کی نیت میں شامل ہو جائے تو اسے چاہیے کہ وعظ کہنا اس وقت تک موقوف کر دے جب تک اس کی نیت کی اصلاح نہ ہو جائے اور وعظ کی بجائے وہ تدریس کی یا کوئی دوسری ذمہ داری اپنے سر لے لے۔

تیسری تجویز اس عمل کو دہرانے کی تھی۔ اس کی مثال نفلی عبادات و اذکار ہیں مثلاً ایک آدمی نے مسجد میں ادا میں کے نفل پڑھے اور اس میں ریا کی نیت شامل ہو گئی تو وہ گھر آ کر ان کو دہرا لے تاکہ اس کا اجر ضائع نہ ہو۔

س: بعض لوگوں کا خیال ہے کہ خوف سے طبیعت کا تزکیہ ہوتا ہے جبکہ بعض کی رائے میں جزا کی امید اس میں موثر ہوتی ہے؟ آپ کی رائے اس بارے میں کیا ہے؟

ج: یہ دونوں خیال جزوی صداقت رکھتے ہیں۔ تزکیہ طبیعت میں ترغیب بھی ضروری ہے اور ترہیب بھی۔ طبیعت کی وہ سطح جو جہتوں اور ان کے داعیات سے عبارت ہے، ترغیب سے متاثر ہوتی ہے اور طبیعت کا وہ مرتبہ جو ذہنی اور عقلی ہے وہ ترہیب سے اثر قبول کرتا ہے۔

س: ایسا کیونکر ہے؟

ج: اس کی وجہ یہ ہے کہ طبعی داعیات کا ہدف جلب مسرت ہے جبکہ ذہن اور عقل کا مقصود دفع مضرت ہے۔ جس کا ہدف جلب مسرت ہوگا اس میں ترغیب ہی کی قبولیت پائی جائے گی۔ وہ جنت کی طرف تو مائل ہو سکتی ہے دوزخ کی آگ کے بیان سے متاثر نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح مقصود اگر دفع مضرت ہو تو جنت کی کشش دوزخ کے خوف سے مغلوب ہو جائے گی۔

س: کیا ترغیب و ترہیب کوئی تبلیغی اور تعلیمی امر ہے؟

ج: کسی حد تک تو ہے لیکن اس کا مناسب ترین وسیلہ صحبت ہے جس کی تعریف ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔

س: یہ جاننے کے باوجود کہ ترغیب و ترہیب کا مدار صحبت پر ہے، یہ سوال اپنی جگہ پر برقرار رہتا ہے کہ آخر ان کے کچھ اصول اور ذرائع تو ہوں گے جن کی روشنی میں اور جن کی مدد سے یہ دونوں عمل بخوبی سرانجام دیے جاسکیں؟

ج: ترغیب کے ذرائع کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں یعنی:

۱۔ ذات رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت

۲۔ اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت

۳۔ جنت کا استحضار

جہاں تک ترہیب کا تعلق ہے تو اس کا اصول ہے ”اللہ کی پکڑ کے تصور کو زندہ حالت میں رکھنا“۔

س: ترغیب و ترہیب کے نتیجے میں وہ کون سے فضائل حاصل ہوتے ہیں جو شریعت میں بھی معتبر ہیں؟

ج: تفصیل سے قطع نظر کرتے ہوئے، مختصر یہ سمجھ لیں کہ ترغیب سے بالآخر ترکِ غفلت کی فضیلت میسر آتی ہے اور ترہیب سے ترکِ معصیت کی توفیق حاصل ہوتی ہے اور پوری شریعت ترکِ غفلت اور ترکِ معصیت ہی کا نام ہے۔

س: ترکِ غفلت اور ترکِ معصیت کو پوری شریعت آپ نے کس اعتبار سے کہا ہے؟

ج: دیکھیے! شریعت کے دو اصولی تقاضے ہیں: صحیح عقیدہ اور صالح عمل یا یوں کہہ لیں کہ سچا ایمان اور پکی اطاعت، اور یہ دونوں حالتیں ترکِ غفلت اور ترکِ معصیت ہی سے پیدا ہوتی ہیں۔

س: طہیعت کا اگر ترکیہ ہو جائے تو اس کا حاصل کیا ہے؟

ج: طہیعت کے ترکیے کے نتیجے میں تین بنیادی چیزیں حاصل ہوتی ہیں:

① اخلاص ② تقویٰ، اور ③ محبت

اخلاص سے مراد ہے نیت، ارادے، شعور اور عمل سب میں اللہ کے حوالے سے یکسوئی، یعنی ہر کام کرتے وقت نیت یہ ہو کہ یہ اللہ کی خوشنودی کے لئے کرنا ہے اور پھر اسے کرتے ہوئے جن مشکلات اور تکالیف کا سامنا کرنا پڑے انہیں اللہ کی رضا اور خوشنودی کے لئے انگیز کرنا اور سہہ جانا۔

تقویٰ بندگی کی سب سے اساسی حالت کا نام ہے اور یہ اللہ کے اس خوف سے پیدا ہوتا ہے جس کا مبنی اور مبداء اللہ کی محبت ہے۔

محبت یہ ہے کہ ہر جذب و کشش پر اللہ کی کشش غالب آجائے۔

س: تقویٰ کے معنی عام طور پر بچنے اور پرہیزگاری کے کئے جاتے ہیں (یعنی اللہ کی معصیت سے بچنا اور منکرات سے پرہیز) لیکن آپ نے تو اس میں محبت کو بھی شامل کر دیا ہے؟

ج: تقویٰ کے معنی یقیناً معصیت سے بچنے اور منکرات سے پرہیز ہی کے ہیں لیکن یہ معانی ہمارے ذکر کردہ مفہوم سے متصادم نہیں ہیں۔ اسے یوں سمجھیے کہ تقویٰ دراصل فطرت کا وہ اولین داعیہ ہے جو شر سے بچنے اور خیر کی طرف لپکنے سے عبارت ہے۔ خیر کی طرف لپکنے کے لئے شر سے بچنا ہی فطرت سلیم کا بنیادی ڈھانچہ ہے اور ایمان ہو یا اعمال، دونوں کی قبولیت اسی پر منحصر ہے اور تمام فضائل دینی اگر کسی ایک فضیلت میں مشمول دیکھے جاسکتے ہیں تو وہ یہی تقویٰ ہے۔

اور جب ہم یہ کہتے ہیں کہ تقویٰ کے مفہوم میں اللہ کا خوف اور اللہ کی محبت دونوں جمع ہیں تو یہ بات نقل اور عقل دونوں سے ثابت ہے۔ یہاں بظاہر خوف اور امید ایک دوسرے کی ضد لگتے ہیں لیکن حقیقتاً خوف سے امید کی تکمیل ہوتی ہے اور امید سے خوف کی اور وہ اصول جو ان کو ایک دوسرے کا تکمیلی عنصر بناتا ہے وہ تقویٰ ہے۔ گویا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایمان تقویٰ ہی کا نام ہے، وہی ایمان جسے رکھنے والے، قرآن کے مطابق، اللہ سے شدید محبت رکھتے ہیں (البقرہ ۲: ۱۶۵) اس گفتگو سے تقویٰ اور محبت میں ظاہری غیریت کی تردید ہو گئی۔

عقلی دلیل یہ ہے کہ اگر تقویٰ اس خوف کا نام ہے جو محبت سے مختلف ہے تو متقی کو خدا سے بھاگنا چاہیے درآں حالیکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ تقویٰ جس قرب کا سبب ہے اس سے اوپر کسی تقرب کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا تو گویا تقویٰ میں کارفرما خوف کوئی سادہ سانسفستانی خوف نہیں ہے بلکہ یہ اللہ جل جلالہ کے ساتھ بندے کے مثالی اور مکمل تعلق کی صحیح ماہیت

کا اظہار ہے یعنی یہ کہ اللہ کا خوف اس سے دوری پر نہ اکسائے اور اس کی محبت گستاخی اور شوخی کی طرف مائل نہ کرے۔ یہ مطلوب توازن اگر کسی چیز سے حاصل ہو سکتا ہے تو وہ یقیناً تقویٰ کے علاوہ کچھ اور نہیں۔

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے مومن کے بارے میں فرمایا ہے:

﴿ اٰمَنُوْا قٰنَتْ اٰنَاءَ اللَّیْلِ سٰجِدًا وَّ قٰنَمٰی حٰذِرُ الْاٰخِرَةِ وِیَرْجُوْا
رَحْمَةً رَّبِّہٖ..... ﴾ (الزمر ۹:۳۹)

”جورات کی گھڑیوں میں سجدے اور قیام کی حالت میں عاجزی کرتا ہے، آخرت سے ڈرتا اور اپنے رب کی رحمت کا امیدوار ہوتا ہے۔“

س: تزکیہ نفس کے عمل کا آغاز کہاں سے کرنا چاہیے؟

ج: طبیعت کے تزکیے یا دوسرے لفظوں میں اخلاق کے تزکیہ سے۔

س: طبیعت یا اخلاق سے کیا مراد ہے؟

ج: طبیعت انسان کی بنیادی ساخت کو کہتے ہیں جس سے اس کا شعور اور پورا مزاج تشکیل پاتا ہے گویا انسان کے سوچنے کا انداز اور اس کے رد عمل کا مخصوص طریقہ طبیعت ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ طبیعت کے میلانات اخلاق کہلاتے ہیں یا دوسرے لفظوں میں طبیعت کا میلان جب واضح اور مستقل ہو جائے تو اسے اخلاق کہتے ہیں

س: اخلاق کی کچھ اور وضاحت کیجیے؟

ج: طبیعت میں موجود وہ صلاحیتیں جو فکر و عمل کی عکاسی کرتی ہیں انہیں اخلاق کہا جاتا ہے۔ مثال سے یوں سمجھیے کہ غصہ طبیعت کا ایک عنصر ہے یہی غصہ انسانی فکر و عمل کا ایک خاص رخ متعین کرتا ہے۔ یہ رخ صحیح بھی ہو سکتا ہے اور غلط بھی۔ اخلاق اچھے

بھی ہو سکتے ہیں اور برے بھی۔ تزکیہ نفس کا مقصد یہ ہے کہ اخلاق کی اچھائی کو ابھارا جائے اور برائی کو دبایا جائے۔

س: کیا اس سے یہ سمجھا جائے کہ تزکیہ نفس کا اصل مقصد تزکیہ اخلاق ہی ہے؟

ج: جی ہاں! بلکہ یہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا کہ تزکیہ نفس کا ہدف تزکیہ اخلاق ہی ہے کیونکہ تمام انسانی فضائل اخلاق کے تزکیے سے مشروط ہیں۔

س: اس تزکیہ مقصود کی طرف عملی پیش رفت کس طرح کی جاسکتی ہے؟

ج: اس کیلئے سب سے پہلے وہ مسلمہ فضیلت ڈھونڈی جاتی ہے جس کا حصول پورے انسانی وجود کی بہتری کا یقینی سبب ہو۔

س: یہ فضیلت کیوں کہ عام ہے لہذا ضروری ہے کہ ہمارے پاس ایک محکم سند ہو جو ہمیں یہ بتائے کہ ہماری تخلیق کا مقصد ہی اس فضیلت کا حصول ہے۔

ج: اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں فرمایا ہے: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾ (الذاریات ۵۱: ۵۶)

”اور میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری بندگی

اور اطاعت کریں۔“

س: وہ فضیلت کیا ہے؟

ج: وہ فضیلت عبودیت یا بندگی ہے جو تمام فضائل کی لازمی بنیاد ہے۔ ہمارا وجود جن

اجزاء سے عبارت ہے ان تمام اجزاء کو اس فضیلت کے حصول کی کوشش میں شریک

ہونا چاہیے یعنی ہماری عقل، ہمارا نفس اور ہماری طبیعت سبھی کو بندگی کے رنگ میں

رنگا ہونا چاہیے۔ یہ ہے تزکیہ نفس کا اولین اور انتہائی داعیہ۔

س: اخلاق اور بندگی میں کیا تعلق ہے؟

ج: اخلاق اور بندگی میں بہت گہرا تعلق ہے کیونکہ جب تک بندگی ہماری طبیعت میں سرایت نہیں کرے گی اس وقت تک ہمارے بندہ ہونے کا کوئی مطلب نہیں ہے۔ کیونکہ آدھی بندگی حال ہے اور آدھی عمل، اور اخلاق ان دونوں کا احاطہ کرتے ہیں۔

س: آپ کی اس بات سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اخلاق احوال بھی ہیں اور اعمال بھی؟

ج: یہ صحیح ہے، البتہ اولیت احوال کو حاصل ہے کیونکہ اعمال میں مطلوبہ بہتری احوال میں بہتری پیدا کیے بغیر ممکن نہیں۔

س: یہاں احوال سے کیا مراد ہے؟

ج: احوال کی آسان تعریف یہ ہے کہ طبیعت کچھ چیزوں سے مغلوب ہو کر اپنے اندر ایک ایسی فضا پیدا کر لیتی ہے کہ اس کا سارا نظام اس فضا کے تابع ہو جاتا ہے۔ اس پوری صورتحال کو احوال کہتے ہیں یعنی طبیعت میں بندگی رائج ہو جائے تو اس کا ہر میلان، ہر فعل اور تاثر بندگی کی کیفیت سے معمور ہو جاتا ہے، اسے طبیعت کا حال کہیں گے۔ اس بات کو یوں بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ حال کسی چیز کا وہ ذاتی وصف ہے جس کی بنیاد پر اس کی کوئی تعریف متعین ہوتی ہے جیسے ٹھنڈا پانی اور گرم پانی۔ یہاں ٹھنڈک اور گرمی پانی کے دو مختلف احوال ہیں جنہوں نے ایک ہی چیز کی دو مختلف تعریفیں متعین کر دیں۔

س: یہاں تک تو سمجھ میں آ گیا کہ تزکیہ اخلاق کا عمل تزکیہ احوال سے شروع ہوتا ہے تاہم اس کی تفصیل ابھی باقی ہے کہ تزکیہ احوال میں آغاز کار کس حال سے کیا جانا چاہیے؟

ج: اس کا کوئی مستقل ضابطہ نہیں ہے۔ یہ بات ہر فرد کے حسبِ حال طے کی جاتی ہے۔
 بنیادی اصول یہ ہے کہ بڑی رکاوٹ کو پہلے دور کیا جائے۔ وہ بڑی رکاوٹ ہر شخص
 میں مختلف ہو سکتی ہے مثلاً کسی میں تکبر، کسی میں نفاق، کسی میں حسد وغیرہ۔

س: عام طور پر بڑی رکاوٹیں کون کون سی ہوتی ہیں؟

ج: جیسے نفاق، حبِ دنیا، تکبر، حبِ جاہ، عُجب، غضب، حسد، حُبْن، کسل، بخل، حرص،
 قساوت قلبی وغیرہ۔

باب دوم

امراضِ احوال (طبیعت) اور ان کا علاج

نفاق	حب دنیا	تکبر
حب جاہ	ریا	عجب
غضب	حسد	بغض و کینہ
جبن	کسل	بخل
حرص و طمع	قساوت قلبی	شکم پروری
جنس پرستی	سخت مزاجی	بے مروتی
بیوی بچوں کے ساتھ سختی	بیٹے کو بیٹی پر ترجیح دینا	
رسوم و رواج کی بیجا پابندی	کام چوری	

نفاق

حکم ربانی

— يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ - كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللَّهِ أَنْ تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ - ﴿٢٤١﴾ (الصف: ۲۴)

مومنو! تم ایسی باتیں کیوں کہا کرتے ہو جو کیا نہیں کرتے۔ خدا اس بات سے سخت بیزار ہے کہ ایسی بات کہو جو کرو نہیں۔

— إِنَّ الْمُنَافِقِينَ فِي الدَّرَكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ وَلَنْ تَجِدَهُمْ - نَصِيرًا ﴿١٣٥﴾ (النساء: ۱۳۵)

کچھ شک نہیں کہ منافق لوگ دوزخ کے سب سے نچلے درجے میں ہوں گے اور تم کسی کو ان کا مددگار نہ پاؤ گے۔

فرمان نبوی

— ”آية المنافق ثلاث: اذا حدث كذب، اذا اؤتمن خان و اذا وعد اخلف“ (۱)۔

منافق کی تین نشانیاں ہیں، جب بات کرے تو جھوٹ بولے، وعدہ کرے تو اسے پورا نہ کرے اور امانت میں خیانت کرے۔

— ”قال رجل لحذيفة: يا ابا عبد الله! ما النفاق؟ فقال: ان تتكلم بالاسلام ولا تعمل به“ (۲)

ایک آدمی نے حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا کہ نفاق کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا: یہ کہ تم زبان سے تو اسلامی تعلیمات کا اقرار کرو لیکن ان کے مطابق عمل نہ کرو۔

ایضاً: بخاری، کتاب الایمان، باب علامات المنافق

۲۔ مسند الامام اربع

س: نفاق کسے کہتے ہیں؟

ج: نفاق کی اصولی تعریف یہ ہے کہ دل اور زبان متفق نہ ہوں۔ اس کی دو بڑی قسمیں ہیں اعتقادی اور عملی۔ اعتقادی نفاق ایک قسم کا کفر ہے اور عملی نفاق، فسق۔ اعتقادی نفاق کی تعریف یہ ہے کہ آدمی ایمان کا اظہار تو کرے مگر دل میں ایسا انکار رکھے جو ارادتا ہو، یا دوسرے لفظوں میں اقرار ظاہر کرنا اور انکار چھپانا۔ جیسا کہ قرآن حکیم میں ہے:

﴿إِذَا جَاءَكَ الْمُنَافِقُونَ قَالُوا نَشْهَدُ إِنَّكَ لَرَسُولُ اللَّهِ وَاللَّهُ يَعْلَمُ إِنَّكَ لَرَسُولُهُ، وَاللَّهُ يَشْهَدُ أَنَّ الْمُنَافِقِينَ لَكَاذِبُونَ ۝ اتَّخَذُوا أَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ، إِنَّهُمْ سَاءَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾

(المنافقون ۶۳: ۲۱)

”اے محمد! جب منافق لوگ تمہارے پاس آتے ہیں تو (ازراہ نفاق) کہتے ہیں کہ ہم اقرار کرتے ہیں کہ آپ بے شک خدا کے پیغمبر ہیں اور خدا جانتا ہے کہ درحقیقت تم اس کے پیغمبر ہو لیکن خدا ظاہر کیے دیتا ہے کہ منافق (دل سے اعتقاد نہ رکھنے کے لحاظ سے) جھوٹے ہیں۔ انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے اور ان کے ذریعے سے (لوگوں کو) راہِ خدا سے روک رہے ہیں۔ کچھ شک نہیں کہ جو کام یہ کرتے ہیں برے ہیں۔“

نفاق عملی یہ ہے کہ دین کے احکام کو ماننے کے باوجود ان پر دانستہ اور اختیاراً عمل نہ کیا جائے جیسا کہ قرآن حکیم نے سورہ الصف میں ان لوگوں کی نکیر کی ہے جن کے قول و فعل میں تضاد ہو۔

واضح رہے کہ اعتقادی نفاق کفر کی بدترین قسم ہے اور عملی نفاق فسق کی جیسا کہ

نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ منافق کی نشانی یہ ہے کہ وہ جھوٹ بولتا ہے، امانت میں خیانت کرتا اور وعدے کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ نیز فرمایا:

”لا اله الا الله كلمة الف الله بها قلوب المسلمين۔ فمن قال
واتبعها بالعمل الصالح فهو مومن ومن قالها واتبعها بالفجور فهو
منافق“ (۱)۔

یعنی لا الہ الا اللہ وہ کلمہ ہے جس سے اللہ نے مسلمانوں کے دلوں کو باندھ رکھا ہے
پس جس نے یہ کلمہ پڑھا اور اس کے مطابق صالح اعمال کیے وہ مومن ہے اور جس نے یہ کلمہ
پڑھا اور برے اعمال کیے وہ منافق ہے۔

س: نفاق کا ضرر کیا ہے؟

ج: نفاق کا سب سے بڑا ضرر تو اللہ تعالیٰ کی ناراضی اور اس کے نتیجے میں جہنم کی آگ کا
عذاب ہے جیسا کہ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ منافقین جہنم کے سب
سے نچلے لڑھے میں ہوں گے۔

س: اعتقادی نفاق کا علاج کیا ہے؟

ج: اعتقادی نفاق کا علاج ہمیں درکار نہیں ہے کیونکہ ایک مسلمان کو مسلمان رہتے
ہوئے یہ مرض لاحق نہیں ہوتا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اعتقادی نفاق کا حامل خود کو
مریض نہیں سمجھتا اس لیے اس کو کوئی علاج بتانا بے سود اور بے معنی ہے۔ البتہ اس
نفاق میں مبتلا کسی شخص کو خیر خواہی اور تبلیغ کی نیت سے بعض طریقوں سے سمجھانے
اور حق کی طرف مائل کرنے کی کوشش ضرور کی جاسکتی ہے۔ اس کا بیان ان شاء اللہ
تعالیٰ ’آداب تبلیغ‘ میں ہوگا۔

س: عملی نفاق کا علاج کیا ہے؟

ج: عملی نفاق کی دو حالتیں ہیں۔ پہلی حالت تو یہ ہے کہ آدمی اس نفاق میں مبتلا ہو کر جس وجہ سے اس کے ضرر کو محسوس نہ کرتا ہو۔ دوسری حالت یہ ہے کہ اس کا شکار تو ہو لیکن اس سے رہائی پانے کی خواہش بھی رکھتا ہو۔

پہلی حالت عموماً دو وجوہ سے پیش آتی ہے۔ ایک غلط عقائد اور دوسرے حب دنیا، اس کا علاج اصولاً تصحیح عقائد سے شروع ہوگا۔ ایسے شخص کی وہ غلطی دریافت کرنی چاہیے جس کی وجہ سے وہ اپنے نفاق کے نقصانات کی طرف پوری طرح متوجہ نہیں ہو پا رہا۔ عام طور پر اس غلطی کے دو سبب ہوتے ہیں: ① اللہ کی رحمت کا غلط تصور اور ② رسول اللہ ﷺ کی شفاعت کا غلط تصور۔ سب سے پہلے یہ باور کرنا اور کرانا چاہیے کہ اللہ کی رحمت اگر آخرت میں بھی نافرمانوں پر ایسی عام ہو کہ بڑے سے بڑا نافرمان بھی بخشا جائے تو اس کا سیدھا سادا مطلب تو یہ ہوا کہ، نعوذ باللہ، اللہ کے احکام محض مذاق تھے اور ظاہر ہے کہ یہ بات اللہ تبارک و تعالیٰ کی شان کے اس قدر خلاف ہے کہ خود یہ شخص بھی جو رحمت کا خود ساختہ تصور رکھتا ہے، اسے قبول نہیں کر سکتا۔ دوسرے سبب کا ازالہ بھی اسی نہج پر ہوگا کہ بلا قید اور عام شفاعت رسول کریم ﷺ کی عبدیت ہی نہیں بلکہ رسالت کے بھی منافی ہے کیونکہ اگر اس طرح کی شفاعت آپ ﷺ کو فرمانا تھی تو آپ ﷺ کا اپنی بندگی پر اصرار کوئی معنی نہیں رکھتا اور وہ پیغام بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتا جو آپ ﷺ انسانوں کی اخروی نجات کے واحد ذریعے کے طور پر لے کر آئے۔ باقی رہی حب دنیا تو اس کی تعریف اور علاج نفاق کے بعد زیر بحث آئے گا۔

س: اس شخص کے لیے کیا علاج تجویز کیا جائے گا جو عملی نفاق میں مبتلا ہو، اس کے ضرر کو محسوس بھی کرتا ہو اور اس سے بچنا بھی چاہتا ہو؟

ج: اس معاملے میں علاج دراصل دو چیزوں کا ہوگا: ایک کسل اور دوسرے آخرت پر مطلوبہ یقین نہ ہونا۔ کسل کے علاج کا آغاز نماز باجماعت کی پابندی سے ہوگا اور رفتہ رفتہ دوسرے معاملات کا بھی احاطہ کرے گا۔ جماعت کی پابندی کسل کی دونوں قسموں یعنی ذہنی اور جسمانی کا علاج ہے۔

آخرت پر مطلوبہ یقین پیدا کرنے کی بہترین تدبیر تو یہ ہے کہ ایسے لوگوں کی صحبت اختیار کی جائے جن کے قول و فعل سے اللہ کا خوف جھلکتا ہو، تاہم اگر اس طرح کی صحبت میسر نہ ہو تو آخرت سے متعلق آیات قرآنیہ، احادیث نبویہ یا کوئی مستند بیان بار بار پڑھنے کی عادت ڈالی جائے۔ شروع میں اگر دل نہ لگے تو بھی یہ مطالعہ جاری رکھنا چاہیے۔ اس میں کچھ رسوخ پیدا ہو جائے تو پھر موت کو یاد رکھنے کی مشق کرنی چاہیے، یہ آخرت کے یقین کو بھی کامل کرتی ہے اور عمل کے محرکات کو بھی تقویت پہنچاتی ہے۔



حُب دُنیا

حکم ربّانی

— ﴿وَمَا هَذِهِ الْحَيَوةُ الدُّنْيَا إِلَّا لَهْوٌ وَلَعِبٌ وَإِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ لَهِيَ
الْحَيَوةُ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ﴾ (العنكبوت: ۶۳-۶۴)
اور یہ دنیا کی زندگی تو کھیل تماشا ہے۔ آخرت کی زندگی ہی اصل زندگی
ہے۔ کاش وہ اس حقیقت کو جانتے!

— ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيَوةُ الدُّنْيَا وَلَا
يَغُرَّنَّكُم بِاللَّهِ الْغُرُورُ﴾ (فاطر: ۵۳-۵۴)
اے لوگو! بے شک اللہ کا وعدہ قیامت برحق ہے، لہذا دنیا کی زندگی تمہیں
دھوکے میں نہ ڈالے اور نہ وہ بڑا دھوکے باز تمہیں اللہ کے بارے
میں دھوکا دینے پائے۔

فرمان نبوی

— ”مَا الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا مَثَلٌ مَا يَجْعَلُ أَحَدُكُمْ أَصْبَعَهُ فِي الْيَمِّ، فَلْيَنْظُرْ بَسًا
يَرْجِعُ؟“ (۱)

آخرت کے مقابلے میں دنیا کی مثال ایسے ہے جیسے تم میں سے کوئی شخص اپنی
انگلی سمندر میں ڈبوئے تو پھر دیکھو کہ وہ کتنا پانی اپنے ساتھ لاتی ہے؟“

— ”عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: رَأَيْتُ سَبْعِينَ مِنْ أَهْلِ الصِّفَةِ مِنْهُمْ
رَجُلٌ عَلَيْهِ رِدَاءٌ، أَمَّا زَارٌ وَأَمَّا كَسَاءٌ“ قَدَرِ بَطَوَافِي أَعْنَاقِهِمْ
فَمِنْهُمْ مَا يَبْلُغُ نِصْفَ السَّاقَيْنِ وَمِنْهَا مَا يَبْلُغُ الْكَعْبَيْنِ، فَيَجْمَعُهُ
بِيَدِهِ كَرَاهِيَهُ أَنْ تَرَى عَوْرَتَهُ“ (۲)

۱۔ صحیح مسلم، کتاب الحجۃ وصفۃ نعیما، باب فناء الدنیا

۲۔ صحیح بخاری، کتاب المساجد، باب نوم الرجال فی المسجد

حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا کہ میں نے ستر اہل صفہ کو دیکھا ان میں کسی کے پاس جسم کے اوپر کا حصہ چھپانے کے لیے چادر نہیں تھی، کسی کے پاس نچلا دھڑا ہانکنے کے لیے ازار (تہ بند، دھوتی یا جامہ وغیرہ) ہوتی یا چادر جسے وہ اپنی گردنوں میں باندھ لیتے وہ کپڑا کسی کی نصف پنڈلی تک پہنچتا اور کسی کے ٹخنوں تک، پس وہ اسے اپنے ہاتھ سے اکٹھا کر رکھتے کہ کہیں ان کا قابل ستر حصہ عریاں نہ ہو جائے۔

س: حب دنیا کیا ہے؟

ج: حب دنیا یہ ہے کہ دنیا اس قدر مطلوب ہو جائے کہ آدمی اس کے حصول کا ہر ذریعہ، خواہ صحیح ہو یا غلط، اختیار کر لے اور اس بارے میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی واضح ناراضی اور غضب کو بھی خاطر میں نہ لائے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ دنیا کی طلب اور محبت کا اللہ کی طلب اور محبت پر بدلہ غالب آ جانا حب دنیا ہے۔

س: حب دنیا کا ضرر کیا ہے؟

ج: حب دنیا نہ صرف یہ کہ تمام گناہوں کی جڑ ہے بلکہ اپنے شکار کو کفر، شرک اور جہنم تک پہنچا سکتی ہے جیسا کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے متعدد ارشادات سے ثابت ہوتا ہے:

— ﴿اعْلَمُوا أَنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ لَّهُمْ وَزِينَةٌ وَتَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ كَمَثَلِ غَيْثٍ أَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهُ ثُمَّ يَهْبِجُ فَتَرَاهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُونُ حُطَامًا وَفِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيدٌ وَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانٌ، وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا لَمَتَاعٌ الْغُرُورِ۔﴾ (الحديد: ۲۰)

”جان رکھو کہ دنیا کی زندگی محض کھیل اور تماشا اور زینت (و آرائش) اور تمہارے آپس

میں فخر (وستائش) اور مال و اولاد کی ایک دوسرے سے زیادہ طلب (وخواہش) ہے۔ (اس کی مثال ایسی ہے) جیسے بارش کہ (اس سے کھیتی اگتی اور) کسانوں کو کھیتی بھلی لگتی ہے۔ پھر وہ خوب زور پر آتی ہے۔ پھر (اے دیکھنے والے) تو اس کو دیکھتا ہے کہ یہ (پک کر) زرد پڑ جاتی ہے پھر چوراچورا ہوتی ہے۔ اور آخرت میں کافروں کے لیے عذاب شدید اور (مومنوں کے لیے) خدا کی طرف سے بخشش اور خوشنودی ہے اور دنیا کی زندگی تو متاع فریب ہے۔

— ﴿ان الذين لا يرجون لقاءنا ورضوا بالحياة الدنيا واطمأنوا بها والذين هم عن آياتنا غافلون﴾ اولئك ما واهم النار بما كانوا يكسبون۔ ﴿(یونس: ۱۰، ۸)

”جن لوگوں کو ہم سے ملنے کی توقع نہیں اور دنیا کی زندگی سے خوش اور اس پر مطمئن ہو بیٹھے اور ہماری نشانیوں سے غافل ہو رہے ہیں“ ان کا ٹھکانا ان (اعمال) کے سبب جو وہ کرتے ہیں دوزخ ہے۔“

— ”مر رسول الله ﷺ بشاة ميتة قد القاها اهلها فقال والذي نفسى بيده للدينا اهن على الله من هذه على اهلها۔“ (۱)

”نبی کریم ﷺ ایک مری ہوئی بکری کے پاس سے گزرے جسے کوئی باہر پھینک گیا تھا اور اسے دیکھ کر آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کی قسم! اللہ کے نزدیک دنیا کی اتنی بھی اہمیت نہیں جتنی اس مری ہوئی بکری کی اس کے مالک کے نزدیک۔“

— ”الدنيا سجن المؤمن وجنة الكافر“ (۲)

۱۔ جامع الترمذی، ابواب الزهد، باب ماجاء فی هوان الدنيا علی الله عز وجل

۲۔ صحیح مسلم، کتاب الزہد، باب الدنيا سجن المؤمن

”دنیا مومن کے لیے قید خانہ ہے اور کافر کے لیے جنت۔“

س: حب دنیا کا علاج کیا ہے؟

ج: نفس انسانی کی خاصیت یہ ہے کہ وہ اپنے مطلوب کو باقی دیکھنا چاہتا ہے یعنی نفس کی طلب اور رغبت کا اصول یہ ہے کہ وہ اپنے مطلوب اور مرغوب سے علی الدوام واصل رہنا چاہتا ہے۔ اگر اس پر یہ بات عقلاً ہی نہیں تجربے اور مشاہدے سے بھی ثابت ہو جائے کہ یہ جس کی طلب میں سرگرداں ہے وہ خود بھی فانی ہے اور اس کو بھی فنا سے نہیں بچا سکتا تو اس صورت میں اس کی طلب و رغبت کا رخ بدل سکتا ہے۔ اور یہ اصول کہ نفس کا سب سے بڑا مطلوب بقا اور دوام راحت ہے، ایسا بدیہی امر ہے کہ کوئی شخص اس کی دلیل طلب کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ دوسری طرف یہ بھی اتنی ہی حتمی اور یقینی بات ہے کہ دنیا اور دنیا کی راحتیں خود اس کے طالب کے ساتھ فنا ہو جانے والی ہیں۔ اس تجربی صداقت کا استحضار اور اس ایمانی حقیقت کی یاد دہانی کہ آخرت اور اس کی راحتیں نہ صرف یہ کہ خود باقی رہنے والی ہیں بلکہ اپنے طالب کی مطلوبہ بقا کا بھی سامان رکھتی ہیں، حب دنیا کی گرفت کمزور کرنے کی واحد اصولی تدبیر ہے۔ تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ مرض اتنا گہرا اور پیچیدہ ہے کہ جب تک مریض خود اس سے نکلنے کی جان توڑ کوشش، جسے اصطلاح میں مجاہدہ کہتے ہیں، نہیں کرے گا، پورا افاقہ نہیں ہو سکتا۔ اس مجاہدے کے اجزاء یہ ہیں:

① انفاق: جس کی شرعی تعریف یہ ہے کہ اپنی ضرورت سے زائد اللہ کی راہ میں خرچ کرو (البقرہ ۲: ۲۱۹)۔ شریعت نے ”ضرورت“ کے بے لچک حدود مقرر نہیں فرمائے ہیں۔ ہم معاملے کی مصلحت سے یہ تجویز کریں گے کہ بہت بنیادی ضروریات سے زیادہ مال و اسباب کو اللہ کی راہ میں خرچ کر دینا انفاق کا وہ درجہ ہے جس کا پسندیدہ ہونا تو شرعاً بھی ثابت ہے، تاہم حب دنیا کے علاج کے لیے

اسے لازم سمجھنا چاہیے۔ اتفاق کے اس درجے پر ایک ضابطہ اور بھی ملحوظ رکھنا چاہیے اور وہ یہ کہ ہر وہ زائد از ضرورت چیز فوری طور پر کسی مستحق کو دے دی جائے جس کی طرف نفس میں رغبت پائی جاتی ہو۔

② گھر میں دنیا کی باتیں نہ کرنا مثلاً اولاد سے اس طرح گفتگو کہ تمہیں ڈاکٹر بننا ہے یا انجینئر، مضر ہے بلکہ ان کے مستقبل پر اس طرح بات کرنی چاہیے کہ تمہیں ہر حال میں مسنون زندگی گزارنی ہے خواہ اس کا نتیجہ دنیاوی تنگی ہی کیوں نہ ہو۔ اس طرح آدمی کا فوری ماحول کم از کم اتنا بہتر ضرور ہو جاتا ہے کہ وہ اس کے لیے دنیا کی محبت کا محرک نہ بنے۔ یہ ضابطہ رفتہ رفتہ دیگر تعلقات پر بھی عائد کرنا چاہیے۔

③ موت کی یاد، قبر کا دھیان اور قبرستان میں عبرت کے حصول کے لیے آمد و رفت۔

④ دوستوں کی خبر گیری اور ان کی محبت بڑھانے کی تدابیر سوچنا۔ اس سے دو چیزیں میسر آئیں گی جو حب دنیا کے علاج میں نہایت مفید ہیں۔ ایک ایثار اور دوسرے انکسار۔ رفتہ رفتہ خبر گیری کے اس دائرے کو وسعت دے کر عام مسلمانوں تک پہنچا دینا چاہیے۔



تکبر

حکم ربانی

— ﴿وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا﴾ (الاسراء: ۱۷: ۳۷)

اور زمین پر اکڑ کر نہ چلو۔

— ﴿تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ غُلُوفَ الْأَرْضِ

وَلَا فَسَادَ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ﴾ (القصص: ۲۸: ۸۳)

یہ آخرت کا گھر ہم انہی لوگوں کے لئے خاص کرتے ہیں جو دنیا میں بڑائی چاہتے ہیں اور نہ فساد اور اچھا انجام پر ہیزگاروں کے لئے ہے۔

فرمان نبوی

”الاخبر کم باهل النار؟ کل عتل جواظ مُستکبر“ (۱)

کیا میں تمہیں جہنمیوں کی خبر نہ دوں؟ ہر سرکش، بخیل اور متکبر جہنمی ہے۔

— ”قَالَ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ: الْعِزُّ إِزَارِي، وَالْكِبْرِيَاءُ رِدَائِي، فَمَنْ يَنَازِعْنِي

عَذَّبْتُهُ“ (۲)

اللہ عزوجل فرماتا ہے کہ عزت میرا پہناوا ہے اور بڑائی میری چادر ہے پس

جو بھی ان میں سے کوئی ایک چیز بھی مجھ سے کھینچے گا میں اسے عذاب

دوں گا۔

۱۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر صحیح مسلم، کتاب الجہنم، باب النار یہ ظہا الجبارون

۲۔ صحیح مسلم، کتاب السر، باب تحریم الکبر

س: تکبر کیا ہے؟

ج: دوسروں کی تحقیر کرتے ہوئے اپنے آپ کو بڑا سمجھنا تکبر ہے۔ کسی واقعی خوبی اور فضیلت کی بنیاد پر اپنے کو بعض ایسے لوگوں سے بہتر سمجھنا جو وہی خوبی یا فضیلت یا تو سرے سے نہیں رکھتے یا مقابلتاً کم رکھتے ہیں، ممکن ہے کہ نامناسب تو ہو مگر تکبر نہیں ہے۔ تکبر کا ایک لازمی جزو دوسروں کو حقارت سے دیکھنا ہے جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے: ”الکبر بטר الحق و غمط الناس“ (۱) یعنی تکبر یہ ہے کہ آدمی جانتے بوجھتے حق بات کو رد کرے اور لوگوں کی تحقیر کرے۔

تکبر کی دو قسمیں ہیں: ایک مطلق اور دوسرے جزوی۔ مطلق تکبر یہ ہے کہ آدمی اپنی واقعی یا فرضی خوبی کی نسبت اللہ کی طرف کیے بغیر دوسروں کو تحقیر کی نظر سے دیکھے۔ یہ تکبر شرک اور کفر تک پہنچا دیتا ہے۔ جزوی تکبر میں آدمی اس خوبی کو اللہ کی دین سمجھتا ہے مگر اس کی روح سے بیگانہ ہو کر اسے دوسروں کی توہین و تحقیر کا ذریعہ بنا لیتا ہے۔ گویا تکبر کی ہر قسم میں دو چیزیں مشترک ہیں: خود کو بڑا جاننا اور دوسروں کی تحقیر، خواہ احساس میں ہو یا عمل میں۔

س: تکبر کے نقصانات کیا ہیں؟

www.KitaboSunnat.com

ج: ① اللہ کی رضا سے محرومی۔

﴿إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُتَكَبِّرِينَ﴾ (النحل ۱۶: ۲۳)

بے شک وہ (یعنی اللہ) تکبر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

② جہنم میں ہمیشگی کا عذاب

﴿قِيلَ ادْخُلُوا أَبْوَابَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا فَبِئْسَ مَثْوًى الْمُتَكَبِّرِينَ﴾

(الزمر ۳۹: ۷۲)

۱۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب تحریم الکبر و بیانہ

”(اللہ کا) حکم ہوگا کہ جہنم کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ اس میں ہمیشہ رہنے کے لیے۔
وہ کیا برا ٹھکانا ہے متکبر لوگوں کا۔“

نبی کریم ﷺ نے بھی فرمایا ہے کہ متکبر جہنم کا ایندھن بنیں گے اور یہ کہ جس کے دل میں رائی کے برابر بھی تکبر ہوگا وہ جنت سے محروم رہے گا۔ (۱)
③ لوگوں کی نفرت کا نشانہ بننا کیونکہ متکبر کو کوئی بھی پسند نہیں کرتا۔

س: مطلق تکبر کا علاج کیا ہے؟

ج: آدمی کو مسلمان ہوتے ہوئے بھی تکبر کی یہ بدترین قسم پیش آ سکتی ہے۔ ایک مسلمان اس تکبر میں اس طرح مبتلا ہوتا ہے کہ اس کے اندر یہ احساس تقریباً غائب ہو جاتا ہے کہ اس کی حقیقی یا مزعومہ خوبیاں اللہ کی دین ہیں، تاہم عقلی طور پر وہ اس کا انکار نہیں کرتا۔ مرض کی اس صورت میں مریض کو ایسے ماحول یا ایسے آدمیوں کی تفصیلی صحبت اختیار کرنے کا مشورہ دیا جائے گا جو ان امور میں، جن کی بنیاد پر تکبر پیدا ہوا ہے، اس سے بڑھے ہوئے ہوں، مثلاً ایک شخص اس بات پر تکبر میں مبتلا ہو کہ وہ بہت ذہین یا طاقتور ہے تو اسے ایسے اشخاص کے پاس بھیجا جائے گا جو اس سے کہیں زیادہ ذہین یا طاقتور ہوں۔ اس طرح اس کا اپنے بارے میں یقین جو دعویٰ بن گیا ہے، متزلزل ہو جائے گا۔ پہلے قدم پر یہی تزلزل درکار ہے۔ اسی سے فائدہ اٹھا کر اسے یہ باور کرایا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایسا کوئی ذریعہ عطا نہیں فرمایا جس کی بنیاد پر ہم اپنی کامل فضیلت کا کوئی حتمی فیصلہ کر سکیں۔ آگے کا معالجہ ان شاء اللہ تعالیٰ ان دو اقدام کے بعد خود بخود ہوتا جائے گا۔

ایک بات ملحوظ رہے کہ بعض لوگوں میں جو یہ مشہور ہے کہ متکبر کا علاج یہ ہے کہ

اس کی تحقیر کی جائے تو یہ ہر صورت حال میں کارگر نہیں ہوتا۔ اکثر اوقات تحقیر سے تکبر بڑھتا ہے، کم نہیں ہوتا۔ ہاں! اس طرح کا علاج اس تکبر میں موثر ہے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے انکار تک جا پہنچا ہو۔ اس میں تحقیر ہی واحد راستہ ہے۔

س: گویا تکبر کے اکثر مظاہر سمجھانے بجھانے سے ٹھیک ہو جاتے ہیں؟

ج: دنیا میں ہر برائی سمجھانے سے ٹھیک ہو جاتی ہے لیکن سمجھانے کے بھی کئی مدارج ہوتے ہیں۔ تکبر میں جس طرح کا سمجھانا درکار ہے وہ یہ ہے کہ اونٹ کو پہاڑ تلے لے آیا جائے یعنی اسے ایک ٹھوس تقابل میں ڈال دیا جائے جس کے نتیجے میں اس کے پاس سوائے اعتراف کمتری کے کوئی اور راستہ نہ رہے۔ یہی تکبر کے تمام معالجوں کی بنیاد ہے۔

س: چونکہ تکبر ایک نہایت پیچیدہ مرض ہے اور اس کے عود کر آنے کے بھی امکانات رہتے ہیں۔ اس لیے کیا یہ ضروری نہیں کہ اس کے معالجے سے پیدا ہوانے والی بہتری کو برقرار رکھنے کے لیے بھی کچھ تدابیر اختیار کی جائیں؟

ج: یقیناً کسی بھی معالجے کی کامیابی کی سطح برقرار رکھنا نہایت ضروری ہے اور یہ مختلف تدابیر کا تقاضا کرتا ہے۔ تکبر کے علاج کی تاثیر کو برقرار رکھنے اور ترقی دینے کے لیے چار طرح کے اعمال کی پابندی مفید اور موثر ہے:

① جماعت کی اس طرح پابندی کہ صف میں اپنے قریب والے نمازی سے بالکل جڑ کر کھڑے ہونے کی عادت ڈالی جائے۔

② وہ قرآنی آیات جو اللہ تعالیٰ کے جلال و کبریائی کا اظہار کرتی ہیں انہیں تفصیل سے سمجھنے کی کوشش کی جائے اور ان میں سے بعض کو اپنا ورد بنایا جائے۔

③ کثرت تسبیح و تحمید تاکہ علاج میں ایسا مبالغہ بھی نہ ہو جائے کہ آدمی اپنی واقعی خوبیوں

کا بھی منکر ہو جائے۔

4 کثرت استغفار۔

س: محسوس ہوتا ہے کہ مطلق تکبر کے مذکورہ بالا علاج میں جزوی تکبر کا علاج بھی آگیا ہے؟

ج: جی ہاں! جزوی تکبر کے ازالے کے لیے بھی وہی سب کچھ کرنا ہوگا جو اوپر بیان ہوا۔

س: کیا دوسروں کے مقابلے میں آگے بڑھنے کی خواہش و کوشش بھی تکبر میں داخل ہے؟

ج: جی نہیں! یہ تکبر نہیں ہے کیونکہ متکبر آدمی کسی چیز کی کوشش یا خواہش نہیں کرتا، اسے تو

اپنے زعم میں ہر چیز حاصل ہوتی ہے۔ سوال میں بیان کردہ صورت اگر اعتدال کے

ساتھ ہو تو فطری ہے لیکن اگر اعتدال کے ساتھ نہ ہو تو حب جاہ کا پیش خیمہ ہے۔

س: اس کا مطلب یہ ہوا کہ حب جاہ تکبر سے الگ ایک مرض ہے؟

ج: اصولاً تکبر اور حب جاہ میں فرق ہے تاہم حب جاہ اپنی انتہا کو پہنچ کر تکبر میں ڈھل

جاتی ہے۔



حُبّ جاہ

حکم ربّانی

— ﴿اعْلَمُوا أَنَّهَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَلَهُوَ وَزِينَةٌ وَتَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ كَمَثَلِ غَيْثٍ أَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهُ ثُمَّ يَهِيجُ فَتَرَاهُ مَصْفُورًا ثُمَّ يَكُونُ حُطَامًا وَفِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيدٌ وَمَغْفِرَةٌ مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانٌ وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا فِي سَعِ الْغُرُورِ﴾

(الحمدید: ۵۷: ۲۰)

جان رکھو کہ دنیا کی زندگی محض کھیل تماشا اور زینت (و آرائش) اور تمہارے آپس میں فخر (وستائش) اور مال و اولاد کی ایک دوسرے سے زیادہ طلب (و خواہش) ہے۔ (اس کی مثال ایسی ہے) جیسے بارش کی (اس سے بھیگی اُتی اور) کسانوں کو بھیجتی بھلی لگتی ہے، پھر وہ خوب زور پر آتی ہے پھر (اے دیکھنے والے!) تو اس کو دیکھتا ہے کہ پک کر زرد پڑ جاتی ہے پھر چورا چورا ہو جاتی ہے اور آخرت میں (کافروں کے لئے) عذاب شدید اور (مومنوں کے لئے) اللہ کی طرف سے بخشش اور خوشنودی ہے اور دنیا کی زندگی تو متاع فریب ہے۔

— ﴿الْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ۚ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۚ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝ كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ۝.....﴾

تم کو کثرت (مال و جاہ) کی طلب نے غافل کر دیا یہاں تک کہ تم نے قبریں جا کر دیکھیں، دیکھو تمہیں عنقریب معلوم ہو جائے گا، پھر دیکھو تمہیں عنقریب معلوم ہو جائے گا، دیکھو اگر تم جانتے (یعنی) علم الیقین (رکتے تو

(التکاثر: ۱۰۲: ۵-۱)

غفلت نہ کرتے)

فرمان نبوی

— ”ماذنباں جانعان ارسلا فی غنم بافسدلهامن حرص المرء علی المال والشرف لدینه“ (۱)

دوبھو کے بھیڑیے جو بکریوں کے ریوڑ میں گھس جائیں اس کا اتنا نقصان نہیں کرتے جتنا حب مال و جاہ انسان کے دین کا کرتے ہیں۔

— ”عن ابی موسیٰؓ قال: دخلت علی النبی ﷺ انا ورجلان من بنی عمی: فقال احدا الرجلین، یا رسول اللہ! امرنا علی بعض ما ولاک اللہ عزوجل؟ وقال الآخر مثل ذلک، فقال: انا، واللہ لانولی علی هذا العمل احداً سألہ، ولا احداً حرص علیہ“ (۲)۔

حضرت ابو موسیٰؓ فرماتے ہیں کہ میں نبی کریم ﷺ سے ملنے گیا جب کہ میرے ساتھ میرے دورشتہ دار بھی تھے۔ ان دونوں نے نبی اکرم سے درخواست کی کہ انہیں مناصب دیے جائیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو مناصب کی حرص کرے اور ان کا مطالبہ کرے، ہم اسے یہ نہیں دیتے۔

س: حب جاہ اگر تکبر سے الگ ایک جدا گانہ مرض ہے تو اس کی تعریف اور علاج کیا ہے؟
ج: حب جاہ کی پوری تعریف یہ ہے: بڑا بننے کی ایسی خواہش جو بندگی کی روح کے خلاف ہو اور جائز و ناجائز کی تفریق مٹا دے۔

حب جاہ کے علاج میں بڑی مدد ان امور سے بھی مل سکتی ہے جو تکبر اور حب جاہ کے لیے بتائے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ اس کے علاج میں دو اصول مستقلاً ملحوظ رکھنے

۱۔ جامع الترمذی، ابواب الزہد، باب ماذنباں جانعان ارسلا فی غنم.....

۲۔ صحیح مسلم، کتاب الامارہ، باب النهی عن طلب الامارۃ والحرص علیہا

چاہئیں: ایک ایثار اور دوسرے اخفائے صلاحیت۔ یہاں ایثار کے معنی یہ ہیں کہ آدمی ایک چیز کا شرعاً اور قانوناً مستحق ہوتے ہوئے بھی اسے کسی دوسرے مستحق کے لیے چھوڑ دے اور اخفاء کا مفہوم یہ ہے کہ آدمی اپنی ان صلاحیتوں کو ایسے مواقع پر ظاہر نہ ہونے دے جہاں ان کے اظہار کے نتیجے میں کوئی مرتبہ و منصب حاصل ہو سکتا ہو۔

س: حبِ جاہ کے بارے میں آپ نے جو کچھ کہا ہے اس میں دو باتیں وضاحت طلب ہیں۔ ایک تو آپ نے کہا ہے کہ دوسروں سے آگے بڑھنے کی خواہش اگر اعتدال کے ساتھ نہ ہو تو یہ حبِ جاہ کا پیش خیمہ ہے۔ یہاں اعتدال سے کیا مراد ہے؟ دوسرے یہ کہ آپ نے حبِ جاہ کی تعریف میں کہا ہے کہ یہ بڑا بننے کی وہ خواہش ہے جو بندگی کی روح کے خلاف ہو۔ ”بندگی کی روح کے خلاف“ ہونے کا کیا مطلب ہے؟

ج: آپ کی پہلی بات کا جواب یہ ہے کہ حصول مقصود کا ذریعہ اور اس کے حصول کا استحقاق اگر شرعی جواز کے ساتھ ثابت ہوں اور ناکامی کی صورت میں بھی کامیاب ہونے والوں سے حسد یا بغض وغیرہ پیدا نہ ہو تو ہم کہیں گے کہ آگے بڑھنے کی خواہش میں اعتدال ملحوظ رہا ہے۔ اس صورت میں آگے بڑھنے کی خواہش فطری ہے اور اس سے کسی نقص و ضرر کا احتمال نہیں ہوتا۔ ان چیزوں کا نہ ہونا البتہ اعتدال کے خلاف ہے اور حبِ جاہ پر دلالت کرتا ہے۔

جہاں تک آپ کے دوسرے سوال کا تعلق ہے کہ حبِ جاہ کی تعریف میں بڑا بننے کی خواہش کے ”خلاف بندگی“ ہونے کا کیا مطلب ہے تو اس کے دو پہلو ہیں: ایک تو یہ کہ طالبِ جاہ اللہ سے ایک مشروط تعلق رکھتا ہے۔ مثلاً اس کی شکرگزاری اس وقت تک ہوتی ہے جب تک تمام معاملات اس کی خواہش کے مطابق چلتے رہیں، جوں ہی کوئی چیز خلاف مرضی ہوئی یہ شخص

شکایت اور شکوے تک پہنچ جاتا ہے یعنی اس کا رویہ تسلیم و رضا کے خلاف ہوتا ہے۔ دوسرا پہلو عملی ہے اور وہ یہ کہ طالب جاہ کی امیدیں اگر پوری نہ ہوں تو اس کی عبادات میں بھی خلل پڑ جاتا ہے۔ یہ حب جاہ کی ایسی یقینی نشانی ہے کہ اسے ایک کلیہ سمجھنا چاہیے۔

خلاصہ یہ کہ بندگی کے دواہم اجزاء ہیں: ایک ہر حال میں راضی برضا رہنا، دینی طور پر بھی اور طبعی طور پر بھی، دوسرے اعمال عبودیت کو ان کے بتائے ہوئے معیار کے ساتھ انجام دینا۔ طلب جاہ اگر پوری نہ ہو تو یہ دونوں چیزیں لازماً متاثر ہوتی ہیں۔ آدمی جانتے بوجھتے اللہ کی رضا سے نامطمئن ہو جاتا ہے اور اپنی امیدیں پوری نہ ہونے کی وجہ سے اس کی عبادت بھی کسی نہ کسی پہلو سے متاثر ہوتی ہے۔

س: ایک آدمی کی امیدیں اگر پوری نہ ہوں اور اس پر بے اطمینانی اور مایوسی حملہ کرے اور اس کی عبادت بھی متاثر ہو لیکن وہ اللہ سے شکوہ کرنے کی بجائے یہ دعا مانگے کہ اے اللہ! مجھے اپنی رضا پر راضی رہنے کی توفیق دے تو کیا یہ بھی حب جاہ کا شاخسانہ ہے؟

ج: یہ قابل اصلاح حالت تو ہے لیکن یہ حب جاہ نہیں ہے کیونکہ حب جاہ کا مریض اپنے عدم تسلیم و رضا کے رد عمل کو ٹھیک سمجھتا ہے جبکہ زیر نظر سوال میں آدمی شکایت یا بے اطمینانی کا احساس رکھنے کے باوجود ایک تو اس کے مقتضاء پر عمل نہیں کرتا اور دوسرے اس کی اصلاح کی خواہش بھی رکھتا ہے۔ لہذا اسے مجموعی طور پر نفس کی کمزوری سے تو تعبیر کیا جائے گا لیکن حب جاہ کا نام نہیں دیا جائے گا۔

س: اس کیفیت کا علاج کیا ہے؟

ج: اس کا علاج یہ ہے کہ لمبی دعا مانگی جائے اور اس دعا کے بیشتر مضامین اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے حصول اور آخرت کی بہتری سے متعلق ہوں۔ ان شاء اللہ اس پر مداومت سے اس کیفیت میں نمایاں بہتری کے آثار پیدا ہوں گے۔ اس کا تفصیلی

بیان اس جگہ آئے گا جہاں ہم تعلق باللہ کی مضبوطی کے ذرائع پر گفتگو کریں گے۔

س: حب جاہ کے نقصانات کیا ہیں؟

ج: فساد دین بلکہ دین کا خاتمہ جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ دو بھوکے بھیڑیے ریوڑ کو اتنا نقصان نہیں پہنچاتے جتنا حب جاہ اور حب مال انسان کے دین کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ (۱)

حب جاہ کے نقصانات اور علاج کا تفصیلی بیان اس جگہ آئے گا جہاں ہم تعلق باللہ کی مضبوطی کے ذرائع پر گفتگو کریں گے۔

ریا

حکم ربانی

﴿لَا تَبْتَغُوا أَصْدَاقَكُمْ بِالْمَنِّ وَالْأَذَى كَالَّذِي يُنْفِقُ مَالَهُ رِئَاءَ النَّاسِ﴾

(البقرہ ۲: ۲۶۴)

اپنے صدقے احسان جتلا کر اور تکلیف پہنچا کر ضائع مت کرو، اس شخص کی طرح جو اپنا مال لوگوں کے دکھلاوے کے لئے خرچ کرتا ہے۔

﴿يُرَآؤْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُونَ اللَّهَ إِلَّا قَلِيلًا﴾ (النساء ۴: ۱۳۲)

وہ لوگوں کے سامنے دکھلاوا کرتے ہیں اور اللہ کا ذکر بہت کم کرتے ہیں۔

فرمان نبوی

— ”مَنْ سَمِعَ سَمِعَ اللَّهُ بِهِ وَمَنْ رَأَى رَأَى اللَّهُ بِهِ“ (۱)

جو شخص دکھلاوے کے لیے کوئی عمل کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اسے قیامت والے دن رسوا کر دے گا اور جو کوئی نیک عمل لوگوں کی نظروں میں بڑا بننے کے لیے کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے چھپے عیبوں کو لوگوں کے سامنے ظاہر کر دے گا۔“

— ”مَنْ تَعَلَّمَ عِلْمًا مِمَّا يَتَغَيُّ بِهِ وَجْهَ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ لَا يَتَعَلَّمُهُ إِلَّا

لِيَصِيبَ بِهِ عَرْضًا مِنَ الدُّنْيَا، لَمْ يَجِدْ عَرَفَ الْجَنَّةَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ“ (۲)

جو شخص اس علم کو، جس کے ذریعے اللہ کی رضامندی حاصل کی جاتی ہے، اس لیے سیکھتا ہے کہ اس سے دنیا کا ساز و سامان حاصل کرے تو وہ قیامت والے دن جنت کی خوشبو بھی نہیں پائے گا۔“

(۱) صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب الریاء والسمعة

(۲) سنن ابی داؤد، کتاب العلم، باب فی طلب العلم لغیر اللہ

س: ریا کیا ہے؟

ج: عبادات میں معبود سے بالکل غافل ہو کر یا عبادات کے حقیقی مقاصد (اخلاص وغیرہ) کو نظر انداز کر کے مخلوق کی نگاہ میں اچھا اور بڑا بننے کی کوشش کرنا ریا کہلاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں عبادت کے دوسرے سرے پر جہاں معبود کو ہونا چاہیے وہاں مخلوق کو برا حجامن کر لینا ریا ہے۔

ریا کو حدیث شریف میں شرک اصغر فرمایا گیا ہے^(۱) اور سنن ابن ماجہ میں ہے ”ان یسیر الریاء شرک“^(۲) یعنی تھوڑا ریا بھی شرک ہے اور اگر غور کریں تو بلاشبہ شرک کے ساتھ جتنی مماثلت ریا اور تکبر کو ہے وہ کسی اور خرابی کو نہیں۔ تکبر میں ایک طرح سے معبود کا انکار پوشیدہ ہوتا ہے جبکہ ریا میں بندگی کا انکار کارفرما ہوتا ہے کیونکہ متکبر آدمی اللہ تعالیٰ کی بڑائی سے بے خبر ہوتا ہے اور ریا کار بندگی کے تقاضے سے۔

س: ریا کی عملی پہچان کیا ہے؟

تمام ریا کاروں میں ایک چیز لازماً مشترک ہوتی ہے اور وہ یہ کہ ان کی تمام عبادات اور اعمال حسنہ ہمیشہ جلوت میں ہوتے ہیں۔ ان کی خلوت یا تو اللہ کی یاد اور نیکی کے منصوبوں سے خالی ہوتی ہے یا پھر ان کی مجلسی زندگی کے مقابلے میں ان کی تنہائی کی عبادات وغیرہ نہایت کم اور غائب دماغی کے ساتھ ہوتی ہیں۔ اس بات میں ہرگز کوئی استثنیٰ نہیں کہ ریا کار کی عبادات کی مقدار اور معیار دونوں اس کی تنہائی میں آکر نہ ہونے کے برابر رہ جاتے ہیں۔ مثلاً دیکھنے والے موجود ہوں تو یہ شخص عبادات واذکار کثرت و سہولت اور ذوق و شوق کے ساتھ کر سکتا ہے لیکن جہاں کوئی دیکھنے والا

(۱) مسند احمد بن حنبل، ج ۵ ص ۳۲۸، ۳۲۹

(۲) سنن ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب من ترجی له السلامة من الفتن

ج: نہ ہو وہاں اس کے لیے دو رکعتیں بھی دو بھر ہو جاتی ہیں اور اللہ کے لیے کئے جانے والے تمام اعمال غفلت اور کسل کا شکار ہو جاتے ہیں۔

تاہم ریا اگر ثابت بھی ہو جائے تو جتنے اعمال لوگوں کے سامنے کرنے کی عادت پڑ چکی ہو اس میں کمی نہیں کرنی چاہیے بلکہ سارا زور خلوت کی بہتری پر دینا چاہیے۔ اس کی تفصیل ان شاء اللہ علاج میں آجائے گی۔

س: بعض لوگ اچھی صحبت میں عبادات وغیرہ میں مستعد ہو جاتے ہیں لیکن تنہائی میں یا اس ماحول سے باہر کسل اور غفلت کا شکار ہو جاتے ہیں کیا یہ ریا ہے؟ اسی طرح دیکھا گیا ہے کہ بعض لوگ جمع میں بیٹھے تسبیح پڑھ کر کرتے رہتے ہیں کیا اسے بھی ریا کہا جائے گا؟

ج: ریا کا جزو لازم دوسروں کی نظر میں اچھا اور بڑا بننا ہے یا یوں کہہ لیں کہ ریا کار کی پوری کوشش یہ ہوتی ہے کہ یا تو لوگ اسے اپنے سے اچھا سمجھیں یا اس کے نقائص کی طرف ان کی نگاہ نہ جانے پائے۔ بعض اوقات ایسا آدمی جو تنہائی میں کسل اور غفلت کا شکار ہوتا ہے لیکن اچھی صحبت میں آنے پر اس کی غفلت اور کسل کم یا ختم ہو جاتی ہے، یہ ریا نہیں ہے۔ یہ صحبت کا اثر ہے یا اس آدمی کے اندر پیدا ہونے والی شرمندگی کا نتیجہ ہے۔ اسی طرح بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ مجلس وغیرہ میں بیٹھے تسبیح پھیرتے رہتے ہیں۔ اگر یہ عمل تنہائی میں بھی برقرار رہتا ہے تو اسے ریا نہیں کہا جائے گا۔ مطلب یہ کہ کسی خاص طرح کی مجلس یا مخصوص آدمی کے سامنے اعمال میں مقدار یا معیار کے لحاظ سے بہتری پیدا ہو جانا فطری ہے۔ ہاں! اگر یہ ہو کہ جو شخص اپنے استاد یا اچھے لوگوں کی صحبت میں عبادات کی طرف خوب راغب اور کار بند رہتا ہے، اگر اس کی یہ رغبت اور مستعدی تمام لوگوں کے سامنے اسی طرح

رہتی ہے مگر تنہائی اس کے برعکس ہوتی ہے تو پھر یہ ریا ہے۔ ریا میں دراصل مجموعی جلوت اور مجموعی خلوت کا تضاد کا رفرما ہوتا ہے۔ یہ تضاد اگر عقیدے میں ہو تو نفاق ہے عمل میں ہو تو ریا ہے لیکن کسی خاص مجلس اور مجموعی تنہائی کا تضاد یا اختلاف ضروری نہیں کہ لازماً ریا ہی ہو مثلاً ایک شخص نیک لوگوں کی معیت میں رہتا ہے تو تہجد گزار بھی ہو جاتا ہے لیکن تنہائی میں اسے جماعت ہی کے لالے پڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ ریا نہیں ہے۔ دوسری طرف ایک اور آدمی ہے جس کی تنہائی کا حال پہلے شخص جیسا ہی ہے لیکن وہ دنیا داروں کے کسی خاص حلقے میں جا کر پرہیزگار بن جاتا ہے تو یہ ریا ہے۔

س: ریا کے نقصانات کیا ہیں؟

ج: ① ریا درحقیقت ایمان کی نفی اور شیطانی حکمہ ہے جیسا کہ قرآن حکیم میں ہے:

﴿وَالَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ رِئَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ
وَمَنْ يُكِنِّ الشَّيْطَانُ لَهُ قَرِينًا فَسَاءَ قَرِينًا﴾ (النساء: ۴: ۳۸)

”یعنی جو لوگوں کو دکھانے کے لیے خرچ کرتے ہیں، وہ نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ

آخرت کے دن پر۔ حقیقت یہ ہے کہ شیطان جس کا ساتھی ہو تو وہ بہت برا ساتھی ہے۔“

② ریا چونکہ ایک طرح کا شرک ہے لہذا جس طرح شرک سے اعمال ضائع ہو جاتے

ہیں (اور ان کا کوئی اجر نہیں ملے گا) اسی طرح ریا سے بھی اعمال ضائع ہو جاتے ہیں

جیسا کہ حدیث شریف میں ہے کہ:

”الرِّيَاءُ يَحْبُطُ الْعَمَلَ كَمَا يَحْبُطُهُ الشَّرْكُ“ (۱)

”یعنی ریا سے اسی طرح اعمال ضائع ہو جاتے ہیں جس طرح شرک سے۔“

③ ریاء کا نتیجہ جہنم ہے جیسا کہ صحیح مسلم کی ایک طویل روایت میں ہے کہ قیامت کے دن ایک مجاہد، ایک عالم دین اور ایک سخی کو اللہ کے دربار میں پیش کیا جائے گا اور جب وہ اللہ کے حضور تسلیم کریں گے کہ ان کے پیش نظر محض اللہ کی خوشنودی نہ تھی بلکہ ریاء اور دنیوی مفاد بھی تھا تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ وہ تو تمہیں دنیا میں مل چکا اور میں ان اعمال کو قبول نہیں کرتا جو خالص میرے لیے نہ ہوں لہذا فرشتوں کو حکم ہوگا کہ انہیں گھسیٹتے ہوئے جہنم میں لے جاؤ۔ (۱)

س: ریاء کا علاج کیا ہے؟

ج: ریاء کا علاج ملامت ہے یعنی اچھا سمجھنے والوں کے سامنے اپنے واقعی نقائص کا شدت کے ساتھ اظہار۔ مثال کے طور پر ایک شخص کو کچھ لوگ بہت اچھا سمجھتے ہوں درآں حالیکہ اس کی اصلیت اس کے برعکس ہو یا کم از کم وہ اتنا اچھا سمجھے جانے کا مستحق نہ ہو تو ایسے آدمی کو چاہیے کہ ان لوگوں کو اس طرح اپنے نقائص کی خبر دے کہ انہیں یہ احساس ہو کہ جیسے یہ آدمی ان سے مشورے اور اصلاح کا طالب ہے۔ یہ وہ حقیقی ملامت ہے جو اکثر اوقات شرعاً بھی واجب ہوتی ہے۔

اس کا دوسرا علاج تنہائی میں لمبی نماز پڑھنا ہے تاہم اس دوران میں جتنے اعمال یہ شخص مجمع میں کرتا ہے اگر وہ عبادات کے زمرے کے ہوں تو اسے چاہیے کہ انہیں نہ چھوڑے۔ یہاں ایک بات سمجھنا ضروری ہے کہ اکثر اوقات ایک مائل بر یا شخص نوافل کو بھی خوب ظاہر کر کے پڑھتا ہے جب کہ یہ بھی سنت سے معلوم ہے کہ نفلی عبادات کی فضیلت تنہائی میں زیادہ ہے جیسا کہ نبی کریم ﷺ کا فرمان مبارک ہے:

(۱) صحیح مسلم، کتاب الامارہ، باب من قاتل للریاء

”صَلُّوا إِلَيْهَا النَّاسُ فِي بَيْتِكُمْ ، فَإِنَّ أَفْضَلَ صَلَاةِ الْمَرْءِ فِي بَيْتِهِ إِلَّا

الْمَكْتُوبَةُ“ (۱)

”یعنی اے لوگو! نماز گھروں میں پڑھا کرو کیونکہ فرض نمازوں کو چھوڑ کر آدمی کی

بہترین نماز وہی ہے جو وہ اپنے گھر میں پڑھے۔“

تاہم اس صورت میں بھی اس شخص کو اولاً یہی کہا جائے گا کہ تم جو نفل لوگوں کے سامنے پڑھتے ہو انہیں ویسے ہی جاری رکھو البتہ کم از کم اتنی ہی عبادت تنہائی میں بھی کرنے کی کوشش کرو۔ جب یہ بات حاصل ہو جائے تب اس سے کہا جائے گا کہ اب ان سنتوں پر عمل کرو جو نفل عبادات کے بارے میں ہیں کیونکہ تزکیے کا اصول یہ ہے کہ فسق کے خاتمے کے لیے فضائل کو سند نہیں بنایا جاتا بلکہ واجبات پر چلا جاتا ہے جب فسق کا ازالہ ہو جائے تب فضائل کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے۔

س: ہمارے معاشرے میں ریا کے عمومی مظاہر کیا ہیں؟

ج: ریا کی دو قسمیں ہیں: دینی معنی میں اچھا کہلانے کی خواہش اور دنیوی معنوں میں اچھا کہلانے کی خواہش۔ عام طور پر دینی حلقے کے لوگ خود کو متقی اور صاحب حال ظاہر کرنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں جبکہ دنیا دار عمومی اخلاقی معیارات پر داد و تحسین کے خواہاں ہوتے ہیں جیسے سخاوت و فیاضی میں۔

س: بعض لوگ اپنی خامیوں کا برملا اقرار کرنا عادت بنا لیتے ہیں کیا یہ چیز بھی ریا سے متعلق ہے؟

ج: جی ہاں! اپنی خامیوں کا ڈھونڈ ور اپنی بنا بھی ریا ہے کیونکہ ہمارے اجتماعی لاشعور میں اپنی خرابیوں کا اظہار کرنے والے کو اچھا سمجھا جاتا ہے۔

(۱) صحیح بخاری، کتاب الاذان، باب صلاة اللیل

س: اختلاف رائے کا کوئی تعلق ریا سے ہے؟

ج: کسی دینی دلیل پر کسی بڑے آدمی سے اختلاف ہو تو اس اختلاف کو محض اس لیے چھپانا کہ میری مقبولیت کم ہو جائے گی یا اپنی مقبولیت بڑھانے کے لیے کسی بڑے آدمی سے ایسا اختلاف کرنا جو شرعاً کوئی خاص اہمیت نہ رکھتا ہو، یہ سب ریا ہی کے مظاہر ہیں۔

س: اگر آدمی کو اپنی خواہش و کوشش کے بغیر لوگوں کو اس کے بعض اعمال حسنه کا پتہ چل جائے اور وہ اس کی تعریف کریں تو کیا اسے بھی ریا میں داخل سمجھا جائے گا؟

ج: نہیں۔ یہ ریا نہیں ہے جیسا کہ حدیث میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا کہ: ”أَرَأَيْتَ الرَّجُلَ يَعْمَلُ الْعَمَلَ مِنَ الْخَيْرِ وَيُحْمَدُهُ النَّاسُ عَلَيْهِ“ ”یعنی اگر کوئی آدمی نیک عمل کرے اور لوگ اس کی تعریف کریں تو اس کا کیا حکم ہے؟“ (یعنی کیا یہ ریا ہے؟) تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”تِلْكَ عَاجِلُ بَشَرِي الْمَوْمِنِ“ (۱) ”نہیں“ یہ تو مومن کے لیے دنیا ہی میں خوشخبری ہے۔

(۱) صحیح مسلم، کتاب البر، باب اذا اثنی علی الصالح

عجب

حکم ربّانی

— ﴿فَلَا تُزَكُّوْا اَنْفُسَكُمْ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ اَتَّقٰی﴾ (النجم: ۵۳: ۳۲)

”اپنے آپ کو نیک نہ ظاہر کرو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کون پرہیزگار ہے۔ (۳۲)

— ﴿وَلَا تَصْعَرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْسُ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا اِنَّ اللّٰهَ

لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ﴾ (لقمان: ۳۱: ۱۸)

اور لوگوں سے بے رخی نہ کر۔ زمین پر اکڑ کر نہ چل۔ بے شک! اللہ کسی اکڑنے

والے اور غرور کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔ (۱۸)

فرمان نبوی

— ”اذا قال الرجل ”هلك الناس فهو اهلكهم“ — قال مالک

ذلک تحزنالما یرى فى الناس فلا یرى به باساً، و اذا قال ذلک عجباً

بنفسه و تصاغر الناس فهو المكروه الذى نهى عنه۔“ (۱)

جب کوئی کہے کہ لوگ ہلاک ہو گئے تو وہ بھی ان کے ساتھ ہلاک ہوگا۔ (امام مالکؒ

فرماتے ہیں کہ اگر کوئی لوگوں میں دینی کمزوریاں دیکھ کر یہ جملہ کہے تو روا ہے لیکن اگر کوئی

اعجاب نفس سے لوگوں کو حقیر سمجھتے ہوئے یہ تبصرہ کرے تو اسی چیز سے منع کیا گیا ہے)۔

— ”بینما رجل یمشی فى حلة تعجبه نفسه ،مرجل جمته ،اذ خسف

اللہ به فهو یجلجل إلى یوم القيامة (۲)۔

ایک شخص عمدہ لباس پہنے، بودے جمائے اکڑتا اترتا چلا جا رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے

یہ ایک اسے زمین میں دھنسا دیا جہاں وہ قیامت تک اسی طرح زمین میں دھنستا رہے گا۔

(۱) سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب ۷۷

(۲) صحیح بخاری، کتاب اللباس، باب من جر ثوبه من الخیلاء

س: عجب کی تعریف کیا ہے؟

ج: آدمی کا اپنی کسی خوبی اور کمال کو یا تو اپنی طرف سے سمجھنا اور اللہ کی عطا کو ذہن اور حالاً فراموش کر دینا یا اپنے آپ کو اس کا مستحق جاننا اور نتیجتاً اللہ کے فضل پر شکر گزار اور خوش ہونے کی بجائے اپنی انفرادیت و امتیاز پر شاداں ہونا یہ عجب کی مفصل تعریف ہے جس میں اس کے بڑے بڑے اجزاء آگئے ہیں۔ اور مختصر یہ کہ کمال کو اپنی طرف سے سمجھنا اور اس پر اکثر نا اور یہ بھول جانا کہ یہ اللہ کی عطا ہے جو وہ سب بھی کر سکتا ہے۔

س: عجب کی مفصل تعریف میں کئی باتیں آگئی ہیں جو اجمال کی وجہ سے واضح نہیں ہوئیں بہتر ہوگا کہ ایک ایک جزو کی ضروری تشریح کر دی جائے؟

ج: عجب کا پہلا درجہ یہ ہے کہ آدمی اپنے کمال کے حصول کی نسبت بھی اپنی طرف کرے اور استحقاق کی نسبت بھی۔ پہلے جزو کے نتیجے میں اللہ کے فضل کا تصور غائب ہو جاتا ہے اور دوسرے کے نتیجے میں اللہ کے فضل کا ایک ذہنی خیال تو رہتا ہے مگر اس کی شکر گزاری پیدا نہیں ہوتی۔ گویا کسی واقعی یا خیالی وصف کی بناء پر اللہ کی نعمت کا استحضار اور اس پر اس کی شکر گزاری اگر اپنی مطلوبہ سطح پر ذہن اور طبیعت دونوں میں راسخ نہ ہو اور ساتھ ہی یہ عقیدہ کہ اللہ دیتا ہے اور دے کر واپس بھی لے سکتا ہے زندہ حالت میں موجود نہ ہو تو اس سے آدمی کے اپنے منفرد اور ممتاز ہونے کا احساس ناروا حد تک قوی ہو جاتا ہے۔

عجب کے دوسرے درجے میں آدمی کمال و خوبی کی نسبت تو اپنی طرف نہیں کرتا لیکن خیال یا احساس کی سطح پر اس کمال و خوبی کو اپنا حق ضرور جانتا ہے یعنی اگر وہ کمال اسے نہ ملتا تو گویا یہ اس کی حق تلفی ہوتی۔ ایسا آدمی اللہ کو منعم تو مانتا ہے لیکن اس کے شکر کا ضروری حق ادا کرنے کے قابل نہیں رہتا۔

عُجب کا ایک اور درجہ بھی ہے جس کے الگ سے کوئی معنی نہیں ہیں بلکہ وہ مذکورہ بالا دونوں درجات ہی سے تعلق رکھتا ہے وہ یہ ہے کہ آدمی کا ذہن تو یہ مانتا ہو کہ میرے پاس جو کچھ ہے اللہ ہی کا دیا ہوا ہے مگر از روئے حال وہ اپنے اس تصور کے برعکس جذبات و احساسات رکھتا ہو۔ ایسے آدمی کی پہچان یہ ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے اس دعوے کی لہر میں رہتا ہے کہ اللہ نے فلاں معاملے میں میری طرح کسی اور کو نہیں بنایا۔ یہ عُجب کی پیچیدہ ترین اور نہایت خطرناک قسم ہے کیونکہ اس کا مریض اس دھوکے میں مبتلا رہتا ہے کہ میں تو تحدیثِ نعمت کر رہا ہوں۔

عُجب عوام کی بیماری نہیں ہے اس میں زیادہ تر خواص ہی مبتلا ہوتے ہیں۔ ہم نے جو تیسری قسم بتائی ہے اس میں زیادہ تر دیندار حضرات گرفتار ہوتے ہیں یعنی علماء اور صوفیاء وغیرہ۔ اس موضوع پر اگر کسی کو پوری تفصیل درکار ہو تو وہ ابن جوزی کی ”تلیس ابلیس“ کا مطالعہ کرے۔

س: عُجب پر آپ کئی گفتگو قدرے طویل ہو گئی اس لیے ذہن تمام نکات کا احاطہ نہیں کر پا رہا۔ کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ آپ عُجب کے بڑے بڑے مظاہر اور نقصانات نمبر وار بیان کر دیں؟

ج: جی ہاں! عُجب کے بڑے بڑے مظاہر یہ ہیں:

① اپنے آپ کو کسی ایک یا چند معاملات میں دوسروں سے ممتاز جاننا۔ یہ چیز تکبر میں بھی پائی جاتی ہے لیکن تکبر میں صرف اپنا اقرار ہوتا ہے اور دوسرے کو اس بڑائی سے محروم سمجھا جاتا ہے جب کہ عُجب میں وہ خوبی دوسروں میں بھی تسلیم کی جاتی ہے لیکن خود سے کم۔

② دوسروں کی تعریف اس طرح کرنا جیسے کوئی استاد اپنے شاگرد کی یا کوئی بڑا اپنے چھوٹے کی کرتا ہے اور اس تعریف پر طالبِ داد ہونا۔

- ③ اپنے کمال کو مبالغے کے ساتھ محسوس اور ظاہر کرنا۔
- ④ اپنی خوبیوں میں ایسا انہماک رکھنا کہ گویا یہ اللہ کی دین نہیں ہیں بلکہ اپنے زور بازو سے حاصل کی گئی ہیں۔
- ⑤ اپنے کمالات پر اللہ کا شکر گزار نہ ہونا اور اگر ہونا بھی تو تکلفاً۔
- ⑥ عجب میں مبتلا آدمی کی ایک عام پہچان یہ ہے کہ اس کی گفتگو میں اس طرح کے ٹکڑے ضرور ہوتے ہیں ”لیکن میرا تو یہ خیال ہے“، ”میں یہ نہیں سمجھتا کہ فلاں کے اس قول کو کوئی اہمیت دی جاسکتی ہے“، ”میں آپ کو بتاتا ہوں“، ”میں آپ کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں“، ”آپ نے بات تو اچھی کہی ہے لیکن میں اسے ذرا اور اوپر لے جانا ہوں“ وغیرہ وغیرہ۔
- ⑦ متکبر آدمی کے برعکس عجب میں مبتلا شخص بہت دھیمہ، خوش اخلاق اور بعض اوقات متواضع بھی ہوتا ہے۔ اگر اوپر کی علامتیں اس طرح کے رویے رکھنے والے کسی شخص میں پائی جائیں تو اس پر عجب کا شبہ کیا جاسکتا ہے۔
- ⑧ ایسا شخص اپنے موجودہ کمال اور خوبی میں اضافے کی ضرورت نہیں سمجھتا اور اس کی ترقی کے لیے درکار کوشش اور محنت نہیں کرتا۔ یہ ایک عام نشانی ہے۔
- س: عجب کے چند بڑے نقصانات کیا ہیں؟
- ج: عجب کے چند نقصانات درج ذیل ہیں:
- ① وہ احساس محتاجی اور خوف بے نیازی جو بندگی کا خاصا ہے، عجب کی وجہ سے غائب ہو جاتا ہے یعنی بندہ اپنے آپ کو اللہ کا محتاج نہیں محسوس کرتا اور اس کی نعمتوں کے سلب ہو جانے کے امکان سے خوف زدہ نہیں ہوتا۔
- ② عدم شکر
- ③ انکسار، جو مسلمانوں کی معاشرت کی ایک بڑی قدر ہے، کا فقدان۔

④ نفاق یعنی زبان یا ذہن سے اللہ کی نعمت کا اس طرح اقرار کرنا کہ دل اس کی تصدیق نہ کرے۔ یہ عجب کا لازمی نقصان ہے۔

⑤ آگے بڑھنے یا کسی سے کچھ سیکھنے کی صلاحیت کا کم ہو جانا یا بالکل ہی نہ رہنا۔
س: عجب کا علاج کیا ہے؟

ج: عجب کے علاج میں کچھ صورتیں تو وہی تجویز اور اختیار کی جائیں گی جو تکبر اور حب جاہ کے علاج میں بیان ہوئی ہیں۔ باقی اصولاً عجب کا علاج ہے اپنی محتاجی پر دلائل قائم کرنا اور اس محتاجی کو مسلسل یاد دہانی کے ذریعے طبیعت میں ایک مستقل احساس کے طور پر اتارنے کی کوشش کرنا اور شکر میں شدت (یعنی مجھ پر اللہ کا بڑا انعام ہے لیکن میں اس بات سے بے فکر نہیں ہوں کہ اللہ اپنا انعام واپس بھی لے سکتا ہے لہذا اللہ کی خوشنودی کے لیے میری زبان کو اس کے شکر سے تر اور دل کو اس کی ثناء سے معمور رہنا چاہیے)۔ یہ ہے عجب کا اصولی علاج۔

س: عجب کے علاج کی عملی صورتیں کیا ہیں؟

ج: ① دن میں دو رکعتیں عجب کے ازالے کی نیت سے پڑھنا اور بس اسی دعا کی تکرار رکھنا کہ ”یا اللہ! میں اپنے اندر یہ مرض پاتا ہوں۔ اس کا فوری ازالہ فرما دیجیے اور آئندہ کے لیے مجھے اس سے اور دیگر ذائل نفس سے محفوظ رہنے کی توفیق عنایت فرما دیجیے۔“ یہ تدبیر گناہ کے لیے فرداً فرداً اور تمام گناہوں کے لیے مجموعاً اختیار کی جا سکتی ہے بلکہ کی جانی چاہیے، چاہے کسی گناہ کا استحضار ہو یا نہ ہو۔

② درود ابراہیمی کثرت سے پڑھنا اور اس میں حضرت محمد ﷺ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اسماء مبارکہ سے پہلے سیدنا کا اضافہ کرنا۔ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ نے سیدنا کے اضافے کو مستحب فرمایا ہے۔ یہاں جس مقصد کے لیے ہم یہ درود تجویز کر رہے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ اس لفظ کی ایک معالجاتی افادیت بھی ہے اور وہ یہ کہ رسول اللہ ﷺ کی بڑائی

چونکہ مخلوق کی بڑائی ہے لہذا اس کا استحضار اور اقرار نفس میں شکستگی پیدا کرتا ہے۔ درود شریف کی ایک حکمت مستقل محسوس ہوتی ہے اور وہ یہ کہ رسول اکرم ﷺ کی جو عقیدت، محبت اور اطاعت شرعاً مطلوب ہے، اسے کثرت سے ذہن اور عمل میں ایک بڑے دینی مقصد کے طور پر ملحوظ رکھنا نفس کی ان تمام بیماریوں کے علاج میں انتہائی کارگر اور موثر ہے جن کے اندر دعوے کا کوئی رنگ پایا جاتا ہے مثلاً تکبر، بغض، کینہ، عجب اور کثرت مال و اولاد پر تفاخر وغیرہ کیونکہ اللہ کے آگے عاجزی اختیار کرنے سے نفس کو نفسیاتی طور پر اس ذلت کا سامنا نہیں ہوتا جو رسول اللہ ﷺ کے سامنے عاجزی اختیار کرنے سے ہوتا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ عبودیت کسی بھی درجے میں رسول اللہ ﷺ کی غیر مشروط اتباع اور مطلق اطاعت کے بغیر عند اللہ مقبول نہیں جیسا کہ قرآن حکیم میں ہے:

﴿قُلْ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا﴾

(النساء: ۵۸-۶۵)

”پس اے نبی! تمہارے رب کی قسم! ایسے لوگ کبھی ایمان والے نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے تمام باہمی جھگڑوں میں تمہیں فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں۔ پھر جو فیصلہ تم کرو اس پر وہ اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں بلکہ دل و جان سے اسے تسلیم کر لیں۔“

③ اسلاف خصوصاً صحابہ کے سوانح اور کارنامے پڑھنا۔

④ اگر مریض عالم بھی ہو تو بھی کسی بڑے عالم سے قرآن مجید سبقاً سبقاً پڑھنے کا آغاز کرنا۔ اس میں بظاہر دو بڑی حکمتیں ہیں ایک عام اور دوسری خاص۔ عام حکمت یہ ہے کہ نفس کا کوئی نقص اور کوئی بیماری ایسی ہو ہی نہیں سکتی جس کا مکمل اور حتمی علاج قرآن فراہم نہ کرتا ہو، جیسا کہ قرآن حکیم میں ہے:

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَ تَكْوِينُكُمْ مَوْعِظَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِّمَا فِي

الصُّدُورِ وَهَدَىٰ وَرَحْمَةً لِّلْمُؤْمِنِينَ ﴿٥٤﴾ (یونس: ۵۴)

”اے لوگو! تمہارے پاس رب کی طرف سے ایک نصیحت آئی ہے۔ وہ تمام قلبی

بیماریوں سے شفا بخشنے والی اور ایمان والوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے۔“

خاص حکمت یہ ہے کہ قرآن خود اپنے متعلق جس علم کے حصول کا مطالبہ کرتا ہے اس میں کمال کا حصول ممکن ہی نہیں ہے یعنی کوئی بڑے سے بڑا عالم یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ قرآن کے ضروری علوم اور حقائق پر مکمل طور سے حاوی ہو چکا ہے۔ اس میں مصلحت یہ ہے کہ علم کی کسی بھی سطح پر قرآن کی محتاجی کم نہیں ہوتی اور قرآن پر غور کرنے کی ضرورت مانتہیں پڑتی۔ جب کوئی ایسا شخص جو قانونی معنی میں کتاب اللہ کا واجبی علم رکھتا ہو اپنے کسی نقص کے ازالے کے لیے قرآن کی طرف رجوع کرتا ہے تو اس رجوع کرنے کے طریقے میں مصلحت کسی ایسی چیز کا اضافہ کیا جاسکتا ہے جو شرعاً بھی مستحب ہو اور نفس میں تواضع پیدا کرنے کا سبب بھی ہو مثلاً ہماری رائے میں یہاں کسی عالم سے قرآن شریف کو سبقاً سبقاً پڑھنا اس مصلحت کو کافی حد تک پورا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہاں یہ اشکال پیدا ہو سکتا ہے کہ ایک آدمی عالم ہوتے ہوئے قرآن کو سبقاً سبقاً پڑھنے کے لیے ایسا کون سا جواز پیدا کر سکتا ہے جو اس کی نظر میں تکلف نہ ہو بلکہ ایک واقعی ضرورت ہو۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر وہ عالم ہے تو یہ بات زیادہ سمجھتا ہوگا کہ قرآنی علم کے لیے درکار کون کون سی چیزیں فی الوقت اسے حاصل نہیں مثلاً بعثت رسول اللہ ﷺ سے پہلے کی تاریخ و ادب، قرآن کی فصاحت و بلاغت، علم احکام، اسباب نزول وغیرہ۔

اس تجویز سے ان شاء اللہ دو بڑی چیزیں حاصل ہو جائیں گی۔ ایک تو قرآن کا مزید علم اور دوسرے عالم ہونے کے باوجود کسی کی شاگردی اختیار کرنا اس کے نفس پر بار ہو گا۔ اس بار کو وہ اللہ کی خوشنودی اور اپنی اصلاح کے لیے اٹھائے گا تو اس کے مطلوبہ نتائج جلدی اور عمدگی کے ساتھ ظاہر ہونے کی پوری امید ہے۔

۵ کوئی مفید علم اور فن سیکھنا خواہ وہ دنیاوی ہی کیوں نہ ہو۔

۶ اپنی جس خوبی پر فخر ہو اس خوبی میں کمال پیدا کرنے کے لیے کسی کی مدد اور نگرانی قبول کرنا مثلاً کسی شخص کو اپنے زہد پر فخر ہو تو وہ زہد کے بعض ایسے مطالبات دریافت کرے جن کی تکمیل ابھی رہتی ہو۔ پھر کسی ایسے شخص کے پاس جائے جو زہد میں اس سے بڑھ کر ہو اور ان تقاضوں پر عامل بھی ہو اور اس سے درخواست کرے کہ ”جناب! میرے زہد میں یہ کمی رہ گئی ہے اسے پورا کرنے کے لیے میری رہنمائی فرمائیں۔ میں وہی کروں گا جو آپ کہیں گے۔“

مندرجہ بالا تینوں تدابیر (یعنی نمبر ۴، ۵ اور ۶) کا معالجاتی کردار یکساں ہے جو تعلیم قرآن کے ضمن میں بیان ہو چکا ہے۔

۷ جو چیز بنائے عجب ہو اُسے عیب کی طرح چھپانے کی کوشش کی جائے اور بالکل عام آدمی کی طرح رہن سہن اور انداز گفتگو (وغیرہ) اختیار کیا جائے۔ اور یہ کام اس وقت تک جاری رکھا جائے جب تک عجب کے ازالے کا یقین نہ ہو جائے۔ اس کے بعد پھر اپنے ذوق پر عمل کرے۔



غضب

حکم ربانی

— وَالَّذِينَ يَجْتَنِبُونَ كَثِيرَ الْإِثْمِ وَالْفَوَاحِشِ وَإِذَا مَا غَضِبُوا هُمْ يَغْفِرُونَ ﴿٣٤﴾

(الشوری: ۳۴)

”(مومن وہ ہیں) جو بڑے گناہوں اور بے حیائی سے بچتے ہیں اور جب انہیں غصہ آتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں۔“ (۳۷)

— وَذَٰلَ النُّونِ إِذْ ذُهِبَ مُغَاصِبًا فُظِّنَ أَنَّ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ..... ﴿٣٥﴾

(الانبياء: ۲۱: ۸۷)

”اور اسی طرح مچھلی والے (یونس نبی پر بھی ہم نے فضل کیا۔ یاد کرو) جب کہ وہ اپنی قوم سے غضبناک ہو کر چلے گئے اور وہ سمجھے کہ ہم اس بات پر کوئی گرفت نہیں کریں گے۔“ (۸۷)

فرمان نبوی

— ”ليس الشديد بالصرعة، انما الشديد الذي يملك نفسه

عند الغضب۔“ (۱)

پہلوان اور طاقت ور وہ نہیں ہے جو دم مقابل کو پچھاڑ دے بلکہ پہلوان اور شہ زور درحقیقت وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے نفس پر قابو رکھے۔

— ”عن ابی ہریرۃ، ان رجلاً قال للنبی اوصنی قال لا تغضب،

فردد ذلك مراراً قال لا تغضب۔“ (۲)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ

(۱) صحیح بخاری، کتاب الادب، باب الحذر من الغضب

(۲) صحیح بخاری، کتاب الادب، باب الحذر من الغضب

سے عرض کیا کہ: حضرت مجھے کوئی نصیحت فرمائیے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ غصہ مت کیا کرو۔ اس شخص نے اپنی درخواست کئی بار دہرائی کہ حضرت مجھے کچھ اور نصیحت فرمائیے مگر آپ نے ہر دفعہ یہی فرمایا کہ: غصہ مت کیا کرو۔“

س: غضب کیا ہے؟

ج: غضب کا تعلق ان بیماریوں سے ہے جو نفس کے تخریبی جوش سے پیدا ہوتی ہیں۔ وہ تخریبی جوش کبھی تو صحیح وجہ سے پیدا ہوتا ہے اور اکثر غلط وجہ سے۔ بالجملة غضب کہتے ہیں نفس کے اس اشتعال کو جس میں آدمی:

— صحیح اور غلط میں تمیز فراموش کر دیتا ہے

— انصاف کی حدود سے تجاوز کر جاتا ہے

— کسی دوسرے بڑے گناہ کا مرتکب ہو جاتا ہے

ممکن ہے کہ یہ تینوں چیزیں ایک ساتھ واقع ہو جائیں اور ممکن ہے کہ ان میں سے کوئی ایک چیز کا رفر ما ہو۔

پہلی تعریف یعنی صحیح اور غلط کی تمیز کھو بیٹھنا یہ ہے کہ شدت غضب سے دماغ ماؤف ہو جائے۔ اس کا مظاہرہ عام ہے لہذا اس کی مثالوں کی ضرورت نہیں۔

غصے میں انصاف کی حدود سے تجاوز کر جانا یہ ہے کہ غصے کا سبب ٹھیک ہو مثلاً حفظ آبرو، حمیت دینی وغیرہ لیکن اس غصے کے نتیجے میں جو کام سرزد ہو وہ شریعت کی مقرر کردہ حدود سے باہر نکل جائے مثلاً کسی نے گالی دی تو جواب میں اسے بھی گالی دینا، کسی نے مال غصب کر لیا تو جواب میں اس کی بھی کوئی چیز چھین لینا یا کسی نے گمراہی کی کوئی بات کی تو رد عمل میں اسے کافر اور مشرک کہہ دینا وغیرہ۔ اس طرح کے تمام مواقع پر محرک غضب بالکل ٹھیک اور جائز ہے لیکن اس پر جس طرح عمل کیا گیا وہ شرعاً ناروا ہے۔

غضب کی تیسری تعریف اس کی دوسری تعریف سے اصولاً مختلف نہیں ہے لیکن سہولت فہم کے لیے ہم نے اسے الگ بیان کیا ہے۔ اس طرح کا غضب عموماً اپنی بنیاد میں ایسا ہوتا ہے کہ اسے جائز کہا جاسکتا ہے نہ حرام یعنی آدمی کو ایسی صورت حال پیش آسکتی ہے جہاں وہ غصہ نہ کرے تو اچھا ہے اور اگر کرے تو شرعاً برا نہیں مثلاً کسی کی غلط تنقید پر بہتر تو یہی ہے کہ تحمل سے کام لیا جائے لیکن اگر غصہ آجاتا ہے تو اس میں بھی شرعاً کوئی عیب نہیں۔ شریعت اسے تب مذموم کہے گی جب اس غصے پر عمل غلط طریقے سے کیا جائے مثلاً اگر کوئی آپ سے یہ کہہ دے کہ تم بہت نکلے ہو تو اس پر آپ کا برا ماننا شرعاً قابل گرفت نہیں ہے لیکن اس کے جواب میں اسے نکما کہنا یا اس کے کسی اور واقعی یا فرضی نقص کا اظہار کرنا یا اس سے تعلق منقطع کر لینا، یہ وہ صورتیں ہیں جہاں شریعت اپنا فیصلہ دیتی ہے کہ یہ ایسا گناہ ہے جو اس شخص کے گناہ سے بڑھ گیا ہے جس نے آپ کو نکما کہا تھا۔

غضب کا مقتضی عموماً مغضوب کی تحقیر، اسے نقصان پہنچانا اور منفی انداز سے بدلہ لینا ہے۔ اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ مغضوب الغضب آدمی اللہ کے خوف سے مجرّم ہو جاتا ہے دوسرے الفاظ میں یہ کہ اللہ سے ڈرنے والا کبھی مغضوب الغضب نہیں ہوتا۔

س: غضب کا علاج کیا ہے؟

ج: یہاں ایک بات سمجھ لینی چاہیے کہ غصہ ہر حال میں اور ہر موقع پر غلط نہیں ہوتا۔ کہیں کہیں غصے کا دل میں پیدا ہونا اور زبان و عمل سے اس کا اظہار شرعاً مطلوب ہوتا ہے۔ لہذا غصے کو اس طرح نہیں سمجھنا چاہیے کہ یہ کوئی ایسی چیز ہے جو ساری کی ساری بری ہو۔ غصے کا محرک عام طور پر کوئی خلاف مرضی چیز ہوتی ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک تربیت یافتہ نفس جس کی مرضی اللہ کی مرضی کے تابع ہو چکی ہو، وہ بھی غصے میں آئے گا لیکن صرف ان موقعوں جب غصہ کرنا دین کا تقاضا ہو۔

جہاں دین کی اہانت اور نافرمانی کی جارہی ہو وہاں غصے کا احساس و اظہار نہ کرنا ایک بڑا دینی نقص ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کی یہ سنت معروف ہے کہ آپ ﷺ کو اپنی کسی ذاتی حق تلفی سے غصہ نہیں آتا تھا لیکن اگر کوئی شخص اللہ کے حقوق اور حدود کی خلاف ورزی کرتا تھا تو آپ ﷺ سے بڑھ کر غضبناک ہونے والا بھی کوئی نہ ہوتا تھا (۱)۔ یہ سمجھ لینا چاہیے کہ غصے کا ازالہ مطلوب نہیں ہے بلکہ غصے کا صحیح مصرف اور محل مطلوب ہے۔ وہ غصہ جو شرعاً ایک برائی ہے اس کے علاج میں مندرجہ ذیل تدابیر مفید ہو سکتی ہیں:

۱۔ اللہ کی رحمت اور مغفرت کا تصور کرنا یعنی یہ خیال کہ نہ جانے میری کتنی نافرمانیاں ہوں گی جو اللہ تعالیٰ نظر انداز کیے جا رہے ہیں۔ اگر وہ بھی میری طرح خلاف مرضی باتوں پر غضبناک ہونے لگیں تو میں اگلا سانس لینے کی مہلت بھی نہیں پا سکتا۔ اس میں رسول اللہ ﷺ کی سنت کے اس حصے کا کثرت سے مطالعہ، تذکرہ اور استحضار جس سے آپ کی شفقت، تحمل اور بردباری کا اظہار ہوتا ہے، مفید ہے۔

۲۔ کثرت ذکر خصوصاً تعوذ، استغفار اور درود شریف

۳۔ اپنی سمجھ اور ذوق کے مطابق ایسے معمولات اختیار کرنا جن سے اللہ کا خوف دل میں پیدا ہو اور ترقی پائے۔

۴۔ اگر کسی پر ناجائز غصہ کیا ہو تو اس سے مبالغے کے ساتھ معافی طلب کرنا۔

۵۔ چھوٹے بچوں (اطفال) کی صحبت میں وقت کا ایک حصہ گزارنا۔

۶۔ بعض اوقات غصہ کسی جسمانی یا ذہنی بیماری کی وجہ سے بھی پیدا ہو جاتا ہے ایسی صورت میں اس بیماری کا علاج ہی غصے کا علاج ہے۔

(۱) صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب مباحثہ للآثام۔

احادیث سے غضب کے مندرجہ ذیل علاج بھی ہمارے سامنے آتے ہیں:

۷۔ تعوذ (اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم) پڑھنا (۱) کیونکہ نفس انسانی میں تموج اور اشتعال اوصاف نار میں سے ہے (۲) جو مادہ تخلیق شیطان ہے لہذا اس شیطانی وصف کے بعد کے لیے تعوذ پڑھنا مفید ہے۔

۸۔ عدم حرکت (۳) (یعنی بیٹھ جانا یا لیٹ جانا) کیونکہ غصہ عموماً Situational اور نفس میں تموج کے سبب ہوتا ہے لہذا عدم حرکت اس کی برودت میں مدد معاون ہوتی ہے۔

۹۔ خاموشی اختیار کر لینا کہ غصے کے اظہار کا بڑا آلہ زبان ہی ہے۔ (۴)

آخر میں یہ بات ہم ایک بار پھر واضح کر دیں کہ غصہ ان چیزوں میں شامل ہے جو مکمل طور پر جائز یا ناجائز نہیں بلکہ ان کا استعمال اور مقصد ان کے حلال یا حرام ہونے کا تعین کرتا ہے۔ مختصر یہ کہ غصے کی چار قسمیں ہیں:

مباح: یعنی ایسا غصہ جس کی وجہ شرعاً صحیح ہو نہ غلط اور جس کا احساس و اظہار اچھا ہو نہ برا۔ تاہم تزکیہ پیش نظر ہو تو مباح غصے سے بھی بچنے کی تدبیر مفید ہوتی ہے۔

حلال: یعنی اپنی حق تلفی پر جوابی کارروائی کے طور پر غصہ کرنا۔

حرام: اس کی تفصیل واضح ہے۔

واجب: یہ وہ غصہ ہے جو خالصتاً اللہ کے لیے ہو مثلاً کفر و شرک سے نفرت اور اس کا عملی اظہار۔ اس کی بنیاد اس دینی حمیت پر ہے جس سے محروم ہو کر آدمی کا اسلام ناقص رہ جاتا ہے۔

۱۔ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب ما ینھی من السباب واللعن

۲، ۳۔ سنن ترمذی، کتاب الفتن، باب ما اخبر النبی اصحابہ بما ہو کانن۔

۴۔ مسند احمد بن حنبل، ج ۱ ص ۳۸۲، ۳۸۳، ج ۵ ص ۵۲، ۵۳ وغیرہ

حسد

حکم ربانی

— ﴿أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلَى مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ﴾ (النساء: ۵۴)
 کیا انہیں اس بات کا حسد ہے کہ کیوں اللہ نے مسلمانوں کو اپنے فضل سے نوازا ہے؟

— ﴿.....وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ﴾ (العلق ۱۱۳/۵)
 ”(اللہ کی پناہ مانگو) ہر حسد کرنے والے کے حسد سے۔“

فرمان نبوی

— ”إِيَّاكُمْ وَالْحَسَدَ فَإِنَّ الْحَسَدَ يَأْكُلُ الْحَسَنَاتِ كَمَا تَأْكُلُ النَّارُ
 الْحَطَبَ“ (۱)

حسد سے بچو، اس لئے کہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جیسے آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے۔

— ”ذَبِّ إِلَيْكُمْ دَاءُ الْأُمَمِ قَبْلَكُمْ الْحَسَدُ وَالْبَغْضَاءُ هِيَ الْحَالِقَةُ
 لَا أَقُولُ تَحْلِقُ الشَّعْرَ وَلَكِنْ تَحْلِقُ الدِّينَ“ (۲)

اگلی امتوں کی مہلک بیماری یعنی حسد و بغض تمہاری طرف چلی آرہی ہے، یہ بالکل صفایا کر دینے والی اور موٹہ دینے والی ہے (پھر اپنا مقصد واضح کرتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا) میرے اس کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ بالوں کو موٹہ دینے والی ہے، بلکہ یہ موٹہ دیتی ہے اور بالکل صفایا کر دیتی ہے دین کا۔

(۱) سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب الحسد

(۲) جامع الترمذی، ابواب صفۃ القیامۃ، باب ماجاء فی ظن السوء

س: حسد کسے کہتے ہیں؟

ج: کسی آدمی میں کوئی ایسی خوبی دیکھ کر جو ہم میں یا تو کم پائی جاتی ہو یا سرے سے نہیں پائی جاتی یہ تمنا کرنا کہ کاش یہ وصف اس آدمی سے چھن جائے، حسد ہے۔

س: حسد کے نقصانات کیا ہیں؟

ج: حدیث شریف میں آیا ہے کہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جیسے آگ خشک لکڑیوں کو ختم کر دیتی ہے۔ (۱)

یعنی حسد کا تعلق ان خرابیوں سے ہے جو تمام نیکیوں کو متاثر کرتی ہیں۔ اس کے مضر اثرات کی کچھ تفسیر اس طرح ہے:

① طبیعت میں پستی پیدا ہو جاتی ہے

② محبت کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے

③ خیر خواہی کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا

④ صبر و شکر کی توفیق نہیں ملتی

⑤ دین جن احوال کو پسند کرتا ہے، ان میں سے کوئی حال حاسد کو پسند نہیں

ہوتا۔ غور سے دیکھا جائے تو حسد کے اس ایک نتیجے ہی میں اس کے سارے

موجبات شامل ہیں۔

س: حسد کا علاج کیا ہے؟

ج: اس کا جو بھی علاج ہوگا اس کا غالب عنصر محبت اور خیر خواہی کو بنایا جائے

گا مثلاً آدمیاں اپنے محسود کو جس نعمت سے محروم دیکھنا چاہتا ہے اس کے حق میں اس نعمت

اور دیگر نعمتوں کے حصول، بقاء اور اضافے کی تکلف کے ساتھ دعا کرنا یہاں تک کہ

یہ داعیہ کمزور یا ختم ہو جائے۔

(۱) سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فی الحسد

② حسد کے غلبے کوٹالنے کی ایک ترکیب یہ بھی ہے کہ عین حالتِ حسد میں اپنے اوپر ہونے والی کسی رحمت کو یاد کر لیا جائے جو محسوس میں نہیں پائی جاتی — یہ ایک وقتی تدبیر ہے اور کچھ ایسی پسندیدہ بھی نہیں ہے لیکن چونکہ غلبہٴ حسد کو رفع کرنے میں معاون ہو سکتی ہے لہذا عارضی طور پر اس پر عمل کیا جاسکتا ہے۔

③ محسوس کی تعریف و توصیف کرنا، خصوصاً ان معاملات میں جو باعثِ حسد ہیں۔

④ حدیث شریف میں وارد درود شریف کے ایک صیغہ ”اللہم صل علی سیدنا محمد عبدک ورسولک و صل علی المومنین و المومنات و المسلمین و المسلمات“ (۱) کی کثرت اس خیال سے رکھنا کہ دنیا کی سب سے بڑی نعمت جو مجھے حاصل ہے وہ یہ کہ میں مومن و مسلمان ہونے کی وجہ سے مستحقِ صلاۃ ہوں۔ یہ دھیان اگر اچھی طرح قائم ہو گیا تو حسد کا علاج فی الفور ممکن ہے۔

⑤ دو رکعت نماز تو بہ دن میں ایک مرتبہ ورنہ کم از کم ہفتے میں ایک بار جس کے تمام ارکان میں استغفار کی کثرت کی جائے اور قعدہ میں التَّحِیَّات کو کچھ بار دہرایا جائے۔ اس میں معافی کا استحضار بھی ضروری ہے۔

⑥ عام طور پر حاسد، بخیل اور سنگدل بھی ہوتا ہے۔ بعض اوقات بخل اور دل کی سختی ختم ہو جائے تو حسد سے خود بخود نجات مل جاتی ہے لہذا اگر کوئی شخص اپنے اندر یہ دو علامتیں موجود پائے تو حسد کے علاج کا آغاز انہی کے علاج سے کرنا چاہیے۔

یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ وہ خرابیاں جو طبیعت کا حصہ بن گئی ہوں نہایت خطرناک ہوتی ہیں کیونکہ ان کی وجہ سے آدمی مستقلاً حالتِ معصیت میں رہتا ہے۔ حسد کا شمار ایسی ہی بیماریوں میں ہوتا ہے لہذا اس کے علاج میں ہمت و مجاہدے سے کام لینا چاہیے

(۱) امام بخاری، ابوالمنذر، باب الصلاۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم

اور علاج کی کامیابی کی صورت میں مطمئن ہو کر نہیں بیٹھ جانا چاہیے بلکہ اس وقت بھی ہوشیار رہنا چاہیے کہ کہیں دوبارہ اس میں مبتلا ہونے کی نوبت نہ آجائے۔ واضح بات یہ ہے کہ بندگی کا بہت بڑا حصہ بلکہ بندگی کی سوچ طبیعت کی سلامتی کا نام ہے۔ طبیعت اُردین اور فضائل دین سے مطابقت نہیں رکھتی تو ہر چیز بے فائدہ ہے، خواہ بڑا علم ہو یا بڑا عمل۔

مذکورہ بالا حدیث شریف پر ایک دفعہ پھر غور کریں اور دیکھیں کہ وہ کون سی نیکی ہے جسے حسد فنا نہیں کر دیتا۔ یقیناً ایسی ایک نیکی بھی نہیں مل سکتی۔ لہذا اسی کو حسد کا بڑا ضرر سمجھیں اور اس کے علاج میں جتنا مبالغہ اور مجاہدہ ممکن ہو، کریں۔

⑦ محسود سے دوستی کا تعلق پیدا کرنا خواہ اس سے میل جول کی صورت میں، خواہ غائبانہ۔
س: رشک اور حسد کی بعض خصوصیات آپس میں ملتی جلتی ہیں حالانکہ رشک جائز ہے اور حسد حرام۔ مناسب ہوگا کہ ان کا بنیادی فرق بتا دیا جائے؟

ج: ان میں فرق یہ ہے کہ رشک میں قلق ہوتا ہے کہ فلاں آدمی کی خوبی مجھ میں کیوں نہیں ہے جبکہ حسد اس قلق پر مبنی ہوتا ہے کہ فلاں آدمی میں وہ خوبی کیوں ہے، جو مجھ میں نہیں۔ رشک میں ایک مثبت پہلو یہ پایا جاتا ہے کہ آدمی اس خوبی کے حصول کی تگ و دو کرتا ہے جبکہ حسد میں یہ پہلو اگر پایا بھی جائے تو بھی غالب کیفیت یہی رہتی ہے کہ مطلوبہ خوبی دوسرے سے زائل ہو جائے، پھر چاہے مجھے حاصل ہو مانہ ہو۔



بغض اور کینہ

حکم ربانی

﴿ اَذَلَّةٌ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ اِعْزَازٌ عَلَى الْكَافِرِينَ ﴾ (المائدہ: ۵۴)

(مومن وہ ہیں جو) مومنوں پر نرم اور کافروں پر سخت ہیں۔

﴿ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ اَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ ﴾
(الفتح: ۲۹: ۳۸)

— محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں اور ان کے ساتھی کافروں پر سخت ہیں، آپس میں مہربان۔

فرمان نبوی

— ”لَا تَبَاغَضُوا، وَلَا تَحَاسَدُوا، وَلَا تَدَابَرُوا، وَلَا تَقَاطَعُوا، وَكُونُوا عِبَادَ اللَّهِ

اِخْوَانًا، وَلَا يَجُلْ لِمُسْلِمٍ اَنْ يَهْجُرَ اَخَاهُ فَوْقَ ثَلَاثٍ“۔ (۱)

ایک دوسرے سے بغض نہ رکھو، نہ باہم حسد کرو، نہ ایک دوسرے کو پیٹھ دکھاؤ، نہ آپس میں تعلق منقطع کرو اور اے اللہ کے بندو، بھائی بھائی بن جاؤ۔ کسی مسلمان کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے (کسی مسلمان) بھائی سے تین دن سے زیادہ بول چال چھوڑے رکھے۔

— ”دب اليكم داء الامم قبلكم الحسد والبغضاء هما الحالقة لا

اقول تحلق الشعر ولكن تحلق الدين“

اگلی امتوں کی مہلک بیماری یعنی حسد و بغض تمہاری طرف چلی آ رہی ہے یہ بالکل صفایا کروینے والی اور مونڈ دینے والی ہے (پھر اپنا مقصد واضح کرتے ہوئے فرمایا) میرے اس کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ بالوں کو مونڈنے والی ہے بلکہ یہ مونڈتی ہے اور بالکل صفایا کر دیتی ہے دین کا۔

(۱) صحیح بخاری، کتاب الادب، باب ماینہی عن الحاسد

(۲) جامع الترمذی، ابواب صفة القيامة، باب ماجاء فی ظن السوء

س: کیا بغض اور کینہ میں فرق ہے؟

ج: بغض دوسرے کی بدخواہی ہے اور کینہ اس بدخواہی پر عمل کرنے کی شدید خواہش۔ ان میں دوسرا فرق یہ ہے کہ بغض کے لیے کوئی وجہ ضروری نہیں ہوتی جب کہ کینے کا کوئی جھوٹا سبب ہوا کرتا ہے۔ عام معنی میں یہ دونوں معروف ہیں لہذا تفصیل میں جانے کی غالباً ضرورت نہیں۔

س: اگر آپ بات کو ایک دو مثالوں سے واضح کر دیں تو عنایت ہوگی؟

ج: مثلاً ایک شخص کسی آدمی سے بلا وجہ چڑنے لگے اور وہ چڑ رفتہ رفتہ بدخواہی بن جائے تو یہ بغض ہے۔ دوسری طرف کینہ اس کیفیت کا نام ہے جس میں آدمی کو کسی سے کوئی شکایت پیدا ہو جاتی ہے مگر بھلے لوگوں کی طرح اس شکایت کا ازالہ کرنے کی بجائے وہ آدمی اسے دل میں پالتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ شکایت بغض میں بدل جاتی ہے اور بغض بڑھتے بڑھتے عداوت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ کینہ عداوت کی اسی صورت کو کہتے ہیں۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ بغض آدمی کو اس شخص سے دوری اختیار کرنے پر مجبور کرتا ہے جس کے لیے دل میں بغض پیدا ہو جائے جب کہ کینہ اس آدمی کو نقصان پہنچانے کی خواہش پیدا کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں بغض غصے سے مماثلت رکھتا ہے اور کینہ حسد سے۔

س: بغض اور کینے کے مظاہر تو بر کوئی جانتا ہے البتہ ان کے اسباب پر کچھ روشنی ڈال دی جائے تو بہتر ہوگا؟

ج: بغض اور کینے کے اسباب مشترک ہیں یعنی جس وجہ سے بغض پیدا ہوتا ہے وہی وجہ کینے کو بھی جنم دیتی ہے۔ ان اسباب کی مختصر فہرست یہ ہے:

— ناشکری

— دل کا مسلمانوں کی محبت، خیر خواہی اور اکرام سے خالی ہونا۔

— احساسِ کمتری

— اپنے بارے میں ناروا حد تک بڑھی ہوئی زود حسی اور مریضانہ خود پسندی۔

— اپنی بڑائی کی خواہش

— دنیاوی ناکامیوں سے مبالغے کے ساتھ متاثر ہونا۔

س: بغض اور کینہ کے نقصانات کیا ہیں؟

ج: دینی نقصانات

۱۔ جھوٹ، غیبت اور بہتان

۲۔ مسلمان کو تکلیف پہنچانے کی خواہش

۳۔ تجسس اور سازش

۴۔ ہر دینی عمل سے طبیعت میں بے زاری کا پیدا ہو جانا۔

۵۔ اللہ کے خوف اور محبت کا کمترین درجہ بھی گنوا بیٹھنا۔

۶۔ رسول اللہ ﷺ کی محبت کا تقریباً فقدان اور آپؐ کی نسبت کا ملحوظ نہ رہنا۔

۷۔ دین کو ہر چیز پر فوقیت دینے کا مزاج پیدا نہ ہونا۔

۸۔ نفسِ امارہ کی مزاحمت کا جذبہ اور طاقت نہ رہنا۔

۹۔ نفاق

بغض و کینہ کے انہی نقصانات کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں انہیں

شیطانی فعل قرار دیا ہے۔ (آل عمران ۵: ۹۱) اور نبی کریم ﷺ نے مسلمانوں کو سختی سے بغض

و کینہ سے منع کیا ہے (۱) کیونکہ یہ سارے اخلاقِ حسنہ کی جڑ کاٹ دیتا ہے۔ (۲)

۱۔ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب ما ینہی عن التحاسد والتدابیر

۲۔ مسند احمد بن حنبل، ج ۱ ص ۱۶۵، ۱۶۷

نفسیاتی نقصانات

- ۱۔ نفس میں خوشی، غم، محبت، نفرت وغیرہ ایک قدر پر قائم ہوتے ہیں۔ یہ مرض اس قدر کو مجروح کر کے ان تمام داعیات کو غیر متوازن کر دیتا ہے۔
- ۲۔ بغض سے تحرشی طبیعت اور کینے سے منفی سوچ پوری شخصیت پر غالب آجاتی ہے۔
- ۳۔ اس مرض میں مبتلا شخص تعلق کے تجربے اور کیفیت سے محروم ہو جاتا ہے جس سے شخصیت مسخ ہو جاتی ہے۔

- ۴۔ بغض اور کینے سے طبیعت میں اذیت پسندی پیدا ہو جاتی ہے جو ایک خط ناک نفسیاتی عارضہ ہے۔

- ۵۔ ایسے مریض کو سچی خوشی نصیب نہیں ہوتی جو شخصیت کے نارمل نشوونما کے لیے اتنی ہی ضروری ہے جتنا درخت کے لیے پانی۔ یہاں خوشی کو اطمینان کے معنی میں بھی لینا چاہیے جس کے بغیر انسان کے لیے اس کا وجود بے جواز، بے معنی اور بے حوالہ بن کر رہ جاتا ہے۔

- ۶۔ بغض اور کینہ اگر شخصیت پر مکمل غلبہ حاصل کر لے تو آدمی دوہری شخصیت یعنی تیز و فریبنہ کا مریض بن جاتا ہے، جو نفسیاتی بیماریوں میں غالباً سب سے خطرناک بیماری ہے۔

دنیاوی اور معاشرتی نقصانات

ان کے نقصانات اتنے واضح ہیں کہ ہر شخص جانتا ہے لہذا انہیں بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، بس اتنا اشارہ کافی ہے کہ یہ خرابی انسانی شخصیت کے پورے ماحول و ناسازگار بنادیتی ہے اور دنیاوی و معاشرتی زندگی کی ہر سطح سے اسے باہر نکال پھیلتی ہے۔

س: اس کا علاج کیا ہے؟

ج: اس کا علاج حسد کے باب میں دیکھ لیا جائے۔

حُجین (بزدلی)

حکم ربانی

﴿فَلَمَّا كَتَبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ إِذَا فَرِيقٌ مِنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللَّهِ أَوْ أَشَدَّ خَشْيَةً.....﴾ (النساء: ۷۷)

پھر جب ان پر جہاد فرض ہوا تو ان میں سے ایک گروہ انسانوں سے ڈرنے لگا جیسے اللہ سے ڈرنا چاہیے بلکہ اس سے بھی زیادہ۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا الْقِيَتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا زَحْفًا فَلَا تُولُوهُمْ الْأَدْبَارَ وَمَنْ يُولِهِمْ يُؤْمِدْ دُبْرَةَ الْأَمْتَحْرِفًا لِقِتَالٍ أَوْ مُتَحَيِّزًا إِلَىٰ فِتْنَةٍ فَقَدْ بَاءَ بِغَضَبٍ مِنَ اللَّهِ وَمَا وَدَّ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ﴾ (الأنفال: ۸، ۱۵، ۱۶)

اے ایمان والو! جب تمہارا مقابلہ کافروں کے لشکر سے ہو تو پیٹھ نہ دکھاؤ۔ اور جس نے ایسے موقع پر پیٹھ دکھائی تو اس پر اللہ کا غضب نازل ہوگا، اس کا ٹھکانا جہنم ہوگا اور وہ بہت ہی بُرا ٹھکانہ ہے۔ البتہ اگر پیچھے ہٹنا جنگی چال کے لیے ہو یا اپنے دوسرے لشکر سے ملنے کے لیے ہو تو اس کی اجازت ہے۔

فرمان نبوی

— ”شر مافی رجل شخّ هالع وجبن خالع“ (۱)

انسان میں سب سے بری خصوصیات یہ ہیں کہ وہ ہر وقت مال کی حرص میں گھلتا کر ہتھارتا رہے اور بزدلی کی وجہ سے ہر وقت اکھڑا اور گھبراہٹا رہے۔

— ”من مات ولم يغز ولم يحدث نفسه بغزو، مات على شعبة من

النفاق“ (۲)

جو شخص اس حال میں مرے کہ اس نے جہاد (قتال) کیا ہو اور نہ اس کے دل میں اس کی آرزو ہی پیدا ہوئی ہو تو وہ گویا نفاق کی ایک خصلت پر مرا۔

(۱) سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، باب فی الجراة والجن

(۲) صحیح مسلم، کتاب الامارہ، باب ذم من مات ولم يغز

س: جین کی تعریف؟

ج: جہاں شریعت، حمیت اور عام معاشرتی اخلاق کوئی خطرہ مول لینے کا تقاضا کریں وہاں سے آدمی جان وغیرہ کے ڈر سے جھجک جائے یا منہ موڑ لے تو یہ جین ہوگا یعنی دینی مقاصد کے لیے درکار مکانی قربانیاں دینے سے ڈرنا۔ بزدلی میں یہ بات واضح طور پر ظاہر ہو جاتی ہے کہ یہ آدمی اپنے جان و مال کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ترجیح دیتا ہے۔ ایک بات البتہ ملحوظ رہنی چاہیے کہ بعض اھل طبع کمزور دل کے ہوتے ہیں اور جلدی ڈر جاتے ہیں۔ ان کی اس حالت کو بزدلی سے تعبیر نہیں کیا جائے گا تا وقتیکہ وہ اس کی بنیاد پر احکام سے روگردانی نہ کریں اور چاہے خوفزدگی کی حالت میں نکلیں مگر نکل پڑیں۔

س: بزدلی کے مضر اثرات کیا ہیں؟

ج: بزدلی وہ مرض ہے جو یوں سمجھیں کہ پورے اسلام کے خلاف ہے۔ اسلام اپنے ماننے والے سے جو پہلا تقاضا کرتا ہے وہ یہ ہے کہ آدمی خود کو، آل و اولاد کو اور اپنے مال و اسباب کو اللہ پر نثار کرنے کے لیے ہمہ وقت آمادہ رہے۔ یہ حال نہ ہو تو دین کا کوئی بھی تقاضا اچھی طرح پورا نہیں ہو سکتا۔ بزدل آدمی اس بنیادی مطالبے سے انحراف کرتا ہے۔ اسی لیے آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ بدترین خصلتیں جو کسی شخص میں ہو سکتی ہیں وہ ہیں بزدلی اور نکل۔ (۱)

اس اصولی ضرر کے بعد اس سے پیدا ہونے والی چند دیگر خرابیاں حسب ذیل ہیں:

- ۱۔ اللہ کی محبت، اطاعت اور خوف سے محرومی
- ۲۔ رسول اللہ ﷺ کی محبت میں کمی اور آپ کی دی ہوئی بشارتوں پر مطلوبہ یقین پیدا نہ ہونا۔

- ۳۔ فضائلِ جہاد سے محرومی
- ۴۔ واضح احکام میں تاویل و تحریف یعنی بزدلی کا شکار آدمی اپنے اس نقص پر پردہ ڈالنے کے لیے جہاد وغیرہ کے واضح احکام میں بھی رد و بدل کرنے لگتا ہے جو اپنی جگہ خود بزدلی سے بڑا گناہ ہے۔
- ۵۔ خود غرضی، بخل، رشوت دینا وغیرہ
- ۶۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے دینی فرض کو ادا نہ کر سکرنا۔
- ۷۔ شہادت اور شوق شہادت سے محرومی۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو شخص اس حالت میں مرے کہ نہ اس نے جہاد کیا ہو اور نہ اس کے دل میں اس کی آرزو ہی پیدا ہوئی ہو تو وہ گویا نفاق کی ایک خصلت پر مرا۔ (۱)
- بزدلی کے انہی نقصانات کی وجہ سے نبی کریم ﷺ ہمیشہ اس سے اللہ کی پناہ مانگا کرتے تھے۔ (۲)
- س: بزدلی کا علاج کیا ہے؟
- ج: بزدلی اخلاقی خرابی ہی نہیں بلکہ طبعی و جسمانی مرض بھی ہے یا یوں کہہ لیں کہ بزدلی کا بیشتر حصہ نفسیاتی نوعیت کا ہوتا ہے لہذا اس کے علاج میں پہلے تو یہ دیکھا جائے گا کہ کہیں یہ کسی نفسیاتی یا جسمانی بگاڑ کا نتیجہ تو نہیں ہے؟ اگر ایسا ہو تو اس کے علاج کے لیے طبیب امراض جسمانی یا امراض ذہنی کی طرف رجوع کرنا پڑے گا، اور اگر بزدلی کا تعلق قلب کی ایسی کمزوری سے ہو جسے شریعت بھی ایک خرابی شمار کرتی ہے تو اس کی کمزوری کے اسباب تلاش کر کے انہیں رفع کرنے کی کوشش کی جائے گی۔
- عام طور پر بزدلی کے بڑے بڑے اسباب یہ ہوتے ہیں:

۱۔ صحیح مسلم، کتاب الامارہ، باب ذم من مات ولم یغزو۔

۲۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد، باب ما یعود من الجبن

- ۱۔ حب دنیا، جس میں مال، اولاد، منصب، زندگی وغیرہ کی محبت بھی شامل ہے۔
- ۲۔ آخرت پر یقین میں کمی

۳۔ دین کا غلط تصور مثلاً دین اجتماعی زندگی کی بقا کے لیے کچھ قربانیاں اور مجاہدات چاہتا ہے اس کی اہمیت کو نہ سمجھنا یا نہ ماننا اور فقط شخصی فضائل کے ایک آرام دہ تصور میں گرفتار رہنا۔ بارہا دیکھنے میں آیا ہے کہ گوشہ نشین اور زہد قسم کے لوگ دین کی راہ میں وہ قربانیاں دینے سے بچتے ہیں جو وقت آنے پر قریب قریب ہر مسلمان پر واجب کر دی گئی ہیں مثلاً جان کا ایثار، مال کا ایثار وغیرہ۔

ان تمام اسباب کو رفع کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں کسی بھی نوعیت کا اجتماعی جہاد کرنے والوں سے ایسا تعلق پیدا کیا جائے جیسا استاد اور شاگرد، پیر اور مرید یا حاکم اور محکوم میں ہوتا ہے۔ ایسے مجاہدین کی کسی جماعت میں داخل ہو کر ان کے نظم کی پابندی کر لی جائے تو بزدلی کا بہت جلد قلع قمع ممکن ہے۔ لیکن یہ خیال رہے کہ اسلام کے نام پر سر ہتھیلی پر لیے پھرنے والوں میں سبھی لوگ مخلص اور صحیح معنوں میں مجاہد نہیں ہیں لہذا یہ قدم کسی صاحب اخلاص عالم کے مشورے سے اٹھایا جائے تاکہ یہ نہ ہو کہ بزدلی کا علاج تو ہو جائے مگر اس کے نتیجے میں سفاکی اور بہیمیت کے علاوہ کچھ باتھ نہ آئے۔

اس مرض کا دوسرا علاج تبلیغ ہے یعنی اپنے ارد گرد لوگوں کو دینی احکام پر چلنے کی تلقین کرتے رہنا۔ تبلیغ سے آدمی میں ایک ایسی قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ حق بات کسی سے بھی اور کہیں بھی کر سکتا ہے۔ بس یہ صلاحیت پیدا ہو جائے تو بزدلی خود بخود ختم ہو جاتی ہے۔



کسل (کاہلی و بے رغبتی)

حکم ربانی

— وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ ﴿٢٩﴾

(العنکبوت ۲۹)

جو لوگ ہماری راہ میں کوشش کرتے ہیں ہم ضرور ان کو اپنے راستوں کی طرف ہدایت کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نیکو کاروں کے ساتھ ہے۔

— وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتَّى يَأْتِيَكَ الْيَقِينُ ﴿١٥﴾ (الحجر ۱۵)

اور اپنے رب کی عبادت کرتا رہ یہاں تک کہ تجھے موت آجائے۔

فرمان نبوی

— ”عن عائشه ان النبي ﷺ كان يقوم من الليل حتى تنفطر قدماه“ (۱)

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ رات کو اتنا لمبا قیام فرماتے کہ آپ کے پیر سو ج جاتے۔

— ”نعمتان مغبون فيهما كثير من الناس: الصحة والفراغ“ (۲)

دونمیتیں ہیں، اکثر لوگ (ان کے غلط استعمال کی وجہ سے) خسارے اور گھائے میں رہیں گے، صحت اور فراغت۔“

س: کسل سے کیا مراد ہے؟

ج: کسل ایسی سستی اور کاہلی کو کہتے ہیں جو بے رغبتی سے پیدا ہو۔ شریعت میں کسل کو

مرض بتایا گیا ہے کیونکہ اس کی وجہ سے تمام اعمال خیر متاثر ہوتے ہیں۔ اصطلاح

شریعت میں کسل کا مطلب ہوگا اللہ کی بندگی میں اس لیے کوتاہی کرنا کہ خود بندگی

سے بیزاری محسوس ہو۔

(۱) صحیح بخاری، کتاب التہجد، باب قیام النبی صلی اللہ علیہ وسلم

(۲) صحیح بخاری، کتاب المرقا، باب ما جاء فی المرقا وان المیش المیش الآخرۃ۔

اس تعریف کی رو سے کسل ایک نہایت خطرناک مرض ہے جس کی طرف فوری توجہ نہ کی جائے تو یہ بہت تیزی سے بڑھتا ہے اور بالآخر عبودیت کی موت پر ختم ہوتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا مظہر بس ایک ہے: اللہ اور رسول ﷺ کے ہر حکم کو اٹنے کی شعوری اور ارادی کوشش کرنا اور اگر کسی دباؤ سے تعمیل کرنی ہی پڑ جائے تو بیزاری، بے دلی، بے دھیانی اور بے سلیقگی سے عمل کرنا (النساء: ۱۳۲)۔ کسل کا مریض بندگی کو بیگار سمجھنے لگتا ہے اور اس سے چھٹکارا پانے کی خواہش رکھتا ہے۔ کسل کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ اس سے اللہ، رسول اللہ ﷺ اور پورے دین سے ایک گہری اور شدید لاعلمی بلکہ بیزاری پیدا ہو جاتی ہے۔

تاہم یہ ملحوظ رہے کہ جین کی طرح کسل کا مرض بھی اکثر اوقات کسی جسمانی یا نفسیاتی وجہ سے نمودار ہوتا ہے۔ کسل کا مذکورہ بالا نقصان صرف انہی لوگوں کو پہنچتا ہے جو دینی اور جسمانی طور پر عمل کی مطلوبہ قوت رکھنے کے باوجود دینی احکام کی بجا آوری میں کسماستے ہوں۔ ایسے اشخاص جو زندگی کے تمام معاملات میں کابلی کارویہ رکھتے ہوں اس انتہائی نقصان سے تو محفوظ رہتے ہیں لیکن انہیں بھی بعض محرومیوں کا سامنا بہر حال کرنا پڑتا ہے۔ لہذا عافیت کی راہ یہی ہے کہ کسل اگر طبعی بھی ہو تو اسے ایک دینی نقص سمجھ کر اس کا علاج کرنے کی فکر کی جائے۔ باقی رہی کسل کی وہ قسم جو صرف دینی اعمال سے مخصوص ہو اور شعور اور ارادے کے ساتھ ہو تو ظاہر ہے کہ یہ ایک طرح سے دین کا صریح انکار ہے اور اس میں مبتلا آدمی اس وقت تک صحت یاب نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنا مسلمان ہونا دل سے قبول نہ کر لے۔ بہر حال اللہ کا خاص فضل ہے کہ کسل کی یہ قسم مسلمانوں کے اندر تقریباً ناپید ہے، یہ صرف منافقوں کے حصے میں آئی لیکن محدود ہونے کے باوجود چونکہ نفاق آج بھی ایک زندہ حقیقت ہے لہذا اصحابہؓ کی طرح ہمیں بھی اس خطرے سے غافل نہیں رہنا چاہیے اور ان

خراپیوں کی ابتدائی علامات کو بھی سنجیدگی سے لینا چاہیے جو اپنی انتہائی صورت میں منافقوں کا خاصہ ہیں۔

خلاصہ یہ کہ کسل کی دو قسمیں ہیں طبعی اور ارادی۔ طبعی کسل ایک عذر ہے جو آدمی کو خود اس کے فائدے کے کام بھی نہیں کرنے دیتی لیکن ارادی کسل خالص نفاق ہے اور اس کی موجودگی میں آدمی کا مسلمان ہونا کوئی حقیقی معنی نہیں رکھتا۔ طبعی کسل چونکہ شرعاً ایک حد تک قابل گرفت نہ ہونے کے باوجود اکثر ضروری احکام کی تعمیل میں رکاوٹ بنتا ہے لہذا اس کا علاج بھی ایک دینی ضرورت ہے اور اس کی طرف سے غافل رہنا ایک دینی نقص ہے۔

س: سوال یہ ہے کہ اگر کسل منافقوں کی عادت ہے اور اس سے مخلص مسلمانوں کو خطرہ نہیں ہو سکتا، تو پھر اسے زیر بحث لانے کا کیا فائدہ ہے؟

ج: نفاق کا وقوع ایک اور چیز ہے اور نفاق کا امکان دوسری چیز۔ ہم نے جو صحابہ کرامؓ کی مثال دی تھی تو اس سے یہی بتانا مقصود تھا کہ جس کا ایمان جتنا کامل ہوگا اس کا خوف نفاق بھی اسی مناسبت سے زیادہ ہوگا۔ مطلب یہ کہ جس کے لیے ایمان، مرنے جینے سے بھی بڑا مسئلہ ہو وہ ایمان کے زوال کے خوف سے کبھی آزاد نہیں ہو سکتا۔ صحابہ کرامؓ کے خوف نفاق کا یہ مطلب نہیں تھا کہ انہیں، معاذ اللہ، خود پر منافق ہونے کا شبہ تھا بلکہ وہ اپنے ایمان میں اتنے کامل، مخلص اور سنجیدہ تھے کہ محض نفاق یا زوال ایمان کا بعید ترین امکان بھی انہیں فکر مند کرنے کے لیے کافی تھا۔ صحابہؓ کی مثال پیش کرنے کا مقصد غالباً اب واضح ہو گیا ہوگا کہ ہمیں کسی بھی حال میں بے فکر نہیں ہونا چاہیے اور چھوٹی سے چھوٹی دینی خرابی کو بھی اس کے انتہائی نتائج کی روشنی میں دیکھ کر اس کے علاج کی پوری کوشش کرنی چاہیے۔ کسل منافقوں کی نفسیات کا

چونکہ ایک ناگزیر حصہ ہے لہذا اس کی ادنیٰ سے ادنیٰ صورت کو بھی دور کرنے کی ایسی ہی جدوجہد کرنی چاہیے جیسی کوئی سچا مسلمان نفاق سے بچنے کے لیے کر سکتا ہے۔ امید ہے اب ہماری بات واضح ہوگئی ہوگی۔

س: یہاں بار بار نفاق کا ذکر آ رہا ہے تو ازراہ کرم یہ بھی واضح کر دیں کہ یہ لفظ یہاں کس معنی میں استعمال ہوا ہے؟

ج: اس کو آپ کسی سخت قانونی معنوں میں نہ لیں بلکہ یہاں اس کا ایک عمومی مفہوم مراد ہے جو مسلمانوں کی نفسیات میں راسخ ہو چکا ہے یعنی ارادے اور شعور کے بڑے حصے میں دین کا نور موجود نہ ہو تو ایسے آدمی کو مسلمان ہونے کے باوجود، ہماری روایت میں، نفاق کے خطرے میں مبتلا ایک شخص سمجھا جائے گا۔ جب ہم شعوری و ارادی کسل کی بات کرتے ہیں تو اس کا واضح مفہوم یہی ہوتا ہے جو اوپر بیان ہوا۔ یہاں نفاق کو اس کے قانونی معنی میں لینے کی بھی پوری گنجائش موجود ہے لیکن ہم اپنی گفتگو میں وہ فضا پیدا نہیں ہونے دینا چاہتے جس سے امید غائب ہو جائے اور مایوسی غالب آجائے۔ اس لیے ہم نفاق کو اس کے عمومی مفہوم میں رکھنا پسند کریں گے تاکہ بعض واضح مشابہتوں کے باوجود آدمی میں یہ احساس بہر حال زندہ حالت میں موجود رہے کہ ٹوٹا پھوٹا ہی سہی مگر ابھی دین کے ساتھ میرا وہ تعلق باقی ہے جو خراب سے خراب صورت حال میں بھی مجھے مکمل تباہی سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔

س: گویا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ نفاق کی کسی علامت میں مبتلا ہونے کے باوجود آدمی خود کو مسلمان سمجھتا رہے تو اس کے لیے کوئی نہ کوئی راستہ بہر حال کھلا رہے گا؟

ج: جی ہاں! ہمارے اس خیال کی تصدیق نبی کریم ﷺ کی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس آدمی میں چار بری عادتیں ہوں وہ پورے

کا پورا منافق ہے اور جس آدمی میں ان چار میں سے کوئی ایک بری عادت پائی جائے تو وہ اس حد تک منافق ہے جب تک کہ وہ اس عادت کو چھوڑ نہ دے۔ وہ چار عادتیں یہ ہیں: ۱۔ امانت میں خیانت کرنا۔ ۲۔ جھوٹ بولنا۔ ۳۔ وعدہ خلافی کرنا۔ ۴۔ اختلاف و تنازعہ میں شرافت کی حدود پھلانگ جانا۔ (۱)

اس حدیث سے ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ ایک مسلمان میں بھی بعض اجزائے نفاق جمع ہو سکتے ہیں۔ اس حالت کو نفاق تو یقیناً کہا جائے گا خواہ وہ عمل میں ہو یا عقیدے میں، لیکن اس کے حامل کو مسلمان ہی کی حیثیت سے مخاطب کیا جائے گا اور اس کے مسلمان ہونے کی کسی بھی سطح پر نفی نہیں کی جائے گی۔

س: کسل ایک بڑی بیماری ہے اس کے بارے میں جتنی وضاحت درکار تھی وہ تو بحمد اللہ ہو گئی اب اس کے علاج کی تدابیر بھی بتادی جائیں تو بہتر ہوگا؟

ج: کسل کے معالجے میں مندرجہ ذیل تدابیر، ان شاء اللہ، مفید ثابت ہوں گی:

۱۔ تہجد، خواہ عشاء کے بعد ہی کیوں نہ ہو، یہ کسل کو دور کرنے کا قرآنی نسخہ ہے۔
(المرمل ۷: ۶)

۲۔ ایسی مشغولیت اختیار کرنا جس میں ثواب ہو اور جسمانی مشقت بھی ہو مثلاً لوگوں کے کام کرنا، ورزش کرنا، مسجد میں جانے کا اہتمام رکھنا..... وغیرہ۔

۳۔ زبان کو ذکر میں مشغول رکھنے کی کوشش کرنا۔ جس کی زبان ذکر سے تر رہتی ہو وہ کسل مندی کا شکار نہیں ہو سکتا۔

۴۔ طرز زندگی میں سادگی بلکہ مشقت اختیار کرنا

۵۔ سخت تھکن میں کم از کم دو رکعت نفل پڑھ لینا

۶۔ زیادہ وقت بڑوں کی صحبت میں رہنا، خواہ وہ دینی اعتبار سے بڑے ہوں یا دنیوی اعتبار سے۔

۱۔ صحیح بخاری، کتاب الشهادات، من امر بانحاز الوعد

بخل

حکم ربانی

— ﴿وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخُلُونَ بِمَا أَنَّهُمْ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ هُوَ خَيْرٌ أَلَّهُمْ
بَلْ هُوَ شَرٌّ لَهُمْ سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُوا بِهِ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَلِلَّهِ مِيرَاثُ
السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاللَّهُ بِمَا تَعْلَمُونَ خَبِيرٌ﴾ (ال عمران ۳: ۱۸۰)

جن لوگوں کو اللہ نے مال و دولت سے نوازا ہے مگر وہ اللہ کے لیے خرچ کرنے
میں بخل سے کام لیتے ہیں تو وہ یہ نہ سمجھیں کہ یہ ان کے حق میں اچھا ہے بلکہ یہ ان
کے حق میں بہت برا ہے۔ جس مال و دولت میں وہ بخل کر رہے ہیں اس کا قیامت
کے دن انہیں طوق پہنایا جائے گا اور یاد رکھو، آسمانوں اور زمین کی ہر چیز کا وارث
اللہ ہے اور وہ تمہارے اعمال سے خوب باخبر ہے۔

— ﴿وَأَمَّا مَنْ يُبْخِلْ وَأَسْتَعْنِي وَكَذَّبَ بِالْحَسَنِي فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْعُسْرَى
وَمَا يُغْنِي عَنْهُ مَالُهُ إِذَا تَرَدَّى﴾ (الیل ۹۲: ۸-۱۱)

جس نے بخل کیا، دین سے لاپرواہی برتی اور نیک بات کو جھوٹ جانا تو ہم
اسے دوزخ کی سختی میں پہنچا دیں گے اور اس کا مال اس کے کسی کام نہ آئے گا
جب وہ دوزخ کے گڑھے میں گرے گا۔

فرمان نبوی

”الْبَخِيلُ بَعِيدٌ مِنَ اللَّهِ، بَعِيدٌ مِنَ النَّاسِ، بَعِيدٌ مِنَ الْجَنَّةِ، قَرِيبٌ مِنَ
النَّارِ وَلِجَاهِلٍ سَخِيٌّ أَحَبُّ إِلَى اللَّهِ مِنْ عَابِدٍ بِخِيلٍ۔“ (۱)

بخیل اور کنجوس آدمی اللہ سے دور، یعنی قرب خداوندی کی نعمت سے محروم ہے،

(۱) سنن الترمذی، کتاب البر، باب ما جاء في السخاء

اللہ کے بندوں سے بھی دور ہے (کیونکہ اس کی کنجوسی کی وجہ سے وہ اس سے الگ اور بے تعلق رہتے ہیں) اور جنت سے دور اور دوزخ سے قریب ہے اور بلاشبہ ایک بے علم خلی اللہ تعالیٰ کو عبادت گزار کنجوس سے زیادہ پیارا ہوتا ہے۔

— ”لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ خَبٌّ وَلَا بَخِيلٌ وَلَا مَنَّانٌ۔“ (۱)

دھوکہ باز، بخیل اور احسان جتانے والا جنت میں نہ جائے گا۔

س: بخل کسے کہتے ہیں؟

ج: جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ حرص و بخل اپنی معنویت میں تقریباً ایک ہیں اس لیے بخل کی تعریف بھی حرص کے حوالے سے کی جاسکتی ہے۔ جو چیز آپ کے ہاتھ میں نہیں ہے اس کی طلب میں کھپتے رہنا حرص ہے اور جو چیز ہاتھ میں ہے اسے ہر حال میں ہاتھ میں دبوچے رہنا بخل ہے۔ گویا حرص میں غیر موجود کی محبت غالب ہوتی ہے اور بخل میں موجود کی، چیز ایک ہی ہے جو بخل میں موجود ہے اور حرص وغیرہ میں غیر موجود۔

بخل کی سادہ سی تعریف یہ ہے: دولت یا دیگر دنیاوی چیزوں سے ایسی محبت کہ آدمی انہیں ایسے مواقع پر بھی صرف کرنے پر تیار نہ ہو جن کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے تاکید ہو اور جن کا اجر یقینی ہو یعنی بخیل وہ آدمی ہے جو مال وغیرہ کی محبت میں اس شدت سے گرفتار ہو کہ اللہ بھی اس سے کچھ طلب کرے تو وہ نہ دے۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ کے الفاظ میں جس چیز کا خرچ کرنا شرعاً یا مروتاً ضروری ہو اس میں تنگ دلی کرنا بخل ہے۔ (۲)

س: بخل کے نقصانات کیا ہیں؟

(۱) سنن الترمذی، کتاب البر والصلة، باب ما جاء في البخل

(۲) مولانا اشرف علی تھانوی، شریعت و طریقت (مرتب مولانا محمد دین) ص ۱۸۳، ادارہ اسلامیات، لاہور

ج: ۱۔ اللہ تعالیٰ، رسول اکرم ﷺ اور دین سے جو محبت فرض عین ہے وہ بخیل کو نصیب نہیں ہوتی۔

۲۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ بخل ہادم دین و ملت ہے (۱) اس کا ایک مطلب یہ سمجھ میں آتا ہے کہ بخل میں یہ اعلان پوشیدہ ہے کہ دنیا اور مال دنیا، نعوذ باللہ، اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے زیادہ محبوب اور اہم ہے۔ یہاں تک پہنچنے کے بعد ظاہر ہے کہ اسلام کے کوئی معنی نہیں رہتے۔

۳۔ دنیا اور آخرت میں تحقیر اور رسوائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ (”آل عمران: ۱۸۰“)

۴۔ بخل کا تعلق نفس کی اس سطح سے ہے جو سب سے زیادہ پست ہے۔ بخیل شخص اس پست ترین سطح پر ساری زندگی گزار دیتا ہے۔

۵۔ بخل اسلام کی نشر و اشاعت اور عالمگیر غلبے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے بخل کے انہی نقصانات کی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے اسے نقیض ایمان قرار دیا ہے (۲) اور آپ ہمیشہ اس سے اللہ کی پناہ مانگا کرتے تھے۔ (۳)

س: بخل کا علاج کیا ہے؟

ج: اس کا علاج وہی ہے جو حب دنیا اور حرص کے ضمن میں بیان ہو چکا ہے۔

۱۔ صحیح مسلم، کتاب البر و الصلۃ، باب تحریم الظلم

۲۔ سنن نسائی، کتاب الجہاد، باب فضل من عمل فی سبیل اللہ علی قدمہ

۳۔ سنن نسائی، کتاب الاستعاذہ، باب الاستعاذہ من فتنۃ الدنیا

حرص و طمع

حکم ربانی

— ﴿وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يَنْفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ

فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ﴾ (التوبة: ۳۴)

جو لوگ سونا اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور انہیں اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، آپ انہیں دردناک عذاب کی خوشخبری دے دیں۔

— ﴿وَمَنْ يُوقِ شَحْ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ (التغابن: ۱۶:۶۴)

اور جنہوں نے اپنے آپ کو لالچ سے محفوظ رکھا تو ایسے لوگ ہی فلاح پانے والے ہیں۔

فرمان نبوی

— ”قد افلح من اسلم ورزق كفافا و قنع الله بما آتاه“ (۱)

کامیاب اور بامراد ہوا وہ بندہ جس کو حقیقت اسلام نصیب ہوئی اور اس کو روزی بھی بقدر کفاف ملی اور اللہ تعالیٰ نے اس کو اس قدر قلیل روزی پر قانع بھی بنا دیا۔

— ”إِيَّاكُمْ وَالشَّحَّ فَإِنَّمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ بِالشَّحِّ، أَمَرَهُمْ

بِالْبُخْلِ فَبَخَلُوا وَ أَمَرَهُمْ بِالْقَطِيعَةِ فَقَطَعُوا وَ أَمَرَهُمْ بِالْفُجُورِ فَفَجَرُوا“

حرص و طمع سے بچو، کیونکہ تم سے پہلی قومیں اسی حرص سے تباہ ہوئیں۔ اسی نے ان کو بخل کرنے کو کہا تو انہوں نے بخل اختیار کیا، اسی نے ان کو قطع رحمی (یعنی حقوق قربت کی پامالی) کے لیے کہا تو انہوں نے قطع رحمی اختیار کی، اسی نے ان کو بدکاری کے لئے کہا تو انہوں نے بدکاریاں کیں۔

(۱) سنن ابن ماجہ، کتاب الزہد، باب القناعہ

(۲) سنن ابی داؤد، کتاب الزکاۃ، باب فی الشَّحِّ

س: حرص کیا ہے؟

ج: حرص نفس کی وہ بیماری ہے جس میں وہ اپنی ضرورت اور استحقاق سے زیادہ کا طالب ہوتا ہے اور یہ طلب کسی بھی حد تک پہنچ کر ختم نہیں ہوتی گویا حرص نفس کی اس نہ ختم ہونے والی طلب کا نام ہے جس کا مطلوب عموماً دنیاوی ہوتا ہے۔

اس تعریف سے معلوم ہوتا ہے کہ حرص دراصل صبر، شکر، قناعت، توکل وغیرہ کی براہ راست ضد ہے۔ ظاہر ہے ایسی صفات سے متصادم ہونے والی چیز بہت گہرا روحانی اور اخلاقی ضرر رکھتی ہے۔

س: اس ضرر کی کچھ تفصیل بتادی جائے؟

ج: ۱۔ حرص عموماً دنیا اور مال کی محبت سے پیدا ہوتی ہے اور اس محبت میں بے انتہا اضافے کا سبب بنتی ہے۔ گویا حرص کا پہلا ضرر تو یہ ہوا کہ یہ پہلے سے موجود ایک برائی میں شدت اور وسعت پیدا کرتی ہے۔

۲۔ اس سے تعلق باللہ اپنی بنیاد میں کمزور پڑ جاتا ہے۔ اوپر ہم نے ان روحانی و اخلاقی فضائل کی طرف اشارہ کیا ہے جن کی یہ براہ راست ضد ہے۔ غور کیجیے تو یہ تمام فضائل یعنی صبر، شکر، قناعت، توکل وغیرہ بندے اور رب کے تعلق میں بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان سے خالی ہو کر آدمی بندگی کے احساس اور ربوبیت کے ادراک سے بڑی حد تک محروم ہو جاتا ہے۔

۳۔ یہ دین کے بنیادی تقاضے یعنی اللہ کے لیے پسندیدگی و ناپسندیدگی سے منہ موڑنے کا نام ہے۔ عام طور پر حرص کا موضوع وہ چیزیں ہیں جو دین میں یا تو مطلوب ہی نہیں ہیں یا اگر مطلوب ہیں بھی تو بعض قطعی حدود و شرائط کے ساتھ مثلاً روٹی کپڑا مطلوب ہے لیکن ان کی طلب شریعت کی بتائی ہوئی حدود کے اندر ہونی

چاہیے۔ حرص میں آدمی اپنی ضرورت کو حد جواز میں نہیں رکھتا بلکہ اس سے تجاوز کر جاتا ہے۔

۴۔ اس کا بہت بڑا نقصان یہ بھی ہے کہ حریص شخص زندگی کے اس سانچے ہی کو توڑ دیتا ہے جو قرآن و سنت نے بنایا ہے۔ یہ انتہائی خطرناک بات ہے کیونکہ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ آدمی کا ذوق دین سے ادنیٰ درجے میں بھی ہم آہنگ نہیں رہا۔

۵۔ حرص سے ذہن اور طبیعت میں ایسی کجی پیدا ہو جاتی ہے جو آدمی کو اللہ کے احکام میں تحریف پر مجبور کرتی ہے بلکہ ان کے انکار تک پہنچا دیتی ہے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ تمام دینی احکام کی بنیاد گویا اس حکم پر ہے کہ اللہ کے آگے تمہارا نفس اور آخرت کے سامنے دنیا کوئی چیز نہیں۔ حرص اس بنیادی ترین حکم میں یا تو تحریف کرواتی ہے یا اس کا منکر بنا دیتی ہے۔

۶۔ بندہ تقدیر پر راضی نہیں رہتا جو ہمارے ایمان کا حصہ ہے۔

۷۔ حریص آدمی دین کا ایک نہایت بنیادی مطالبہ پورا کرنے کے قابل نہیں رہتا اور وہ ہے اللہ کے راستے میں ہر طرح کے ایثار کے لیے ہمہ وقت تیار رہنا۔

س: ان نقصانات کے بیان سے ذہن میں بخل کا تصور بھی آتا ہے۔ آیا بخل اور حرص میں کوئی ایسی مشابہت ہے کہ کہیں کہیں ان سے پہنچنے والا نقصان بھی ایک ہو جاتا ہے؟

ج: یہ بالکل درست ہے۔ حرص کے سلسلے میں ہم نے جو آخری نقصان بتایا ہے وہ بخل سے بھی متعلق ہے۔ حرص اور بخل ظاہر میں مختلف لیکن حقیقت میں تقریباً ایک ہیں اور یوں سمجھیں کہ دنیا کی محبت ان کی ماں ہے۔

س: حرص کے علاج کی تدابیر کیا ہیں؟

ج: حرص سے بچنے کے لیے وہی تدابیر کارگر ہیں جو دہ دنیا کے علاج میں بتائی جا چکی ہیں۔ اصولی طور پر حرص کا تدارک متواتر انفاق سے کرنا چاہیے۔ یہی بخل کا علاج بھی ہے۔ اور اس کے ساتھ موت کا تصور بھی ایسی تاثیر رکھتا ہے جس سے حرص کا زور ٹوٹ جاتا ہے۔ نیز نفلی روزوں کی مدد بھی لی جاسکتی ہے کیونکہ روزہ نفس میں اور جسم میں اضمحلال پیدا کرتا ہے۔ حرص کے ازالے کے لیے یہ اضمحلال مفید ہے۔

مختصر اُیہ کہ اگر آدمی اس فیصلے پر عمل کرنے کی قدرت پیدا کر لے کہ میری دنیا اللہ کے بندوں کے لیے ہے اور خود میں اور میرا وقت اللہ کے لیے تو اس طرح گویا اس کے ہاتھ میں کلباڑا آجائے گا جو حرص کی جڑ پر بھی چلایا جاسکتا ہے۔ بہتر ہے کہ اس اصول کو نفس پر ہمہ وقت وارد رکھا جائے کیونکہ یہ نفس کی مجموعی امارگی کے علاج کا اسلوب ہے۔

دین نے ہماری دنیاوی زندگی کے لیے چند مقاصد متعین کر رکھے ہیں۔ ان مقاصد کا شعور حرص کے علاج میں مدد دے سکتا ہے تاہم یہ شعور قانون کی بجائے اسلامی زندگی کے بڑے نمونوں سے اخذ کرنا زیادہ موثر ہوگا۔ مطلب یہ کہ اس طرح کی خرابیوں میں محض یہ بتا دینا کافی نہیں کہ اللہ کو توکل مطلوب ہے، صبر مطلوب ہے وغیرہ بلکہ توکل اور صبر وغیرہ کی مثالیں رسول اکرم ﷺ اور صحابہ کرامؓ کی زندگی سے واقعاتی انداز میں لانی چاہئیں۔ اس میں کشش زیادہ ہے جو تاثیر میں اضافے کا سبب بنتی ہے۔

س: حرص کو آپ نے منفی معنوں میں استعمال کیا ہے جبکہ یہ لفظ مثبت معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے؟

ج: یہ سوال نظری تو ہے عملی نہیں کیونکہ حرص ہمارے روزمرہ میں منفی معنوں ہی میں آتا ہے سو ہم نے اسی کی پیروی کی ہے۔

قساوتِ قلبی

حکم ربانی

﴿قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ ۝ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ﴾
(المؤمنون: ۲۳: ۲۴)

— وہ ایمان والے یقیناً فلاح پائیں گے جو اپنی نماز خشوع کے ساتھ پڑھتے ہیں۔

﴿وَ اخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ﴾ (الشعراء: ۲۶: ۲۱۵)
اور ان لوگوں پر شفقت کا ہاتھ رکھیں، جنہوں نے ایمان لا کر آپ کی پیروی اختیار کر لی ہے۔

فرمان نبوی

— ”عن أنس رضي الله عنه ، قال : خَطَبَنَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ ، خُطْبَةً مَا سَمِعْتُ مِثْلَهَا قَطُّ ، فَقَالَ : لَوْ تَعْلَمُونَ مَا أَعْلَمُ لَضَحِكْتُمْ قَلِيلًا وَلَبَكَيْتُمْ كَثِيرًا ، فَقَعَّى أَصْحَابُ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ وَجُوهَهُمْ ، وَلَهُمْ خَنِينٌ۔“ (۱)
حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں (ایک مرتبہ) ایسا خطبہ ارشاد فرمایا کہ اس جیسا خطبہ میں نے کبھی نہیں سنا، آپ ﷺ نے فرمایا، اگر تم وہ باتیں جان لو جن کا مجھے علم ہے تو تم ہنسو تھوڑا اور روؤ زیادہ۔ پس رسول اللہ ﷺ کے صحابہؓ نے اپنے چہرے ڈھانپ لئے اور ان کی آہ وزاری کی آوازیں آرہی تھیں۔

— ”ابعد الناس من الله القلب القاسي“ (۲)

لوگوں میں اللہ سے سب سے زیادہ دورِ سخت دل (والا آدمی) ہے۔

(۱) صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب قول النبی ﷺ لَوْ تَعْلَمُونَ مَا أَعْلَمُ لَضَحِكْتُمْ قَلِيلًا وَلَبَكَيْتُمْ كَثِيرًا

(۲) سنن الترمذی، ابواب الثوب، باب ابعاد الناس من الله القلب القاسی

س: قساوت قلبی کیا ہے؟

ج: قلب میں دو چیزیں از روئے دین مطلوب ہیں:

۱۔ اللہ کے آگے تذلل اور رقت: جس کا کم از کم درجہ یہ ہے کہ بندہ عبادت کے موقع پر اپنی بندگی کو محسوس کرنے کے قابل ہو۔

۲۔ مخلوق کے لیے شفقت: جس کا کم سے کم درجہ یہ ہے کہ آدمی لوگوں کا، خواہ دینی سطح پر ہی سہی، خیر خواہ ہو اور طبیعت پر جبر کر کے بھی ان کے فائدے کے کوئی کام کر سکے۔

ان دونوں علامتوں میں سے کوئی بھی علامت کمزور یا غائب ہو تو دین داری پر زد پڑے گی۔ قساوت قلبی ان دونوں اوصاف کے فقدان سے عبارت ہے۔ طبیعت کی سختی وغیرہ ضروری نہیں کہ قساوت قلبی کی وجہ سے ہو۔ قساوت قلبی سختی نہیں بلکہ سفاکی ہے اور وہ بھی مدلل یعنی قاسی القلب شخص اپنی قساوت کے حق میں دلائل بھی رکھتا ہے۔

س: گویا آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ قساوت قلبی میں ایک طرف وہ تذلل اور رقت غائب ہو جاتی ہے جس کے بغیر بندگی بے معنی ہے اور دوسری طرف وہ بے رحمی اور سنگدلی سر اٹھا لیتی ہے جس کی موجودگی میں آدمی دوسروں کا دکھ درد بٹانا تو کجا اسے بڑھانے کا سبب بن جاتا ہے، کیا ہمارا یہ تاثر ٹھیک ہے؟

ج: بالکل صحیح۔ قساوت دل کے دونوں دروازوں کے بند ہو جانے کا نام ہے یعنی جو دروازہ اللہ کی طرف کھلتا ہے وہ بھی بند ہو جاتا ہے اور جو مخلوق کی طرف کھلتا ہے، وہ بھی۔ اس پر مستزاد یہ کہ قساوت میں مبتلا شخص اپنی اس حالت کو اچھی حالت سمجھتا ہے۔

س: ابھی آپ نے یہ فرمایا کہ طبیعت کی سختی قساوت قلبی نہیں ہوتی، یہ بات سمجھ میں نہیں

آئی؟ کیونکہ عام طور پر قساوت قلبی اور طبیعت کی سختی کو ہم معنی سمجھا جاتا ہے؟

ج: یہ اچھا سوال ہے۔ ہماری رائے میں طبیعت کی سختی دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک وہ جو قساوت قلبی کا نتیجہ ہے اور دوسرے وہ جو آدمی کی افتاد طبع، ماحول، تجربات وغیرہ کی دین ہے۔ اس دوسری قسم پر کوئی اخلاقی حکم وارد نہیں ہوتا۔ طبیعت کی نرمی یا سختی، دونوں کا اخلاقی مرتبہ اس بات سے متعین ہوگا کہ ان کا مرکز اور مصرف کیا ہے؟ یہ اپنی جگہ محض ان قوتوں کی طرح ہیں جن کا صحیح استعمال بھی ممکن ہے اور غلط بھی مثلاً طبیعت کی نرمی کا صحیح استعمال اللہ کی یاد اور مخلوق پر شفقت ہے لیکن اس سے بے میتی اور عدم صلابت بھی برآمد ہو سکتی ہے۔ دوسری طرف طبیعت کی سختی کا بھی یہی حال ہے کہ اسے اللہ کی راہ میں استعمال کر کے ایک مجاہدانہ کردار بھی پیدا کیا جاسکتا ہے اور دین سے منحرف ہونے کی طاقت بھی بنایا جاسکتا ہے۔ قساوت قلبی کا یہ معاملہ نہیں ہے کیونکہ اس کا کوئی بھی مثبت پہلو نہیں ہے۔

س: بعض لوگ دین کے نام پر ایک جارحانہ اور متشددانہ رویہ اختیار کرتے ہیں۔ یہ بتایا جائے کہ کیا اس رویے کے پیچھے بھی کسی درجے میں قلب کی قساوت کا رفرما ہوتی ہے؟

ج: یہ ایک بر محل لیکن مشکل سوال ہے۔ عین ممکن ہے کہ کوئی شخص اپنی دانست میں دین کی اسی تعبیر یا صورت کو حق سمجھتا ہو جو اس کے پاس ہے اور دوسروں کو جو اس کے ساتھ نہیں ہیں اپنا مخالف نہیں بلکہ دین کا مخالف جانتا ہو۔ اس صورت میں اس شخص کو کچھ اور تو کہا جاسکتا ہے لیکن شقی القلب نہیں کہا جاسکتا۔ تاہم ہمارے یہاں جو گروہی تعصب بہت شدت سے موجود ہے وہ بڑی حد تک قساوت قلبی کا مظہر ہے۔ جب ہم گروہی تعصب کہتے ہیں تو اس کا مطلب ہوتا ہے انسانی رائے کو اللہ

کے حکم کی جگہ دے کر اس رائے کے مخالفین کے بارے میں ایسے خیالات و جذبات رکھنا جیسے کافروں کے ساتھ رکھے جاتے ہیں اور پھر ان جذبات و خیالات کو عملی شکل دینے کی کوشش کرنا..... بد قسمتی سے اس معنی میں بھی گروہی تعصب امت میں شدت سے موجود ہے اور اس کو ہوا دینے کا ماحول بھی رفتہ رفتہ وسیع ہوتا جا رہا ہے۔

یہ اور اس طرح کی دوسری منفی چیزیں اسلام کے مقصودِ اصلی کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہیں۔ مسلمان جب اللہ کی توحید اور ختمِ نبوت کا اقرار کرتا ہے تو وہ بعض فرائض کا تہذیبی و اخلاقی سطح پر بھی پابند ہو جاتا ہے۔ محض اللہ کو ایک مان لینے اور رسول اکرم ﷺ کو آخری نبی تسلیم کر لینے سے عقیدہ توحید و رسالت کے تمام تقاضے پورے نہیں ہو جاتے۔

توحید پر حقیقی ایمان کا یہ بھی تقاضا ہے کہ مسلمان چند مستقل بنیادوں پر ایک ہو جائیں اور اس کے بعد کوئی دینی یا دنیاوی اختلاف اس وحدت کو متاثر نہ کر سکے۔ اسی طرح ختمِ نبوت کا بھی ہم سے یہ مطالبہ ہے کہ ہم رسول کریم ﷺ کی حتمی اور عالمگیر حجت کو اپنی آفاقی وحدت کی بنیاد بنائیں۔ اس سے نیچے اتر کر گروہی وحدتوں کی تشکیل، جو حق و باطل کا مدار بن جائے، محض غلط ہی نہیں بلکہ ایک لحاظ سے ختمِ نبوت کا انکار ہے۔

مسلمان کے لیے غلط تعبیرات میں بھی پہلی اور آخری سند قرآن و سنت ہی کو ہونا چاہیے۔ ہمارے لیے دین میں غلطی کا بس ایک ہی مطلب ہے اور وہ یہ کہ وہ قرآن و سنت کے محکمات کے خلاف ہو اور اسی طرح دینی صحت کا بھی یہی واحد ثبوت ہے کہ وہ قرآن و سنت کے محکمات کے مطابق ہو۔ اس دائرے سے باہر براتفاق و اختلاف یا بر صحیح و غلط قیاس ہے اور قیاس کی بنیاد پر حاصل ہونے والے نتائج کو معیار حق و باطل بنا دینا اتنی بڑی غلطی ہے کہ اس کے مضمرات کا پوری طرح اندازہ ہی نہیں لگایا جاسکتا۔

بہر حال قساوت قلبی کی ایک نحوست تو اوپر بیان ہو گئی کہ یہ دینی مقاصد سے

متصادم ہے۔ دوسرا ضرر یہ ہے، جو انفرادی سطح پر ہے، کہ اس تعصب میں مبتلا کوئی بھی شخص سنگ دلی سے محفوظ نہیں رہ سکتا، چاہے وہ اپنی تعبیر دین میں ٹھیک ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے مظاہر ہم ماضی میں بھی دیکھتے رہے ہیں اور آج بھی دیکھ رہے ہیں کہ گروہی نفسیات میں در آنے والا تشدد اپنے مخالفین کو کافر مطلق سے کم کا درجہ دینے پر تیار نہیں ہوتا۔ غور کریں تو یہ بات واضح طور پر محسوس ہو جائے گی کہ مسلمان کی ناحق تکفیر محض دماغ کی خرابی ہی نہیں بلکہ قساوت قلبی کا بھی نتیجہ ہے کیونکہ تکفیر سے بڑھ کر کوئی چیز مسلمان کو ایذا نہیں پہنچا سکتی۔ یہ بات تکفیر کرنے والا بھی جانتا ہے اور اس کے باوجود یہ حرکت کرتا ہے تو لامحالہ یہ بدترین قسم کی ایذا رسانی ہوئی جس کا ارتکاب کوئی شقی القلب ہی کر سکتا ہے۔

س: قساوت قلبی کا علاج کیا ہے؟

ج: یہ اتنی بڑی خرابی ہے کہ اس کے علاج کے لیے سچ پوچھیں تو کچھ متنازع طریقے بھی استعمال کر لیے جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں مثلاً صوفیوں کے بعض حلقوں میں مروج سماع اس کے علاج میں موثر ہے۔ گو کہ ہم سماع کو جائز نہیں سمجھتے لیکن مرض کی شدت کو دیکھتے ہوئے اس کو بطور علاج تجویز کرنے پر مجبور ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس خرابی کا علاج ہی سماع سے شروع کیا جائے بلکہ ہم صرف یہ ظاہر کرنا چاہ رہے ہیں کہ اس سطح کے مہلک امراض سے نمٹنے کے لیے کچھ خلاف احتیاط تدابیر بھی، بشرطیکہ وہ صریحاً حرام نہ ہوں، اختیار کی جاسکتی ہیں۔

مندرجہ ذیل چیزوں پر عمل کر کے بھی اس خرابی پر قابو پایا جاسکتا ہے:

۱۔ اچھی آواز اور اچھے لحن کے ساتھ قرأت سننا یا نعتیں اور ایسا کلام سننا جو شرعی

اعتبار سے مخدوش نہ ہو۔

۲۔ تنہائی سے بچنا اور بے تکلف دوستوں کی صحبت اختیار کرنا۔

- ۳۔ وقتی طور پر مشقت والی نفلی عبادات ترک کر دینا۔
 - ۴۔ صوفیا کے طریقے پر بلند آواز سے ذکر کرنا۔
 - ۵۔ اپنے وقت کا کچھ حصہ چھوٹے بچوں (اطفال) کے ساتھ گزارنا۔
 - ۶۔ تکلف اور مبالغے کے ساتھ اپنے سے بڑوں کی خدمت کرنا۔
 - ۷۔ بشرط ضرورت کسی معالج کے مشورے سے مفرح دوائیں استعمال کرنا۔
- علاج کی یہ سب صورتیں ان شاء اللہ کسی نہ کسی درجے میں موثر ہیں لیکن ہماری ترجیح تلاوت سننا اور بے تکلف دوستوں کی صحبت اختیار کرنا ہے۔



شہواتِ نفس

شکم پروری

حکم ربّانی

— ﴿وَكُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ﴾

(الاعراف: ۳۱:۷۰)

کھاؤ اور پیو مگر حد سے نہ بڑھو کیونکہ اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

— ﴿وَلَا تَبْذُرْ تَبْذِيرًا ۚ إِنَّ الْمُبْذِرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيْطَانِ وَكَانَ

الشَّيْطَانُ لِرَبِّهِ كَفُورًا﴾ (الاسراء: ۱۷:۲۶، ۲۷)

اپنا مال بے جا خرچ نہ کرو، بے جا خرچ کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے۔

فرمانِ نبوی

— ”بحسب ابن آدم اكلات يقمن صلبه ـ فان كان لامحالة فثلث

لطعامه وثلث لشرابه وثلث لنفسه“ (۱)

آدمی کو سدرتق کے لئے چند لقمے بھی کافی ہیں اور اگر زیادہ ہی کھانے کو چاہے تو معدے کا ایک تہائی کھانے کے لیے، ایک تہائی پینے کے لیے اور ایک تہائی سانس لینے کے لیے رکھے۔

— ”ان من السرف ان تاكل كلما اشتهيت“ (۲)

یہ بھی اسراف ہے کہ آدمی کو جس وقت بھوک لگے اسی وقت کھانا کھالے۔

(۱) جامع الترمذی، ابواب الزہد، باب ما جاء فی کراهیة کثرة الأكل

(۲) سنن ابن ماجہ، کتاب الإطعمہ، باب من الاسراف ان تاكل كل ما اشتهيت

س: شکم پروری سے آپ کی کیا مراد ہے؟

ج: جسم کی جو ضرورتیں غذا سے پوری ہوتی ہیں ان ضرورتوں تک محدود رہے بغیر کھانے کی خواہش اور اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے عملی یا خیالی مشقت اٹھانا شکم پروری ہے۔ اس خرابی میں مبتلا آدمی پیٹ کی فرضی ضروریات کو دیگر حقیقی ضروریات پر ترجیح دینے لگتا ہے۔ یہ شکم پروری کا ٹھیکہ مفہوم ہے۔

شکم پروری کے کئی درجے ہیں:

- ۱۔ پیٹ بھر کر کھانا
- ۲۔ طرح طرح کے کھانوں کا شوق
- ۳۔ پیٹ بھر جانے کے باوجود کھانے کی رغبت کم نہ ہونا
- ۴۔ کھانے پر فضول خرچی
- ۵۔ کسی خاص قسم کے کھانے کے لیے خود کو تکلیف میں ڈالنا۔

انسانی جسم کی دو بنیادی ضرورتیں، قوت اور فرحت، غذا سے پوری ہوتی ہیں اور انہیں پورا ہونا چاہیے۔ اگر آدمی خود کو قوی اور ہلکا پھلکا رکھنے کے لیے کچھ غذائیں زیادہ یا کم مقدار میں مخصوص بھی کر لے تو اس میں کوئی حرج نہیں بلکہ اس مقصد کے لیے اگر کچھ اہتمام بھی کرنا پڑے تو کر لینا چاہیے۔ ٹھیکہ دینی نقطہ نظر سے جسم کی قوت ضروری اعمال کے لیے اور فرحت، شکرگزاری اور خوش اخلاقی کے لیے لازمی ہے۔ گویا سچا مسلمان غذا کو بھی اپنی بندگی کا معیار بڑھانے کے لیے استعمال کرتا ہے لیکن اگر کوئی شخص جسمانی ضرر، مالی نقصان، بدتہذیبی وغیرہ کو قبول کر کے محض اپنے پسندیدہ ذائقوں کی پیروی کرتا ہے تو یہ یقیناً شکم پروری ہے اور قطعاً ناجائز ہے۔ ایسا آدمی جسم کی ضرورتوں کو بھی فوت کر دیتا ہے، یعنی بسیار خوری کی وجہ سے طرح طرح کے امراض اور طبیعت کی کسل مندی میں مبتلا ہو جاتا ہے

اور دوسری طرف خود کو نفس کے قابو میں دینے کا سامان بھی کر لیتا ہے یعنی دنیاوی زندگی میں ایک سچے اور شکرگزار بندے کا کردار ادا کرنے کے قابل نہیں رہتا اور دین اس کی زندگی میں ترک لذات کا جو مطالبہ سامنے رکھتا ہے اس کی تکمیل کی طاقت اور خواہش سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔ اصولی بات یہ ہے کہ دین روحانیت کو جسمانیات پر غالب دیکھنا چاہتا ہے۔ کھانے پینے کی طرف غیر معتدل میلان رکھنے والا آدمی اس حکم کو نہ صرف یہ کہ پورا نہیں کرتا بلکہ اپنے ذوق اور عمل سے اس کے انکار تک پہنچ جاتا ہے۔ یہ شکم پروری کا وہ نقصان ہے جو انسان کے پورے دینی وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔

س: گو کہ اس عادت کے بنیادی نقصانات اوپر کی گفتگو میں آگئے ہیں تاہم بہتر ہوگا اگر ان کی ایک فہرست بھی بنادی جائے؟

ج: ۱۔ کسل: (اس کی تفصیل اوپر آچکی ہے)

۲۔ عبادات سے جو روحانی اطمینان اور کشادگی حاصل ہوتی ہے اس عادت میں پڑ کر آدمی اس سے محروم ہو جاتا ہے۔

۳۔ حرص

۴۔ بے حمیتی اور بے شرمی: دعوت وغیرہ کے موقع پر کھانوں کی طرف بے تابی سے لپکنا غیرت اور وقار کے خلاف ہے اور شکم پرور آدمی اس سے بچ نہیں سکتا۔

۵۔ دنیا سے محبت اور اس میں غیر معتدل شخصیت: اس کا دینی ضرر اگر بتانا ہو تو یہ کہنا کافی ہوگا کہ یہ چیز پورے دین کی روح سے متصادم ہے۔

۶۔ خود غرضی

۷۔ زندگی کے اعلیٰ مقاصد سے عدم مناسبت اور بے رغبتی۔

۸۔ مختلف جسمانی عوارض

س: اس کا علاج کیا ہے؟

ج: اس کا مستقل علاج جو رسول اکرم ﷺ کے قول و عمل سے ثابت ہے یہ ہے کہ آدمی پیٹ بھر کر کھانا نہ کھائے (۱) اور معدے کا ایک تہائی حصہ خالی رکھنے کی عادت ڈالے (۲) اس کے علاوہ کوئی علاج موثر نہیں ہو سکتا۔ اس علاج پر کاربند ہونے کے لیے چند تدابیر، البتہ اختیار کی جاسکتی ہیں مثلاً:

- ۱۔ کچھ مدت تک ایسی غذاؤں پر اکتفا کرنا جو طبعاً مرغوب نہ ہوں۔
- ۲۔ محنت والے کام کرنا خصوصاً کسی ایک عبادت میں اپنے آپ کو تھکانا۔
- ۳۔ تنہا کھانے سے گریز کرنا
- ۴۔ ایک وقت میں ایک ہی سالن تک محدود رہنا
- ۵۔ برنوالے پر دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کرنا
- ۶۔ کھانے سے پہلے ایک آدھ گلاس پانی پی لینا
- ۷۔ اپنی پسندیدہ چیزوں میں سے کچھ خیرات کرنا
- ۸۔ لوگوں کو کھانا کھلانا
- ۹۔ دن میں ایک وقت کھانے کی عادت ڈالنا اور اس میں بھی پیٹ بھر کر نہ کھانا۔

۱۔ جامع الترمذی، کتاب الاطعمہ، باب ماجاء ان المؤمن يأکل فی معی واحد

۲۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الاطعمہ، باب الاقتصاد فی الأکل وکراهة الشبع۔

جنس پرستی

حکم ربانی

— ﴿وَلَا تَقْرُبُوا الزِّنٰى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَسَاءَ سَبِيْلًا﴾ (الاسراء: ۳۲)

اور زنا کے قریب نہ جاؤ، وہ بے حیائی ہے اور برا راستہ ہے۔

— ﴿وَأَنذِرْهُمْ يَوْمَ الْأَزْفَةِ إِذِ الْقُلُوبُ لَدَى الْحَنَاجِرِ كَاطْمِئِنَّ مَا

لِلظَّالِمِينَ مِنْ حَمِيمٍ وَلَا شَفِيعٌ يُطَاعُ ۝ يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي

الصُّدُورُ﴾ (المومن: ۳۰، ۱۸، ۱۹)

اور آپؐ ان لوگوں کو قریب آنے والی مصیبت کے دن سے خبردار کر دیں جب

کلیجے منہ کو آ رہے ہوں گے لوگ غم سے بھرے ہوئے ہوں گے، اس دن ظالموں کا

نہ کوئی دوست ہوگا اور نہ کوئی سفارشی جس کی بات مانی جائے، (اور قیامت کے دن

وہ ان کا حساب لے گا۔) یقیناً اللہ نگاہوں کی چوری کو جانتا ہے اور سینوں کے چھپے

رازوں کو بھی۔

فرمان نبوی

— ”لَا يَنْظُرُ الرَّجُلُ إِلَى عَوْرَةِ الرَّجُلِ وَلَا مَرْأَةٌ إِلَى عَوْرَةِ الْمَرْأَةِ وَلَا

يَفْضِي الرَّجُلُ إِلَى الرَّجُلِ فِي ثَوْبٍ وَاحِدٍ، وَلَا تَفْضِي الْمَرْأَةُ إِلَى

الْمَرْأَةِ فِي الثَّوْبِ الْوَاحِدِ“ (۱)

مرد کو چاہیے کہ وہ کسی مرد کی شرمگاہ پر نظر نہ ڈالے اور نہ عورت کو چاہیے کہ کسی

عورت کی شرمگاہ کو دیکھے۔ اسی طرح نہ دو مردوں کو ایک کپڑے میں اکٹھے ایٹنا

چاہیے اور نہ عورتوں کو۔

— ”الْعَيْنَانِ زَنَاهُمَا النَّظَرُ، وَالْأَذْنَانِ زَنَاهُمَا الْإِسْتِمَاعُ، وَاللِّسَانُ زَنَاہُ

(۱) صحیح مسلم، کتاب الحیض، باب تحریم النظر الی العورات

الكلام، واليد زناها البطش، والرجل زناها الخطا، والقلب يهوى
ويتمنى.....“ (۱)

آنکھوں کا زنا (حرام) دیکھنا ہے، کانوں کا زنا (حرام) سنا ہے، زبان کا زنا
(حرام) بولنا ہے، ہاتھوں کا زنا (حرام) حرکت کرنا ہے، ناگوں کا زنا (حرام) کی خاطر
چلنا ہے اور دل کا زنا (حرام) کی تمنا اور خواہش کرنا ہے۔

س: جنس پرستی سے آپ کی کیا مراد ہے؟

ج: جنسی قوت کا غیر معتدل استعمال اور جنسی خیالات کا غلبہ جنس پرستی ہے۔

س: اس کے کچھ مظاہر بتا دیے جائیں تو سمجھنے میں سہولت رہے گی؟

ج: ۱۔ زنا۔ ۲۔ لواطت۔ ۳۔ استمناء بالید۔ ۴۔ کثرت جماع

۵۔ جنسی لذات کے تصور میں کھوئے رہنا۔

س: اس کے نقصانات کیا ہیں؟

ج: اس کے نقصانات کو تین اقسام میں بانٹا جاسکتا ہے: دینی نقصانات، نفسیاتی
نقصانات اور طبی نقصانات۔

۱۔ دینی نقصانات

اس کے بھی دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ آخرت میں پکڑ تو واضح ہے اس کے علاوہ
آدمی کا دینی وجود بڑی حد تک جنسی داعیے پر قابو رکھنے سے تقویت پاتا ہے۔ اگر آدمی اس
داعیے سے مغلوب ہو جائے تو اس کی شخصیت میں دینی رنگ ادنیٰ درجے میں بھی پیدا نہیں ہو
سکتا۔ جنس کا غلبہ اس بنیادی لطافت، قوت، اخلاص اور مجاہدے کے خلاف ہے جس کے
بغیر آدمی کا دین ایک بے روح جسد بن کر رہ جاتا ہے۔ یہ خرابی روح کو ناپاک کر دیتی ہے
جس کے بعد دینی اعمال و تصورات کے کوئی حقیقی معنی نہیں رہتے۔

(۱) منہ احمد بن حنبل، ۱: ۴۱۳

۲۔ نفسیاتی نقصانات

صحت مند نفسیات کا اصول یہ ہے کہ وہ فطرت سے ہم آہنگ ہو۔ فطرت کا مطلب ہے وہ اصل تخلیق جو خیر، حق اور جمال پر مبنی ہے اور دین ہمیں اسی پر قائم رکھنے یا کرنے کے لیے آیا ہے۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھیں کہ جنسی غلبے کا منبع بہیمیت ہے جو انسانیت کی سب سے واضح ضد ہے۔ گو کہ بہیمیت انسانی وجود کے قانون کو قبول کر کے اس کے ایک معاون جزو کے طور پر بنیادی قوت حیات اور بعض مطلوب نفسی طاقتوں کا سرچشمہ ہے لیکن اگر یہ بہیمیت، جو انسانی نفس کی جبلی سطح پر کارفرما ہوتی ہے، اپنی حد سے تجاوز کر کے انسانی وجود کے ذہنی اور روحانی مراتب کے تابع نہ رہے اور زندگی کے ان مقاصد کو قبول نہ کرے جن کی طرف پیش قدمی کرتے رہنا انسان ہونے کی واحد شرط ہے، تو یہ انسان کے باطنی سانچے کو ناقابل اصلاح حد تک متاثر کر سکتی ہے۔ اس کا غلبہ نفس کی انسانی ساخت کو مسخ کر دیتا ہے اور اسے ایک ایسے انتشار میں پھینک دیتا ہے جہاں وابستگی کا کوئی روحانی محرک اور سبب باقی نہیں رہتا۔ اس بات کو آسان کر کے یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ انسانی نفس باعتبار ماہیت اصول وابستگی اور اس کے شعور پر قائم ہے۔ اس اصول میں کوئی رخنہ یا خلفشار پیدا ہو جائے تو نفس گویا انسانی تشخص سے محروم ہو جاتا ہے۔ یہ محض ایک نفسیاتی خرابی ہی نہیں بلکہ تمام متصورہ خرابیوں کی جڑ ہے۔ اس ہمہ گیر خلل کے یوں تو بہت سے مظاہر ہیں تاہم یہاں ہم ان میں سے چند ایک کی نشان دہی مناسب سمجھتے ہیں:

- ۱۔ ذہن کا صورت تک محدود رہ جانا اور معنی تک رسائی کے قابل نہ رہنا۔ آدمی کی تین چوتھائی نفسیات صرف اس خرابی کی وجہ سے غارت ہو جاتی ہے۔
- ۲۔ حس جمال کا مسخ ہو جانا۔ جسمانیت پر اصرار اس کا سب سے بڑا سبب ہے اور جنس زدگی جسمانیت پر اصرار ہی کا نام ہے۔
- ۳۔ وہ کیفیات جو انسانی کردار کے بالاتر معاملات سے وابستہ ہیں، جنس زدہ آدمی ان

کے تجربے سے محروم رہ جاتا ہے۔

۴۔ جنسی لحاظ سے مغلوب شخص دکھ سکھ کی روحانی معنویت سے عاری ہو جاتا ہے۔

۵۔ اس کا تخیل حق، خیر اور جمال سے مناسبت قائم رکھنے یا پیدا کرنے کے لائق نہیں رہتا۔

۶۔ نفس نے بعض رشتوں کے حوالے سے خود پر کچھ پابندیاں فطری طور پر عائد کر رکھی ہوتی ہیں، جنس زدگی ان پابندیوں کو توڑ دیتی ہے اور یہ بدنصیب آدمی، اور تو اور، اپنی ماں بہنوں تک کے تصور میں اس کی آمیزش کر لیتا ہے۔ یہ ارادی ہو تو بے حمیت ہے اور غیر ارادی ہو تو عذاب۔

۳۔ طبی نقصانات

مختلف جسمانی عوارض مثلاً جنسی بیماریاں، جسمانی و اعصابی کمزوری، سوء ہضم، اندھا پن..... اور دیگر معروف امراض جن کی تفصیل کسی بھی طبی کتاب میں دیکھی جاسکتی ہے۔

س: اس کا علاج کیا ہے؟

ج: غلبہ شہوت کے عموماً تین اسباب ہوا کرتے ہیں: نفس اور ذہن کا بگاڑ، ضعف باہ اور جنسی قوت کی غیر متوازن کار فرمائی۔

نفس یا ذہن کے بگاڑ کی صورت میں علاج یہ ہے کہ دو طرح کی مصروفیات پیدا کی جائیں: ایک خالص علمی اور دوسرے تفریحی۔ علمی مشغولیت سے ذہن میں جھوٹی لذتیں حاصل کرنے یا انہیں ایجاد کرنے کے داعیہ کمزور پڑ جائے گا اور زندگی میں دلچسپی کے قابل گہرائیاں اور بلندیاں نظر آنے لگیں گی۔ تفریحی سرگرمیوں سے نفس کسی جھوٹی فرحت میں مبتلا ہونے سے بچ جاتا ہے اور ایک مفید، مثبت اور اپنی ماہیت میں قدرے مختلف نشاط کا دروازہ اس پر کھل جاتا ہے۔ گویا ذہن کو علم کی

طرف مائل کر کے وہ وقار اور خشکی حاصل ہوتی ہے جو غلبہ شہوت کے ازالے کا کام دے سکتی ہے جبکہ تفریحات سے اس کا متبادل دریافت ہو جاتا ہے۔

۲۔ ضعفِ باہ کی صورت میں کسی نفسیات دان معالج سے رجوع کیا جائے۔ اتنا یاد رہے کہ غلبہ شہوت اکثر جنسی کمزوری ہی سے لاحق ہوتا ہے۔ اس خرابی میں مبتلا شخص اپنی جنسی صلاحیت کو بار بار چیک یا ٹیسٹ کرنا چاہتا ہے۔ یہی رجحان شہوت کو مختلف صورتوں میں غالب ہونے کا موقع فراہم کرتا ہے۔

۳۔ جنسی قوت کا غیر متوازن ہونا: بعض لوگوں میں قوائے احساس اور قوائے ذہنی کی نشوونما نارمل طریقے سے نہیں ہو پاتی۔ ان میں اگر کوئی چیز پروان چڑھتی ہے تو وہ جبلت کی سطح کی ہوتی ہے۔ ذہن اور دوسرے احساسات کی پسماندگی اور محض جبلت کی نشوونما سے جنس کی قوت اور تصور ایک غیر متوازن صورت میں ڈھل جاتا ہے۔ ایسا آدمی ذہن و حواس کے ہر عمل میں اور زندگی کے تمام مظاہر میں جنسی معنی یا کیفیت ڈھونڈنے کا عادی بن جاتا ہے۔ جنس پر ایسا ارتکاز جنس کی صلاحیت میں ایک غیر انسانی پن اور حیوانیت پیدا کر دیتا ہے جسے یہ آدمی اپنے لیے باعثِ فخر بنا کر اسے استعمال کرنے کی ہر ممکن صورت نکالتا رہتا ہے۔ ایسا مریض اپنے آپ کو کسی بھی پہلو سے قابلِ علاج نہیں سمجھتا بلکہ اس کے برعکس وہ خود کو مردانگی کے سبیل کے طور پر دیکھتا ہے اور دوسروں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اس کے معالجے میں کسی ماہرِ نفسیات کی مدد لینا ناگزیر ہے۔

اس سلسلے میں آخری بات یہ ہے کہ یہ خرابی اگر اپنی بنیاد میں ٹھیک ہو سکتی ہے تو صرف دینی زندگی اختیار کرنے سے ہو سکتی ہے۔ دینی زندگی یعنی اپنی بندگی کو عاجزی کے ساتھ یاد رکھنا اور دین کے مطلوبہ نفسیاتی فضائل (یعنی اکتسار، روحانیت اور بلند مقاصد) کو حاصل کرنے کی امنگ آدمی کو جبلت اور جسمانیات کا اسیر ہونے سے مکمل طور پر محفوظ رکھتی ہے

بلکہ غلبہ شہوت ہو یا نفس کے بگاڑ کی کوئی اور صورت، اس کے علاج کی حتمی صورت یہی ہے جو ہم نے عرض کر دی۔ پہلے دینی زندگی گزارنے کا عزم کیا جائے پھر بعض دینی اعمال کو اس کے علاج کے لیے استعمال کیا جائے تو اس خرابی کا مکمل ازالہ ہو سکتا ہے۔ وہ اعمال جو غلبہ شہوت کو معتدل کرتے ہیں یہ ہیں:

- ۱۔ روزہ، جیسا کہ صحیح حدیث سے ثابت ہے۔ (۱)
- ۲۔ ترجمے کے ساتھ قرآن کی تلاوت
- ۳۔ کثرتِ استغفار
- ۴۔ ”سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم“ کی اہتمام کے ساتھ تکرار۔
اہتمام سے مراد یہ ہے کہ دل اور زبان کو ہم آہنگ کر لیا جائے۔
- ۵۔ احوالِ آخرت کا کوئی پُر اثر بیان منتخب کر کے اس کا بار بار مطالعہ کیا جائے۔
- ۶۔ نیک لوگوں کی صحبت
- ۷۔ نامحرم عورتوں اور کم عمر لڑکوں سے نہ صرف یہ کہ نظر کی احتیاط کی جائے بلکہ ان سے رابطے کے ہر دروازے کو بند رکھا جائے۔
- ۸۔ ہر وقت با وضو رہنے کی عادت ڈالی جائے۔
- ۹۔ قرآن شریف کا کوئی چرمی نسخہ جیب میں رکھا جائے اور موقع ملنے پر ادھر ادھر سے اس کی تلاوت بھی کی جائے۔
- ۱۰۔ بالغ ہونے پر نکاح میں تاخیر نہ کرنا (جس کے لیے حضرت عمرؓ نے خصوصی احکام جاری کیے تھے)۔ (۲)

۱۔ صحیح مسلم، کتاب النکاح، باب انتخاب النکاح

۲۔ سنن ترمذی، کتاب النکاح، باب ما جاء فی مہور النساء

بعض معاشرتی خرابیاں

اس عنوان سے ان خرابیوں کی نشاندہی مقصود ہے جن پر عمومی اور کلی انداز سے کوئی شرعی حکم لگانا ممکن نہیں تاہم نفسیاتی اور معاشرتی سطح پر ان کے مضر ہونے میں کوئی کام نہیں۔ یہ ایسے نقائص ہیں جن کی موجودگی میں شخصیت کی تکمیل کا عمل مثبت انداز میں پورا نہیں ہوتا۔ ان کا ہونا اگر گناہ نہ ہو تو بھی بعض فضائل سے محرومی کا سبب بن سکتا ہے۔ یہاں ہم مندرجہ ذیل خرابیوں پر روشنی ڈالیں گے:

- ۱۔ سخت مزاجی
- ۲۔ بے مروتی
- ۳۔ بیوی بچوں کے ساتھ سختی
- ۴۔ بیٹے کو بیٹی پر ترجیح دینا
- ۵۔ رسوم و رواج کی بے جا پابندی
- ۶۔ کام چوری

سخت مزاجی

حکم ربانی

﴿وَلَوْ كُنْتَ فَظًا غَلِظَ الْقَلْبُ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ﴾

(آل عمران ۱۵۹)

اگر آپ تند خواور سخت دل ہوتے تو یہ لوگ آپ کے پاس سے چھٹ جاتے۔
 ﴿وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا
 الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ ۝ وَمَا يُلْقُهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا
 وَمَا يُلْقُوهَا إِلَّا دُوحًا عَظِيمٌ﴾ (فصلت ۲۱: ۳۴، ۳۵)

اور دیکھو بھلائی اور برائی برابر نہیں ہو سکتی۔ تم برائی کا جواب بھی بھلائی سے دو،
 پھر تم دیکھو گے کہ تم میں اور جس شخص میں دشمنی تھی وہ گویا تمہارا جگر می دوست بن گیا
 ہے۔ اور یہ صفت انہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو صبر کرنے والے اور خوش نصیب
 ہوتے ہیں۔

فرمان نبوی

— ”اِنَّ شَرَّ النَّاسِ مَنْزِلَةُ عِنْدَ اللَّهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مَنْ وَدَّعَهُ اَوْ تَرَكَهُ النَّاسُ

لَا تَقَاءَ فَحْشَهُ“ (۱)

اللہ کے نزدیک درجے کے لحاظ سے بدترین آدمی قیامت کے دن وہ ہوگا جس
 کی زبان اور سخت کلامی کے ذریعے لوگ اس کو چھوڑ دیں (یعنی اس سے ملنے اور
 بات کرنے سے گریز کریں)

— ”اِنَّ اللَّهَ رَفِيقٌ يَحِبُّ الرَّفْقَ فِي الْأُمْرِ كُلِّهِ“ (۲)

اللہ تعالیٰ خود بھی نرم ہیں اور ہر معاملے میں نرمی ہی کو پسند کرتے ہیں۔

(۱) صحیح مسلم، کتاب السنن، باب مداراة من يتقى فحشه

(۲) صحیح بخاری، کتاب الدعوات، باب الدعاء للمشركين

بعض لوگ مزاجاً روکھے اور سخت ہوتے ہیں ان کا طبعی میلان مردم بیزاری کی حد تک پہنچا ہوا ہوتا ہے۔ ان میں سے وہ لوگ جو دوسروں کی دلآزاری اور تحقیر وغیرہ نہ کرتے ہوں، معذور ہیں۔ ایسی سخت مزاجی، جس کا سبب قساوت قلبی اور تکبر نہ ہو، عموماً چار اسباب سے پیدا ہوتی ہے:

۱۔ تربیت کا ابتدائی ماحول

۲۔ لوگوں سے دھوکہ کھانے کا کوئی تجربہ

۳۔ طبیعت میں جھجک اور خود اعتمادی کی کمی

۴۔ دینی شخصیت کے بارے میں بعض بنیادی تصورات کی غلطی

۱۔ تربیت کا ابتدائی ماحول: بچپن میں گھر اور سکول وغیرہ کا ماحول سخت گیری پر مبنی ہو تو سخت مزاجی رفتہ رفتہ طبیعت میں راسخ ہو جاتی ہے اور آدمی خود کو نہ صرف یہ کہ اس ماحول کا حصہ بنا لیتا ہے بلکہ اس کا نمونہ بھی بن جاتا ہے۔

۲۔ لوگوں سے دھوکہ کھانے کا کوئی تجربہ: بعض افراد کی زندگی کا رنگ کچھ ایسا ہوتا ہے کہ انہیں دوسروں کے منفی پہلوؤں ہی کا تجربہ ہوتا ہے۔ انہوں نے وقتاً فوقتاً کئی لوگوں پر اعتماد کر کے دھوکہ کھایا ہوتا ہے۔ ایک مرحلے پر پہنچ کر بے اعتمادی کا ایسا غلبہ ہو جاتا ہے کہ یہ لوگ یا تو ہر آدمی کو شک کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں یا پھر مردم بیزار ہو جاتے ہیں۔ سخت مزاجی اسی مردم بیزاری سے پیدا ہوتی ہے۔ ایسا شخص یہ نہیں چاہتا کہ کوئی اس سے قریب ہو کر دوبارہ اس کا اعتماد حاصل کر لے اس لیے وہ خود کو ایک غیر مقبول اور ناگوار شخصیت میں ڈھال لیتا ہے تاکہ اسے دوبارہ ان تکلیفوں سے نہ گزرنا پڑے جو وہ ماضی میں اٹھاتا آیا ہے۔

۳۔ طبیعت میں جھجک اور خود اعتمادی کی کمی: سخت مزاج لوگوں کی اکثریت اسی سبب پر کھڑی ہے۔ ایسے لوگوں میں دو چیزیں بہت عام ہیں ایک تو یہ کہ وہ اپنے آپ سے بالکل

غیر مطمئن بلکہ بیزار ہوتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ ناکام ہونے سے اور اس سے بڑھ کر ناکام کہلانے سے ڈرتے ہیں۔ یہ کسی بھی صورت میں دوسروں پر اپنا اظہار نہیں چاہتے اور اس بات سے بھی بچنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں کہ کوئی ان سے توقعات اور امیدیں وابستہ کر لے کیونکہ انہیں یقین ہوتا ہے کہ ان کی شخصیت بہت حقیر اور مضحکہ خیز ہے نیز ان کے اندر وہ صلاحیت بھی مفقود ہے جس کی بنیاد پر دوسروں کے مطالبات اور معاشرتی ذمہ داریاں پوری کی جاسکیں۔ سخت مزاجی ایسے آدمی کے لیے وہ خول ہے جو اسے خود کو چھپانے میں مدد دیتا ہے۔

دینی شخصیت کے بارے میں بعض بنیادی تصورات کی غلطی: یہ ایک عام مشاہدہ ہے کہ دین دار لوگ، خصوصاً جو دین کے ظاہری مراسم پر زور دیتے ہیں، سخت مزاج اور بدخلق ہوتے ہیں بلکہ ایسے لوگوں کی اکثریت شقی القلب اور متکبر ہوتی ہے۔ ان میں سے بعض افراد، جو عموماً اپنے طبقے کی صف اول میں نہیں ہوتے، چند غلط تصورات یا غلط فیصلوں کی وجہ سے ایک غیر متوازن شخصیت بن جاتے ہیں اور سخت مزاجی کو دین میں ترقی کا زینہ اور اپنی روحانی حفاظت کا ذریعہ سمجھ لیتے ہیں مثلاً زہد کا مطلب کج خلقی اور مردم بیزاری بن جاتا ہے اور دین پر استقامت کے ساتھ کار بند رہنے کا لازمی تقاضا ان لوگوں کی نظر میں پوری معاشرت سے منقطع ہوئے بغیر پورا نہیں ہو سکتا۔ اس طرح کے لوگ طبیعت اور ذہن کے سادہ ہوتے ہیں اور اس سادگی کی وجہ سے ہی اپنے اندر پیدا ہونے والی باتوں کو جانچنے کی کوشش نہیں کرتے اور سنے سنائے قصوں کی بنیاد پر اپنی دینی ترجیحات کو اٹل طریقے سے متعین کر کے بس ناک کی سیدھ میں چلتے جاتے ہیں۔ ان بیچاروں کو یقین ہوتا ہے کہ حقیقتاً دین دار وہ ہوتا ہے جو:

۱۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کی کسی بھی خلاف ورزی کو ہاتھ سے منانے پر مستعد رہے۔

- ۲۔ اپنے دینی معمولات میں کسی کو داخل ہونے کی اجازت نہ دے۔
- ۳۔ لوگوں سے میل جول نہ رکھے اور ایسے تمام مواقع سے بچے جہاں ہنسی مذاق اور تفریح کا ماحول ہو، اولاد وغیرہ کو فتنہ (اردو زبان کے معنی میں) سمجھے اور ان کے لیے اپنے اندر کوئی لچک نہ پیدا ہونے دے۔
- ۴۔ شیخ، استاد یا کسی خاص مسلک کو اصل دین سمجھے اور ان سے وابستگی کا حق پوری طاقت سے ادا کرے۔ یعنی شیخ کا مقابلہ ہو جائے تو بلا استثناء وہ تمام مشائخ کو ناقص قرار دے۔ استاد کے تقابل میں تمام علماء کو جاہل بتائے اور اپنے مسلک کے مقابلے میں تمام سالک کو گمراہی یا کفر سمجھے۔
- ۵۔ ان مباحات کو بھی شدت اور حقارت کے ساتھ ترک کر دے جنہیں اسلاف تو ایک طرف خود رسول اکرم ﷺ نے خود وقتاً فوقتاً اختیار فرمایا ہو۔
- ۶۔ ہمیشہ دو ٹوک بات کرے خواہ کوئی برا مانے۔

تنبیہ

مسلمان کی شخصیت اور کردار میں ایک مضبوطی، استقامت اور صلابت ہوتی ہے جو مخالفانہ ماحول میں نسبتاً زوردار طریقے سے اظہار کرتی ہے۔ صورتاً یہ چیز سخت مزاجی سے مشابہ ہے لیکن اس کے ازالے کی خواہش یا کوشش کا نتیجہ دینی حمیت سے محرومی ہو سکتا ہے۔ گویا اپنی بندگی پر اصرار اور اس کی حفاظت کا فریضہ پوری قوت سے انجام دینا اصل اخلاق ہے چاہے بظاہر تلخ ہی کیوں نہ لگے۔ جس سخت مزاجی کو طبیعت کا نقص سمجھا جاتا ہے وہ دوسری چیز ہے۔ وہ عموماً اپنے نفس کے لیے ہوتی ہے تربیت کی کمی پر دلالت کرتی ہے جبکہ یہ صلابت دین کے لیے ہوتی ہے اور تربیت کے کمال کو ظاہر کرتی ہے۔ ان دونوں کے فرق کو آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے۔ سخت مزاج آدمی رقیق القلب نہیں ہوتا جبکہ دوسری قسم کا شخص مجاہدانہ کردار کے ساتھ ساتھ رقت قلبی سے بھی بہرہ مند ہوتا ہے۔

سخت مزاجی اور اسوہ حسنہ

ایک مسلمان کے لیے نبی کریم ﷺ سے بڑھ کر کس کا اسوہ قابل تقلید ہو سکتا ہے اور آپ ﷺ کی نرم مزاجی اور حلم کا یہ عالم تھا کہ خود اللہ تعالیٰ نے اس کی تعریف فرمائی اور کہا کہ اگر تم سخت مزاج اور تند خو ہوتے تو یہ لوگ تم سے چھٹ جاتے۔ (آل عمران ۱۵۹:۳) آپ ﷺ کی نرم مزاجی کا یہ عالم تھا کہ آپ ﷺ کے مرتبے کے ادراک کے باوجود کئی ازواج مطہرات آپ ﷺ کو رُو در رُو جواب دینے سے باز نہ آتیں (۱) اور آپ ﷺ کے خادمہ بڑے کا کہنا ہے کہ میں نے نو سال تک آپ ﷺ کی خدمت کی اور کئی بار مجھ سے کوتاہیاں بھی ہوئیں لیکن آپ ﷺ مجھ پر کبھی غصہ ہوئے اور نہ کبھی ڈانٹا۔ (۲)

علاج

اس کے علاج کی تفصیل قساوت قلبی کے تحت دیکھ لی جائے تاہم مندرجہ ذیل باتوں پر عمل کرنے سے طبیعت میں گداز پیدا ہونے کی امید ہے:

- ۱۔ رسول اللہ ﷺ کی سیرت کا مطالعہ
- ۲۔ نفل نمازوں میں طویل سجدہ کرنا
- ۳۔ فرحت بخش ماحول اور غذائیں اختیار کرنا
- ۴۔ بیماروں کی دیکھ بھال کرنے کا موقع ملے تو اس سے فائدہ اٹھانا
- ۵۔ دن کا کچھ وقت چھوٹے بچوں کے ساتھ گزارنا
- ۶۔ تنہائی میں تلاوت کرنا اور تکلف سے رونا۔



۱۔ صحیح مسلم، کتاب الطلاق، باب فی ایلاء و اعتزال النساء

۲۔ سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فی الحلم و اخلاق النبی ﷺ

بے مروتی

حکم ربانی

— ﴿أَذِلَّةً عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةً عَلَى الْكَافِرِينَ﴾ (المائدہ: ۵۴)

(حقیقی مومن وہ ہیں جو) مسلمانوں کے لئے نرم اور کافروں کے لئے سخت ہوں۔

— ﴿وَالْكَاطِمِينَ الْغَيْظِ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ﴾

(آل عمران: ۳: ۱۳۴)

(حقیقی مومن وہ ہیں جو) لوگوں کی غلطیوں سے درگزر کرتے ہیں۔ اور اللہ نبی

کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

فرمان نبوی

— ”من تواضع لآخيه المسلم رفعه الله“ (۱)

جو اپنے مسلمان بھائی کے لئے تواضع اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے بلند مرتبہ

عطا فرماتا ہے۔

— ”ان الله تعالى اوحى الى ان تواضعوا حتى لا يبغى احد على

احد ولا يفخر احد على احد“ (۲)

اللہ تعالیٰ نے مجھ پر وحی نازل کی ہے کہ تم تواضع اختیار کرو نیز کوئی کسی کے

ساتھ زیادتی کرے نہ فخر جتائے۔

تعریف: بے مروتی کا مطلب ہے کسی کے ناراض ہونے کی پرواہ نہ کرنا۔

انسانی معاشرت کا مزاج ہی ایسا ہے کہ لوگ آپس میں ایک دوسرے سے بعض

(۱) صحیح مسلم، کتاب الزہد، استنباب العفو والتواضع واللفظ للطنطاوی

(۲) صحیح مسلم، کتاب الحجۃ، باب عرض مقعد المیت من الحجۃ

ایسے مطالبات بھی رکھتے ہیں جنہیں پورا کرنا شرعاً ضروری ہوتا ہے نہ ممنوع۔ اس طرح کے مطالبات طاقت رکھنے کے باوجود پورے نہ کرنا بے مروتی ہے۔

مظاہر:

بے مروتی کا اظہار چونکہ متعین صورتوں میں نہیں ہوتا، اس لیے ہم نمونے کے طور پر اس کے چند مظاہر کا ذکر کرتے ہیں:

۱۔ مراتب کا پاس نہ کرنا: بعض مراتب معاشرتی سطح پر اہمیت کے حامل گردانے جاتے ہیں اور ان کی یہ اہمیت صرف معاشرت میں پائی جانے والی صورت کی حد تک ہی نہیں ہوتی بلکہ خود شریعت میں بھی یہ قابل قبول ہوتی ہے۔ اس معاملے میں معاشرتی اقدار کو نظر انداز کرنا بے مروتی ہے مثلاً استاد کا ایک مرتبہ ہے اور اس کی فضیلت خود شریعت سے بھی ثابت ہے تاہم استاد کے ادب کی تقریباً تمام صورتیں معاشرے کے مجموعی مزاج سے پیدا ہوتی ہیں۔ اگر وہ صورتیں شریعت کی مخالفت پر مبنی نہ ہوں تو ان کی پابندی کرنا ایک صحت مند نفسیات کے لیے ضروری ہے اور یہی مروت ہے۔

۲۔ سچ کو خواہ مخواہ درشت اور کڑوا بنا کر پیش کرنا: اچھے اچھے دین دار لوگوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ وہ سچائی کو بدتمیزی اور دل آزاری کی حد تک پہنچا دیتے ہیں۔ یہ بے مروتی کی وہ قسم ہے جو شرعاً بھی مذموم ہے۔

۳۔ اپنے خود ساختہ اصولوں کی ایسی پاسداری کرنا کہ کسی مستحق کی مدد یا کسی دوست کی مدارت میں خلل پڑ جائے۔ ایسے آدمی سے عموماً اس طرح کی باتیں سرزد ہوتی ہیں:

”میں تین بجے کے بعد کسی سے نہیں ملتا خواہ کچھ ہو جائے“

”چار بجے میری یہ مصروفیت ہوتی ہے جسے میں کسی بھی قیمت پر ترک نہیں کرتا“
وغیرہ۔ اس طرح کی ضابطہ پرستی بھی عین بے مروتی ہے۔

۴۔ کسی سے ذہنی یا طبعی مناسبت نہ ہو تو اس پر اپنی بیزاری ظاہر کر دینا اور یہ سمجھنا کہ اس طرح میں نے ایک تو معاملات کی صفائی کا حق ادا کر دیا اور دوسرے اپنے وقت کے ضیاع کا دروازہ بند کر دیا، یہ بے مروتی تو ہے ہی انسانیت میں کمی کی بھی دلیل ہے۔

۵۔ لوگ کوئی کام کہیں تو صاف انکار کر دینا۔

۶۔ دوستوں یا تعلق والوں سے اگر کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو اس پر غضبناک ہو جانا یا ترک تعلق کا فیصلہ کر لینا۔

۷۔ کسی کی دلجوئی میں دلچسپی نہ رکھنا۔

مختصر یہ کہ بے مروتی کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ انسانیت کا مادہ کم ہو جاتا ہے۔ یہ ایسا ضرر ہے جس کی موجودگی میں آدمی اچھا بندہ بننے کی صلاحیت سے محروم ہو سکتا ہے۔ تاہم یہ خیال رہے کہ بامروتی مد اہنت اور دکھاوا نہیں ہے۔ انسان کی زندگی میں ایسے مواقع آتے رہتے ہیں جن میں وہ سختی اور مضبوطی اختیار کرنے کا مکلف ہوتا ہے۔ ایسے مواقع پر معاشرتی معافی میں مروت کا مظاہرہ دراصل مروت نہیں۔ صاحب مروت آدمی کی بڑی پہچان یہ ہے کہ وہ بلا وجہ دل آزاری سے بچتا ہے اور اپنا ہرج کر کے دوسروں کے کام آتا ہے یعنی خوش خلق اور ایثار والا ہوتا ہے۔

بے مروتی کا واحد علاج خدمت خلق ہے۔ لوگوں کے کاموں میں مستعدی کے ساتھ شریک رہنے سے مروت کا وصف اپنے حقیقی معنوں میں پیدا ہو جاتا ہے۔

ایک مسلمان کو کس حد تک بامروت ہونا چاہیے؟ اس کا نمونہ ہمیں اسوۂ حسنہ سے

ملتا ہے جس کی ایک مثال یہ ہے کہ لوگ آپ (ﷺ) سے ملنے آتے یا دعوت پر آتے تو بعد میں دیر تک بیٹھے رہتے اس سے آپ کو تکلیف ہوتی لیکن آپ مروت کے مارے خاموش رہتے اور برداشت کرتے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کو مداخلت کرنا پڑی اور سورۃ احزاب میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس بارے میں تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا کہ پیغمبر تو مارے مروت کے خاموش رہتے ہیں تمہیں خود اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ نبی کی ایذا کا سبب نہ بنو۔ (الاحزاب: ۵۳:۳۳)



بیوی بچوں کے ساتھ سخت کلامی اور مار پیٹ حکم ربانی

— ﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ﴾ (البقرہ ۲/۲۲۸)

عورتوں کے لیے دستور کے مطابق اس طرح حقوق ہیں جس طرح ان پر ذمہ داریاں ہیں۔

— ﴿وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ﴾ (النساء ۴/۱۹)

اور دیکھو، اپنی بیویوں کے ساتھ اچھی طرح گزر بسر کرو۔

فرمان نبوی

— ”عن معاویہ بن حیدہ رضی اللہ عنہ قال: قلت یا رسول اللہ! ما

حق زوجة احدنا علیه؟ قال: ان تطعمها اذا طعمت وتكسوها اذا

اكتسبت ولا تضرب الوجه ولا تقبح ولا تهجر الا في البيت“ (۱)

حضرت معاویہ بن حیدہ کہتے ہیں میں نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا کہ ہم پر بیویوں کے کیا حقوق ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تم خود کھاؤ تو انہیں کھلاؤ، خود پہناتو انہیں بھی پہناؤ، ان سے بدزبانی نہ کرو اور نہ ناراض ہو کر بول چال بند کرو اور (اگر کبھی سختی کرنا ہی پڑے تو) منہ پر نہ مارو۔

— ”ما اکرمهن الا کریم وما اهانهن الا لئیم“ (۲)

جو بیویوں سے حسن سلوک کرتا ہے وہ کریم (نیک، مہربان) ہے اور جو ان سے بدسلوکی کرتا ہے وہ لئیم (کمینہ، سفلہ) ہے۔

بد قسمتی سے یہ خرابی ہماری دیہی معاشرت سے نکل کر شہری معاشرت میں بھی

(۱) سنن ابن ماجہ، کتاب النکاح، باب حق المرأة علی الزوج

(۲) عز الدین بیلق، منهاج الصالحین، من احادیث وسنة خاتم الانبیاء والمرسلین، بیروت ۱۹۷۸ء، ص ۳۴۱

سرائیت کر رہی ہے۔ اچھے اچھے دین دار اور تعلیم یافتہ لوگ گھر میں خوش اخلاقی اور تحمل و برداشت کا مظاہرہ نہیں کرتے اور ذرا ذرا سی خلاف مزاج بات پر بیوی بچوں کی اہانت کا ہر طریقہ استعمال کرنے پر اتر آتے ہیں۔ اس میں چیخنے چلانے سے لے کر گالی گلوچ اور مار پیٹ تک کے مختلف مراحل شامل ہیں۔

اسباب و وجوہات

اس کا ضرر دینی اعتبار سے بھی تباہ کن ہے اور نفسیاتی لحاظ سے بھی۔ تاہم اس کی تفصیل میں جانے سے پہلے مناسب ہوگا کہ ان بڑے بڑے اسباب کی نشان دہی کر دی جائے جن سے یہ مرض پیدا ہوتا ہے:

۱۔ طبیعت میں دینداری کی کمی

اس کا مطلب یہ ہے کہ بعض لوگ دین کے چند ظاہری تقاضوں کو پورا کر دیتے ہیں لیکن ان کے دل پر اور ان کے مزاج پر دین کا رنگ نہیں چڑھا ہوتا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو داڑھی اور لباس وغیرہ پر مبالغے کے ساتھ توجہ دیتے ہیں لیکن دین جس رقت قلبی اور انکسار کا لازمی مطالبہ کرتا ہے اس کی طرف ان کا بالکل دھیان نہیں ہوتا بلکہ دھیان نہ ہونے کی بجائے یہ لوگ اپنے دل کی سختی اور تکدر وغیرہ کو چھپانے کے لیے چند ظاہری اوضاع کی آڑ لے لیتے ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ جس آدمی کے اندر زیر دستوں پر شفقت اور چھوٹوں کی غلطیوں پر چشم پوشی کا رویہ نہیں پایا جاتا وہ حقیقت میں رسول اللہ ﷺ کے دین کو ماننے اور اس پر چلنے والا نہیں ہے۔ اسلام بندگی کو جس ہمہ گیر مزاج کی شکل دینا چاہتا ہے اس کی رو سے طبیعت میں اس طرح کا کوئی مادہ پیدا ہی نہیں ہو سکتا جو آدمی کو زندگی کے کسی دائرے میں ظالم اور متکبر بننے پر اکسائے اور اس کے اندر چھپی ہوئی بہیمیت کو

ابھرنے کے مواقع فراہم کرے۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ جو آدمی طبیعت کے اعتبار سے بھی اللہ کا بندہ اور رسول اللہ ﷺ کا امتی ہے وہ تربیت اور تادیب کی مصلحت سے سختی کی کوئی بھی صورت اختیار کر سکتا ہے لیکن لوگوں کو محض اپنے تابع رکھنے کے لیے ان کے ساتھ درشتی اور سخت گیری کا معاملہ نہیں کر سکتا۔

۲۔ بہیمیت کا غلبہ

انسان کے نفس میں بہیمیت ایک ایسی طاقت کے طور پر موجود ہے جس کا مثبت استعمال بھی ممکن ہے اور منفی بھی۔ غیرت، حمیت، شجاعت اور اللہ کے دشمنوں سے نفرت وغیرہ اس طاقت کے مثبت مظاہر ہیں جبکہ ظلم، تکبر، اپنی ذات کے لیے غضب ناکی، غصہ، انتقام، قبائلی عصبیت اور سرکشی وغیرہ اس کے منفی مظاہر ہیں۔ جو آدمی اپنی مرکزیت اور غلبے کے لیے، خواہ وہ گھر کی سطح پر ہی ہو، دوسروں کو گویا پاؤں تلے رکھنے کے لیے کوشاں رہتا ہے وہ دراصل نفس کی اسی منفی بہیمیت کے زیر اثر ہے۔ یہ چیز اسے انسانیت کے مراتب تک اٹھنے نہیں دیتی۔ بیوی بچوں پر کسی دینی اور اخلاقی محرک کے بغیر سختی کرنا واضح طور پر جانوروں کا ساءمل ہے جس کی کوئی اور توجیہ نہیں کی جاسکتی۔

۳۔ اعصابی تناؤ، احساس کمتری، خوف اور ناکامی وغیرہ

بعض مرتبہ کسی خرابی کے اسباب روحانی اور اخلاقی کی بجائے نفسیاتی ہوتے ہیں۔ خاص طور پر یہ خرابی اکثر کسی نفسیاتی بگاڑ سے جنم لیتی ہے۔ اس میں مبتلا لوگ عموماً مذکورہ بالا نفسیاتی اور ذہنی عوارض کا شکار ہوتے ہیں مثلاً اعصابی تناؤ کا مریض اپنے سے چھوٹوں پر پھٹ پڑنے کا عادی ہوتا ہے۔ احساس کمتری کا مارا ہوا شخص اپنی برائی کی کوئی ٹھوس اور ثابت کی جاسکنے والی صورت نکالنا چاہتا ہے

جواسے بیوی بچوں کو ڈانٹ پھٹکار یا مار پیٹ کر ہاتھ آجاتی ہے۔ اسی طرح جن لوگوں کو ناکامی کا ان دیکھا خوف لاحق ہوتا ہے وہ سخت گیر باپ اور جابر شوہر بن کر اس سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

۴۔ مرد مرکز معاشرت

ہماری معاشرت دین کے پوری طرح تابع نہ ہونے کی وجہ سے چند مستقل ناہمواریوں کا شکار ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ ہم مردوں کو زندگی کے تمام دائروں کا مرکز سمجھتے ہیں اور مرکزیت کو نافذ کرنے کے لیے طاقت اور غلبے کو ذریعہ بناتے ہیں۔ چونکہ یہ رویہ دین کے بنائے ہوئے نظام معاشرت سے ایک ظاہری مماثلت رکھتا ہے لہذا اس کو اختیار کرنے والے لوگ اس کے اندر کوئی شرعی یا اخلاقی قباحت بھی نہیں دیکھتے۔ حالانکہ صحیح صورتحال یہ ہے کہ دین کی رو سے مرد زندگی کی بنیادی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت رکھنے کی وجہ سے معاشرت کا بیشتر بوجھ اپنے کاندھوں پر اٹھاتا ہے اور یہ ذمہ داری وہ کسی حاکم کی طرح نہیں بلکہ اللہ سے ڈرنے والے بندے کی حیثیت سے اپنا فرض سمجھ کر ادا کرتا ہے۔ جبکہ ہماری معاشرت میں یہ تصور دور دور تک نہیں پایا جاتا۔ عورت کو پاؤں کی جوتی سمجھنا اور اولاد کو زرخیز غلام سے زیادہ کا درجہ نہ دینا ہماری معاشرت کا وہ ناسور ہے جو لاکھ کوششوں کے باوجود بھرنے میں نہیں آ رہا اور مزید افسوس کی بات یہ ہے کہ ہمارے اندر ایک بڑا طبقہ اس رویہ کو شریعت کا تقاضا سمجھ کر اختیار کئے ہوئے ہے۔ ہماری قبائلی زندگی کی تقریباً تمام معاشرت اسی رویے کی آئینہ دار ہے۔

اس سبب کے ضمن میں یہ بات بھی ملحوظ ذہنی چاہیے کہ ہماری معاشرت میں دین

سے دوری کی ساری ذمہ داری محض مردوں پر نہیں ہے بلکہ عورتیں بھی اس میں برابر کی ذمہ دار ہیں۔ چونکہ ہم مردوں کی ایک خرابی پر گفتگو کر رہے ہیں لہذا اس میں عورتوں کی خرابیاں زیر غور نہیں لائے۔ وہ ان شاء اللہ اپنے مقام پر آئیں گی اور وہاں ہم یہ بتائیں گے کہ ہماری سوسائٹی کے بعض طبقات اپنی طرح سے عورت کی حکمرانی کے اصول پر چلنے لگے ہیں اور یہ بھی کہ بیشتر معاشرتی خرابیوں میں خود عورت ایک بنیادی سبب ہے۔

ضرر

تکبر، شقاوت، خود پسندی، فحش کلامی، بے شرمی، خود غرضی اور دل آزاری وغیرہ اس کے دینی مضمرات میں سے ہیں اور ذہنی و نفسیاتی عدم توازن اس کے نفسیاتی مضمرات میں سے ہیں۔ باقی تمہیدی گفتگو سے اسکے ضرر کا مجموعی خاکہ بنایا جاسکتا ہے۔

تاہم ایک پہلو کی قدرے تفصیلی نشان دہی ضروری ہے اور وہ یہ کہ گھر میں مار پیٹ وغیرہ کا رویہ اختیار کرنے والا آدمی اللہ کے دو انعامات سے محروم ہو جاتا ہے۔ ایک گھریلو سکون اور دوسرے محبت کرنے والے بیوی بچے۔ ہر شخص اندازہ لگا سکتا ہے کہ ان دو چیزوں سے محرومی پوری دنیوی زندگی کو عذاب بنا سکتی ہے۔ اسی طرح ایسا شخص اللہ کے خوف، رسول اللہ ﷺ کی محبت اور عبادات میں حلاوت سے بھی محروم رہتا ہے۔ ان محرومیوں سے آخرت کی زندگی کا نقصان بھی ظاہر ہے۔ اگر آدمی صرف انہی دو نقصانات پر نظر کر لے تو اس آفت سے نکلنے پر قادر ہو سکتا ہے۔

علاج

- ۱۔ اگر اسباب نفسیاتی ہوں تو کسی ماہر ڈاکٹر سے رجوع کرنا چاہیے۔ یہ تدبیر الحمد للہ صد فی صد کامیاب رہتی ہے۔
- ۲۔ رسول اللہ ﷺ کی سیرت طیبہ کے ان پہلوؤں کا بطور خاص مطالعہ جو آپ کی

گھریلو زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔ اس مطالعے کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ پہلے اس حصے کو خود پڑھ لیا جائے اور جب ذہن اور طبیعت مانوس ہو جائیں تو پھر گھر والوں کا حلقہ بنا کر ان حصوں کو ایک دوسرے کو پڑھ کر سنایا جائے۔ ایسی صورت میں تبدیلی کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔

۳۔ ایسے شخص کی بیوی کو چاہیے کہ شوہر کے سامنے کم از کم بدزبانی نہ کرے اور اولاد پر لازم ہے کہ باپ کی فرمانبرداری میں مبالغے سے کام لے۔ اس طرح اس شخص کو مشغول ہونے کا موقع فراہم نہیں ہوگا اور اشتعال کا علاج بھی یہی ہے کہ سب سے پہلے اس کے فوری اسباب کا ازالہ ہونا چاہیے۔

۴۔ اس مرض سے نکلنے کا ایک بہت ہی موثر راستہ یہ ہے کہ مریض تنہائی میں اپنی زبان میں اللہ سے لمبی دعا کرنے کی عادت ڈالے جس میں دو چیزیں پیدا کرنے کی کوشش کرتا رہے: تضرع اور بے تکلفی۔ اس طرح کی دعا طبیعت میں گداز اور تواضع پیدا کرنے کے لیے نہایت موثر اور مجرب ہے۔ اس سے آدمی کی باطنی اور نفسیاتی تعمیر نو ہو جاتی ہے اور بندگی اس کی پوری شخصیت کا مرکزی اور بنیادی جوہر بن جاتی ہے۔

۵۔ آنحضرت ﷺ کے اس فرمان کو ہر وقت سامنے رکھنا کہ تم میں سے بہتر شخص وہ ہے جس کا رویہ اس کے اہل و عیال کے ساتھ بہتر ہو (۱) اور آپ ﷺ کے اسوۂ حسنہ کو سامنے رکھنا کہ آپ ہمیشہ اپنے اہل خانہ سے محبت اور نرمی کا رویہ رکھتے تھے اور شکایت کے موقع پر بھی درگزر سے کام لیتے تھے۔ (۲)

۱۔ جامع ترمذی، ابواب الایمان، باب فی استکمال الایمان

۲۔ سنن ابن ماجہ، کتاب النکاح، باب حسن معاشرۃ النساء

بیٹے کو بیٹی پر ترجیح دینا

حکم ربّانی

— ﴿..... وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ مِنْ إِمْلَاقٍ نَحْنُ نَنْزِلُكُمْ وَإِيَّاهُمْ﴾

(الانعام ۶: ۱۵۲)

اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو۔ کیونکہ ہم تمہیں بھی روزی دیتے ہیں اور انہیں بھی۔

— ﴿لَا تَذَرُونِ أَیُّهُمۡ أَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا.....﴾ (النساء: ۱۱)

(اللہ تعالیٰ نے وراثت میں عورتوں اور مردوں کے حصے بیان کرنے کے بعد ان پر عمل کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا) تم نہیں جانتے کہ ان میں سے کون تمہیں زیادہ نفع پہنچانے والا ہے۔

فرمان نبوی

— ”مامن مسلم تدرک عنده ابنتان فیحسن صحبتہما الا

ادخلناه الجنة“ (۱)

جس کی دو بیٹیاں ہوں اور وہ ان کی اچھی تربیت کرے تو وہ جنتی ہے۔

— ”..... اتقوا اللہ فی اولادکم.....“ (۲)

اپنی اولاد کے بارے میں اللہ سے ڈرو (اور سب سے مساوی سلوک کرو)

ہماری معاشرت میں جو چند جاہلانہ بلکہ حیوانی روایات رائج ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔ بیٹے کو بیٹیوں پر مطلقاً ترجیح دینا بنیادی انسانی وصف کے خلاف ہے۔ ایسے والدین مزاجاً عبد جاہلیت کے عربوں کی طرح ہیں اور اسی روایت پر گامزن ہیں جو وہاں نومولود بچیوں کو زندہ گاڑنے کا سبب بنی۔ اس بات میں شبہ کی ادنیٰ گنجائش بھی نہیں ہے کہ

(۱) من ابن ماجہ، ابواب الادب، باب بر الوالد والاحسان الى البنات

(۲) صحیح مسلم، کتاب الہبات، باب کراهة تفضیل بعض الاولاد فی الہبة

رسول اللہ ﷺ جن لوگوں سے شدید ترین نفرت رکھتے تھے ان میں سے ایک لوگ یہ بھی ہیں^(۱) ظاہر ہے کہ جس چیز سے رسول اللہ ﷺ کو نفرت ہو، اسے اپنی مستقل روش بتالین کسی کمزور سے کمزور مسلمان سے بھی ممکن نہیں ہے۔

اس اجتماعی رواج کا یہ اثر ہم دیکھ رہے ہیں کہ عورتوں کی انسانی اور فطری صلاحیتیں کچل کر رہ گئی ہیں بلکہ افسوسناک بات یہ ہے کہ ہمارے دین طبقہ اس برائی سے بڑی حد تک پاک ہے، جبکہ مذہب سے ظاہری اور نمائشی تعلق رکھنے والے طبقات میں یہ خرابی بڑے پیمانے پر موجود ہے۔ اس کا ایک نتیجہ یہ نکلا ہے کہ بے دین اور جدیدیت زدہ طبقوں سے نکلنے والی عورتیں اپنی صلاحیتوں کو استعمال کرنے کے قابل ہو جاتی ہیں اور اپنی ذہنی ساخت کے مطابق معاشرے پر اثر انداز ہونے کا کام بھی کرتی ہیں جبکہ دوسری طرف مذہبیت رکھنے والے گھرانوں کی خواتین اپنے اندر گھٹ کر رہ جاتی ہیں۔ ان کی کوئی صلاحیت پروان نہیں چڑھتی اور پھر وہ ان عورتوں کو رشک کی نظر سے دیکھنے لگتی ہیں جو معاشرے میں آزادانہ طریقے سے اپنا کردار ادا کرتی ہیں اور مردوں سے تعلق کو توڑنے کی علی الاعلان کوششیں کرتی ہیں چاہے اس کے لیے انہیں دنیا کی تمام حدود کو توڑنا ہی کیوں نہ پڑے۔ اس ساری صورتحال کی ذمہ داری انہی لوگوں پر عائد ہوتی ہے جنہوں نے لڑکیوں کو لڑکوں کے مقابلے میں کمتر سمجھا اور اسے ایک معاشرتی ضابطے اور نفسیاتی ساخت کی شکل دے دی۔

یہ ٹھیک ہے کہ ہمارے معاشرتی حالات نے ہمیں مجبور کر دیا ہے کہ ہم لڑکوں کی پیدائش پر لڑکیوں کی ولادت کے مقابلے میں زیادہ خوش ہوتے ہیں۔ شرعی لحاظ سے اس میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ یہ خوشی قلبی اور طبعی نہ ہو بلکہ محض دماغ سے پھوٹی ہو لیکن مشکل یہ

۱۔ سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فی فضل من عالی یتامی

ہے کہ ہم لوگوں کا یہ معاملہ نہیں ہے کہ لڑکی کی پرورش میں پیش آنے والی مشکلات ہمارے پیش نظر رہتی ہوں بلکہ ہم دل سے لڑکوں کو ترجیح دیتے ہیں۔

مضرات

ذیل میں اس کے چند بڑے نقصانات تحریر کیے جاتے ہیں جنہیں پڑھ کر اس فتنہ رسم کے بھیاںک نتائج کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس کی وجہ سے:

۱۔ عورتوں کی فطری صلاحیتیں مرجھا کر رہ جاتی ہیں خاص طور پر ان کی جنہیں کسی قدر مذہبی رنگ میں پروان چڑھایا جاتا ہے۔

۲۔ دین دار خواتین بھی نفسیاتی اعتبار سے اس نوبت کو پہنچ جاتی ہیں کہ انہیں دین سے متصادم طرز زندگی رکھنے والی عورتیں آئیڈیل معلوم ہونے لگتی ہیں۔

۳۔ عورتوں پر ظلم و تشدد کی طرح طرح کی صورتیں رائج ہیں۔

۴۔ عورتوں کو وراثت میں شریک نہیں کیا جاتا۔ یہ گویا شریعت سے اعلان جنگ ہے جس کا نتیجہ عذاب الیم ہوگا۔ (النساء: ۱۴)

۵۔ عورتیں نفسیاتی مریض بن کر رہ گئی ہیں جس کی وجہ سے وہ صرف دو ہی کردار ادا کرنے کے قابل ہیں: یا تو لونڈی اور کنیز بن کر رہیں یا جھگڑے اور غیبت وغیرہ کو اپنا مستقل چلن بنالیں۔

۶۔ عورتوں کی اکثریت شکر کے معنی بھی بھول گئی ہے۔

۷۔ اللہ سے ذاتی تعلق اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کا جذبہ مجموعی طور پر عورتوں میں نہ ہونے کے برابر رہ گیا ہے۔

۸۔ عورتوں میں مال کی محبت اور بے حیائی کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔

غرض عورت ہونا ایک خوفناک چیز بن کر رہ گیا ہے۔

علاج

اس کے علاج کے لیے یہ تصور کافی ہے کہ بیٹوں کو بیٹیوں پر فوقیت دینے کا ہر عمل اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا غضب اور نفرت مول لینے کے مترادف ہے۔ اس خیال کو سنجیدگی سے اپنے اندر راسخ کر لیا جائے تو اس لعنت سے نجات ممکن ہے اور اس کی برکت سے وہ ہمت اور قوت میسر آئے گی جو مسلمان کو برادی وغیرہ کے خلاف اٹھنے پر آمادہ کر سکتی ہے۔ نیز رسول اللہ ﷺ کی گھریلو زندگی کی تفصیلات کا بار بار مطالعہ اس خرابی کے علاج میں اکیسیر کی حیثیت رکھتا ہے۔



رسوم و رواج کی بے جا پابندی

حکم ربانی

— ﴿..... وَتَخْشَى النَّاسَ ، وَاللَّهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَاهُ.....﴾ (الحزاب ۳۳: ۳۷)

(حضرت زینبؓ سے شادی کے بارے میں رسول اکرم ﷺ مقامی رسم و رواج

کی مخالفت کی وجہ سے متردد تھے، اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:) آپ لوگوں سے
دُرتے ہیں؟ حالانکہ اللہ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ آپ اس سے دُریں!

— ﴿وَإِذَا الْمَوْؤُودَةُ سُئِلَتْ بِأَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ﴾ (التکویر ۸۱: ۸، ۹)

اور جب زندہ دفن کی گئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس گناہ میں ماری گئی؟

فرمان نبوی

— ”من تشبه بقوم فهو منهم“ (۱)

جو کسی دوسری قوم کی نقل کرے وہ گویا اسی میں سے ہے (غیر مسلم قوموں کے

رسم و رواج کو اپنانا مردود ہے)

— ”عن عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما قال: نہی رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم عن القزع“ (۲)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں، کہ نبی کریم ﷺ نے اس سے منع فرمایا

ہے کہ سر کے کچھ بال منڈوا دیے جائیں اور کچھ چھوڑ دیے جائیں۔ (بال کٹوانے

میں غیر اسلامی رواج نہ اپنایا جائے)

اسلام نے قومی، علاقائی اور خاندانی رسم و رواج کو اکثر صورتوں میں برقرار رکھا

(۱) سنن ابی داؤد، کتاب اللباس، باب فی لبس الشجرة

(۲) صحیح بخاری، کتاب اللباس، باب القزع

ہے لیکن جہاں یہ کسی واضح حکم یا محکم عقیدے یا دین کے ساتھ وابستگی کی کسی خارجی اور داخلی صورت سے متصادم ہوں تو ان کا انکار ایک دینی تقاضا ہے۔ رسم و رواج انسانی معاشرت میں خوبصورتی اور کشش پیدا کرتے ہیں اور آدمیوں کو ذہنی اور نفسیاتی گھٹن سے محفوظ رکھنے میں کارگر ہیں۔ اس کے علاوہ ان میں ایک تفریحی عنصر بھی ہے جو دینی نقطہ نظر سے بھی بعض ضروری شرائط کے ساتھ پسندیدہ ہے۔ نیز ان کی مدد سے لوگ بہتر بنیادوں پر ایک دوسرے سے جڑے رہتے ہیں جو کہ معاشرت کی سب سے بڑی غایت ہے۔ تاہم اگر شریعت زندگی کے دائرے کا مرکز نہ رہے تو یہی رسوم و رواج بڑھتے بڑھتے مذہب کی صورت اختیار کر لیتے ہیں یعنی آدمی ان کی پابندی کو اسی طرح لازم کر لیتا ہے جس طرح دینی فرائض کو ہونا چاہیے۔ گویا رسم و رواج کی بے جا پابندی صرف یہی نہیں ہے کہ رسم و رواج کے غیر شرعی ہونے کے باوجود انہیں نبھایا جائے بلکہ اس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ مباح رسموں کو بھی دینی جذبے اور مذہبی جوش کے ساتھ پوری پابندی سے ادا کیا جائے مثلاً ہمارے یہاں شادی کی بیشتر رسمیں یقیناً مباحات کی ذیل میں آتی ہیں لیکن ہم لوگ ان سے ایسا چٹ کر رہ گئے ہیں کہ ان میں سے کسی ایک رسم کی مجبوراً بھی خلاف ورزی نہیں کرتے مثلاً شادی پہ نیا جوڑا پہننا، بیٹی کو ضرورت بلکہ آسائش کی تمام دستیاب چیزیں دینا، لڑکی والوں کا لڑکے کے لیے جوڑے وغیرہ تیار کرنا۔ اسی طرح لڑکے والوں کی طرف سے بری وغیرہ کا اہتمام، ویسے میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کو مدعو کر کے اچھے سے اچھا کھانا کھانا، مہمانوں کا دولہا دلہن کو تحائف پیش کرنا یہ تمام امور مباحات میں سے ہیں یعنی شریعت ان سے روکتی نہیں ہے بشرطیکہ ان کی پابندی ضروری نہ سمجھ لی جائے اور استطاعت نہ ہو تو اس کے باوجود ان سے عہدہ برآ ہونے کا اہتمام نہ کیا جائے۔

ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم نے تقریباً رسموں کو دین سے ٹکراؤ کی حالت میں لاکھڑا

کیا ہے۔ یہ کہنا غالباً مبالغہ نہ ہوگا کہ عملاً ہم نے اکثر مباحات کو حرام یا کم از کم مکروہ ضرور بنا لیا ہے۔ ایسی صورت حال میں سچی دینداری کا یہی تقاضا ہے کہ کم از کم ان مروج رسوم سے چھٹکارا حاصل کر لیا جائے جن میں ظاہر داری اور دکھاوا غالب ہے۔ اس کے بعد ان رواجوں کا نمبر آتا ہے جن میں نمائش تو نہیں پائی جاتی لیکن وہ کسی نہ کسی دینی ضرر کا موجب بنتے ہیں۔

یہ تو ہوئی اصولی بات۔ باقی عملی پہلو سے اگر ہم صرف اتنی پابندی کر لیں کہ جن رسوم و رواج کو نبھانے میں ہمارا کوئی واضح دینی حرج ہوتا ہے یا ہم پر غیر ضروری بوجھ پڑتا ہے، انہیں بالکل چھوڑ دیں۔ اگر ہم نے یہی کام کر لیا تو قوی امید ہے کہ جو رسوم و رواج بچ جائیں گے وہ ہماری معاشرت اور ہماری نفسیات میں دین کی پسندیدہ کشادگی اور فرحت پیدا کریں گے۔

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم کم از کم ان رسوم و رواج میں سے کچھ کی ایک فہرست بنادیں جو شرعی لحاظ سے ناپسندیدہ ہیں:

— بسنت منانا

— شادی پر گانے بجانے کا اہتمام

— تہواروں اور تقریبات پر اسراف

— عیدین میں سنت سمجھ کر گلے ملنا

— مسجدوں میں لاؤڈ اسپیکر کا بے جا استعمال

— میلاد شریف وغیرہ کے اکثر اجتماعات

— شادی کی متعدد رسومات جن کی تفصیل مولانا اشرف علی تھانویؒ کی 'بہشتی زیور'

اور اصلاح الرسوم میں دیکھی جاسکتی ہے۔

— موت کی رسوم..... وغیرہ وغیرہ

نقصانات

رسوم و رواج کی ہر حال میں پابندی کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ آدمی بدعات میں مبتلا ہونے کی تمام درکار صلاحیتیں پیدا کر لیتا ہے اور بدعت کا معصیت ہونا مسلم ہے (۱) بدعات دراصل رسم و رواج ہی سے جنم لیتی ہیں اور انجام کار تو بین سنت بلکہ چھپی ہوئی بے دینی تک پہنچا دیتی ہے۔ دیگر نقصانات یہ ہیں:

— فرائض کی ادائی میں رکاوٹ مثلاً شادی وغیرہ میں اکثر لوگوں کی جماعت فوت ہو جاتی ہے۔

— لہو و لعب میں مشغولیت کا رجحان

— بے پردگی

— اسراف

— دکھاوا

— جاہلی عصیت یعنی برادری سے باہر رشتہ نہ کرنا وغیرہ۔

— غیر مسلموں سے مشابہت جو شرعاً مذموم ہے۔ (۲) مثلاً شادی وغیرہ کی کئی

رسمیں ہندوؤں کے مذہبی اطوار سے ماخوذ ہیں۔

— غریبوں اور ناداروں کی دل آزاری

— دنیا کی محبت

— اوقات (بالخصوص راتوں) کا ناجائز استعمال

— وقت کا ضیاع

۱۔ صحیح مسلم، کتاب الجمع، باب تخفیف الصلاة والخطبة

۲۔ سنن ابی داؤد، کتاب اللباس، باب فی لبس الشہرہ

— رسول اللہ ﷺ کے پسندیدہ طرز زندگی سے عدم مناسبت

— مخلوق کی اطاعت

جیسا کہ ہم اوپر عرض کر آئے ہیں کہ رسم و رواج کی بے جا پابندی کا علاج اللہ کے شدید خوف، رسول اللہ ﷺ سے پوری محبت اور دین سے مکمل وابستگی کے بغیر ممکن نہیں۔ ان چیزوں کو ارادے کی پوری قوت کے ساتھ اور لوگوں کی ملامت سے بے خوف ہو کر بروئے عمل لانا چاہیے۔ اس کے بغیر اس راستے پر پہلا قدم ہی نہیں اٹھایا جاسکتا۔ یہی اس کا علاج ہے۔



کام چوری

حکم ربانی

﴿وَقُلْ اَعْمَلُوا فَاَسِيرَی اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُولُهُ وَالْمُؤْمِنُونَ
وَسَتُرَدُّوْنَ اِلٰی عَالَمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ﴾

(التوبہ: ۱۰۵)

اور اے نبی! آپ ان سے کہیں ”تم اپنی جگہ مل کرتے رہو اور تمہارے مل کو اللہ، اس کا رسول اور ایمان والے دیکھیں گے، اور تم جلد اس خدا کے سامنے پیش کئے جاؤ گے جو ظاہر اور غیب کا علم رکھتا ہے پھر وہ تمہیں بتا دے گا جو کچھ تم کرتے رہے تھے۔

﴿وَلِكُلِّ دَرَجَاتٍ مِّمَّا عَمِلُوا وَلِيُوَفِّيَهُمْ اَعْمَالَهُمْ وَهُمْ لَا يَظْلَمُونَ﴾

(الحاقاف: ۴۶: ۱۹)

اور وہاں لوگوں کے اعمال کے مطابق ان کے اچھے برے درجے ہوں گے تاکہ اللہ سب کو ان کے کیے کا پورا بدلہ دے اور ان پر ظلم نہ ہوگا۔

فرمان نبوی

— ”ان اللہ تعالیٰ یحب ان یری عبده تعباً فی طلب الحلال“ (۱)

اللہ تعالیٰ کو یہ بات بہت محبوب ہے کہ بندہ رزق حلال کی کوشش میں خوب تھکے۔

— ”اشد الناس حسرة يوم القيامة رجل كسب مالا من غير حله

فدخل به النار“ (۲)

روز قیامت سب سے زیادہ حسرت اس شخص کو ہوگی جس نے دنیا میں مال حرام

کمایا ہوگا اور اس وجہ سے وہ جہنم کا ایندھن بنے گا۔

(۱) رواہ الدیلمی

(۲) مسند احمد بن حنبل، ۳: ۷۰، ۷۱

کام چوری کی پوری تعریف یہ ہے: ان کاموں میں جان بوجھ کر اور بلا عذر کوتاہی اور سستی کرنا جنہیں ہم نے خود اپنے ذمہ لے رکھا ہے۔ ان میں سے بعض کام ایسے ہوتے ہیں جن کا ہمیں معاوضہ ملتا ہے اور بعض ایسے ہوتے ہیں جن کی ہم نے اپنی مرضی سے ذمہ داری لے رکھی ہوتی ہے۔ پہلے کاموں میں کوتاہی کے نتیجے میں ان سے حاصل ہونے والی آمدنی پوری طرح جائز نہ ہوگی اور دوسرے کاموں کو ٹالنے کے نتیجے میں ہم وعدہ خلافی کا گناہ مول لیتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں کام چوری کے نتائج تشویشناک ہیں۔

یہ مرض کسل، وعدہ خلافی، جھوٹ، فریب دہی وغیرہ کی قبیل سے تعلق رکھتا ہے۔ کام چوری کے عادی شخص میں ان میں سے اکثر خرابیاں موجود ہوتی ہیں۔ اس کے پھیلے ہوئے نقصانات کی تفصیل دیکھنی ہو تو مذکورہ بالا خرابیوں کا بیان دیکھ لیا جائے۔ تاہم کام چوری میں ایک چیز ایسی ہے جس کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ چیز کام چوری سے خاص ہے اور وہ ہے رزق حلال کی مطلوبہ خواہش نہ رکھنا اور مسلمانوں کے اجتماعی نظام کا بار آمد حصہ بننے کی خواہش نہ رکھنا۔ ان دونوں کو ملا کر جو شے وجود میں آتی ہے وہ کام چوری کا لازمہ ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ خرابی کتنی بڑی ہوگی کہ جن دو اجزاء سے اس کا وجود عبارت ہے خود ان میں سے ہر ایک جزء مسلمان کی شخصیت کو تباہ کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔

مشکل یہ ہے کہ کام چوری ایک وبائی مرض کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ معاشرے میں زیادہ تر لوگ مریض ہو جائیں تو مرض کا احساس اور صحت کی خواہش باقی نہیں رہتی، ہمارے معاشرے کا انتہائی کثیر حصہ اس بیماری میں مبتلا ہے اور اس کے ضرر کا احساس بھی تقریباً مٹ چکا ہے بلکہ اب تو صورتحال یہ ہے کہ جو شخص اپنے حصے کا کام ذمہ داری اور مستعدی سے انجام دیتا ہے اسے پاگل اور احمق گردانا جاتا ہے۔ یہاں اگر ہم غور کریں تو کام چوری کے ایک بڑے سبب تک پہنچ سکتے ہیں اور وہ ہے مال کی محبت۔ ایک ایسی فضا میں جہاں ہر انسانی صلاحیت مال کمانے میں صرف ہو رہی ہو وہاں کام چوری دھیرے

دھیرے ایک آسان اور مختصر راستے کی شکل اختیار کر لیتی ہے جس پر چل کر آدمی کسی مشقت میں پڑے بغیر اپنا مقصد حاصل کر لیتا ہے۔ حالانکہ بظاہر یوں لگتا ہے، اور ایک مختلف معاشرتی صورت حال میں یہ بات ٹھیک بھی ہے، کہ کام چور لوگ دولت اور دنیا کے حصول میں زیادہ دلچسپی اور انہماک نہیں رکھتے لیکن ہماری صورت حال ایسی نہیں ہے۔ ہم کام نہ کر کے کام کرنے کے فوائد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ہماری کام چوری دنیا سے بے رغبتی کی وجہ سے نہیں بلکہ اسے آسانی اور چالاکی کے ساتھ حاصل کرنے کی ایک سوچی سمجھی تدبیر ہے۔ یہ درست ہے کہ بعض لوگ محض طبعاً کاہل اور کسی جسمانی مرض کی وجہ سے اپنے کام انجام دینے کی پوری صلاحیت سے محروم ہوتے ہیں، ایسے لوگ ہمارا موضوع نہیں ہیں۔ ہمارا اصل موضوع وہ لوگ ہیں جو کام کرنے کی تمام صلاحیت رکھنے کے باوجود ایک تو کام نہیں کرتے ہیں اور دوسرے اس کام کا پھل بھی سمیٹنے کی خواہش رکھتے ہیں۔

اسباب

گوکہ کام چوری کے بنیادی اسباب ہم اوپر بتا چکے ہیں لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس خرابی کے بیشتر اہم اسباب کی ایک فہرست بنا دی جائے تاکہ اسے پہچاننے اور اس سے چھٹکارا پانے کی کوشش میں مدد مل سکے:

- ۱۔ روزی میں حلال اور حرام کی تمیز نہ رکھنا
- ۲۔ ایسی کاپلی جس نے اخلاقی خرابی کی شکل اختیار کر لی ہو یعنی کسل
- ۳۔ فریب کاری، جھوٹ وغیرہ
- ۴۔ وعدہ خلافی کی عادت
- ۵۔ ایثار کا جذبہ نہ ہونا یعنی خود غرضی
- ۶۔ پست ہمتی

علاج

اس بیماری کے علاج کا حقیقتاً ایک ہی طریقہ ہے، اس کو اختیار کر لیا جائے تو قوی امید ہے کہ کام چوری سے مکمل نجات مل سکتی ہے، وہ طریقہ یہ ہے کہ حلال آمدنی اور حرام کمائی کے تصور کو دل میں راسخ کر لیا جائے اور کسی بھی قیمت پر اس تصور کی خلاف ورزی نہ کی جائے مثلاً ان وعیدوں کو متحضر رکھا جائے جو حرام کمائی کے ضمن میں رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمائی ہیں جیسے حرم کمانے والا دوزخ کا ایندھن بنتا ہے (۱) اس کی دعا قبول نہیں ہوتی (۲) بلکہ نماز، صدقہ، حج غرض کوئی بھی نیک عمل قبول نہیں ہوتا۔ (۳)

اگر آدمی یہ طے کر لے کہ اسے حرام تو دور کی بات ہے، مشتبہ رزق سے بھی بچنا ہے تو یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ کام چوری کی لعنت میں گرفتار ہو سکے۔ گو کہ علاج کی اور بھی تدابیر ہیں لیکن سب سے موثر یہی تدبیر ہے البتہ ضرورت ہو تو کسٹل اور وعدہ خلافی کا جو علاج بتایا گیا ہے اسے بھی اختیار کر لیا جائے۔

س: جیسا کہ آپ نے شروع میں کہا تھا کہ اصلاح اخلاق کا آغاز ان اخلاقی امراض کی اصلاح سے کیا جائے گا جن کا تعلق طبیعت اور اس کی بناوٹ سے ہے یعنی جو حال کی خرابیاں ہیں۔ اب جبکہ ان کا بیان مکمل ہو چکا تو امید ہے کہ آپ ان خرابیوں پر بھی گفتگو کریں گے جن کا تعلق ارادہ و شعور سے ہے یعنی افعال کی خرابیاں۔

ج: جی ہاں! ہمارا پروگرام یہی ہے کہ احوال سے افعال کی طرف آئیں لیکن اس سے پہلے ایک بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ احوال کی کسی خرابی کا علاج بھی سمجھ دار اور

۱۔ مسند احمد بن حنبل، ج ۳ ص ۷۰

۲۔ جامع الترمذی، ابواب تفسیر القرآن، باب تفسیر سورۃ البقرۃ

۳۔ مستدرک حاکم، کتاب الزکاۃ، باب من صدق من مال حرام لم یکن لہ اجر

ج: مخلص آدمی کی مسلسل رہنمائی اور اچھی صحبت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ ایسا مریض اپنے علاج کے لیے بتائی گئی تدابیر پر خود سے عمل نہیں کر سکتا تا وقتیکہ کوئی صاحب فراست شخص اسے ہاتھ سے پکڑ کر نہ چلائے۔ اس لیے کم از کم اس معاملے میں ہماری معالجاتی تدابیر کے اصل مخاطب وہ لوگ ہیں جنہوں نے دینی تربیت یا اس کا کوئی پہلو اپنے ذمہ لے رکھا ہو۔ ایسے حضرات، امید ہے کہ ان معالجات سے فائدہ اٹھائیں گے البتہ اختیاری و ارادی یعنی افعال کی خرابیوں میں مریض بتائی ہوئی تدابیر پر عمل کرنے کی قدرت بھی رکھتا ہے اور خواہش بھی لہذا اب ہم جو گفتگو کریں گے وہ توقع ہے کہ ایک وسیع تر افادیت اور تاثیر کی حامل ہوگی۔



باب سوم

امراض افعال (ارادہ و اختیار) اور ان کا علاج

بہتان تراشی	غیبت	جھوٹ
خوشامد و مدائمت	فحش کلامی	چغلی
طول اہل	بد نظری	وعدہ خلافی
تجسس	بدعت	بے ادبی و غلو ادب
لہو و لعب	خود رائی	اسراف
مایوسی و ڈپریشن	فریب دہی	تن آسانی و آرام طلبی
	کسب حرام	غصب حقوق

جھوٹ

حکم ربّانی

— ﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ﴾ (المومن ۳۰: ۲۸)

بے شک اللہ کسی ایسے شخص کو ہدایت نہیں دیتا جو حد سے گزرنے والا اور جھوٹا ہو۔

— ﴿أَنَّمَا يَفْتَوَى الْكَذِبَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَأُولَئِكَ

هُمْ الْكَاذِبُونَ﴾ (النحل ۱۶: ۱۰۵)

جھوٹ وہ لوگ گھڑتے ہیں جو اللہ کی آیات پر ایمان نہیں رکھتے اور وہی جھوٹے ہیں۔

فرمان نبوی

— ”آية المنافق ثلاث: اذا حدث كذب...“ (۱)

منافق کی تین نشانیاں ہیں (جن میں سے ایک یہ ہے) کہ وہ جھوٹ بولتا ہے۔

— ”.....إِنَّ الْكَذِبَ يَهْدِي إِلَى الْفُجُورِ وَإِنَّ الْفُجُورَ يَهْدِي إِلَى

النَّارِ وَإِنَّ الرَّجُلَ لَيَكْذِبُ حَتَّى يُكْتَبَ عِنْدَ اللَّهِ كَذَّابًا“ (۲)

بلاشبہ جھوٹ نافرمانی کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور نافرمانی جہنم کی طرف

رہنمائی کرتی ہے اور یقیناً آدمی جھوٹ بولتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ اللہ کے ہاں

جھوٹا لکھ دیا جاتا ہے۔

س: جھوٹ کیا ہے؟

ج: جان بوجھ کر کوئی ایسی بات کہنا جو جزوی یا مجموعی طور پر خلاف واقعہ ہو، جھوٹ ہے۔

جھوٹ مذاق میں بھی ویسا ہی گناہ ہے جیسا سنجیدگی سے۔ (۳)

(۱) صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب لا یدخل الجنة الا المومنون

(۲) صحیح بخاری، کتاب الادب، باب قول اللہ تعالیٰ، ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ﴾

(۳) سنن ابن ماجہ، کتاب السنة، باب اجتنب البدع والجدل

س: کیا آدمی مصلحتاً بھی جھوٹ نہیں بول سکتا؟

ج: یہ صحیح ہے کہ شریعت میں بعض مصلحتوں سے جھوٹ بولنا جائز ہے (جیسے جان بچانے کے لیے [النحل ۱۶: ۱۰۶]) یا متحارب فریقین میں صلح کروانے کے لیے (۱) لیکن چونکہ ہم نفس کی خرابیوں کو محض قانونی نظر سے نہیں دیکھ رہے لہذا ہم کسی طرح کی مشروط رخصت، عذر اور اباحت کو زیر بحث نہیں لانا چاہتے۔ رخصت طلبی اور عذر پسندی خود ایک خرابی ہے جو کسی فتوے کی تائید ملنے کے باوجود خرابی ہی شمار ہوگی۔ اس لیے ہماری درخواست ہے کہ امراض نفس کے علاج میں کسی محدود اور مشروط جواز پر نظر نہ ڈالی جائے کیونکہ کوئی خرابی اگر کسی وجہ سے قابل گرفت نہ بھی رہے تو اصلاح نفس کا جذبہ اتنا قوی ہونا چاہیے کہ اس وجہ کو یکسر نظر انداز کر دیا جائے۔ ہمیں چاہیے کہ معاملے میں اپنا رویہ جارحانہ اور بہت مثبت رکھیں تب کہیں جا کے نفس کے بگاڑ میں اصلاح کی کوئی صورت نکلے گی۔ اس مرحلے پر مصلحت وغیرہ کا تصور بے معنی بلکہ مضر ہے۔ شریعت کا خاص مزاج یہ ہے کہ ناچاری اور مجبوری کی حالت میں کوئی ناجائز فعل فطرتاً جائز ہو جاتا ہے۔ لہذا اس کے پیشگی علم کی کوئی ضرورت نہیں۔

س: کیا جھوٹ طبیعت میں اس حد تک راسخ ہو جاتا ہے کہ آدمی لاشعوری اور غیر ارادی طور پر اس کا ارتکاب کرنے لگے اور جھوٹ بولتے وقت اس کی نیت جھوٹ کی نہ ہو؟

ج: بہت سے گناہ خاص طور پر زبان کے گناہ ایسے ہی ہوتے ہیں کہ آدمی کو غلطی کر گزرنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ مجھ سے فلاں غلطی ہو گئی۔ اس طرح کے گناہوں میں جھوٹ سرفہرست ہے۔ اس کی عادت پڑ جائے تو یہ شعوری سے بڑھ کر طبعی ہو جاتا ہے تاہم اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس پر سے شعور اور اختیار کی گرفت بالکل ہٹ جاتی ہے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو یہ قابل مواخذہ فعل نہ رہتا۔

الحج بخاری، کتاب الصلح، باب ليس الكاذب الذي يصلح بين الناس

س: یہ خرابی، جس کا بیشتر حصہ بقول آپ کے طبعی ہے کس ترکیب سے قابو میں آسکتی ہے اور اس کے علاج کی موثر تجاویز، جو بہر حال شعوری اور ارادی ہوں گی، کیسے تلاش کی جاسکتی ہیں؟

ج: طبعی گناہ دراصل وہ گناہ ہوتے ہیں جن کی عادت پڑ گئی ہو۔ بری عادت یعنی برے عمل کی تکرار کا علاج اچھے عمل کی تکرار ہی سے ہو سکتا ہے یعنی ایک ہی نسلطی خواہ متنی ہی باریکوں نہ ہو، اس کے ہر ارتکاب کے فوراً بعد دو چیزوں پر عمل کرنا خود پر لازم کر لینا چاہیے۔ ایک استغفار اور دوسرے اس کے معاملے کی کوئی تدبیر۔ جھوٹ کے معاملے میں بھی یہی کرنا چاہیے کہ جیسے ہی کوئی جھوٹ سرزد ہو آدمی اللہ کے آگے گڑگڑا کر اس کی معافی مانگے اور پھر اس تدبیر پر عمل کرے کہ جسے جھوٹ سنایا ہو اور جس کے بارے میں جھوٹ بولا ہو ان کو اس جھوٹ کی صاف اور غیر مبہم لفظوں میں اطلاع دے اور معذرت کرے۔ یہ تدبیر جھوٹ سے بچنے کے لیے نہایت موثر ہے کیونکہ اس سے نفس کو ذلت اٹھانا پڑتی ہے اور نفس اپنی ذلت گوارا نہیں کرتا۔ جھوٹ کے دیگر علاج حسب ذیل ہیں:

- سچے اور نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرنا۔
- زیادہ بولنے سے پرہیز کرنا۔
- اپنے ملنے جلنے والوں کو اپنی اس خرابی سے باخبر کر دینا۔
- کثرت تلاوت
- ارشاد رسول ﷺ کی تعمیل میں زبان کو زیادہ تر اللہ کے ذکر میں مشغول رکھنا (۱)

س: جھوٹ کے نقصانات کیا ہیں؟

ج: جھوٹ کے گناہ بے شمار ہیں مثلاً:

- ۱۔ جھوٹ گناہ کبیرہ ہے (۱) اور نفاق کی ایک علامت ہے (۲) اس کا پہلا نقصان تو یہی ہے کہ آدمی کے اندر منافقوں سے ایک مشابہت پیدا ہو جاتی ہے۔
- ۲۔ جھوٹ بولنے والا معاشرت کے کسی بھی حصے میں خود کو چھپا کر نہیں رکھ سکتا اور لوگ جلدی بھانپ لیتے ہیں کہ یہ آدمی جھوٹا اور دروغ گو ہے۔
- ۳۔ جھوٹ بولنے کی عادت رفتہ رفتہ سچ بولنے کی صلاحیت ہی ختم کر دیتی ہے۔
- ۴۔ جھوٹ سے ریا پیدا ہوتا ہے۔
- ۵۔ جھوٹ بولنے والا آدمی عموماً چغلی، نسیب اور بہتان سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔
- ۶۔ یہ عادت یا تو رزق کو کم کر دیتی ہے یا سو فیصد حلال نہیں رہنے دیتی کیونکہ جھوٹا آدمی عموماً معیشت کے باب میں بھی مکرو فریب کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔
- ۷۔ ہر مسلمان کا دوسرے مسلمان پر یہ حق ہے کہ اسے دھوکہ نہ دیا جائے۔ جھوٹ سے یہ حق مجروح ہوتا ہے۔ یہ حق تلفی آخرت میں جہنم میں لے جانے کا سبب بھی بن سکتی ہے۔
- ۸۔ یہ عادت بال بچوں میں بھی سرایت کر جاتی ہے اور جھوٹے آدمی کے گھر میں بھی جھوٹ ہی کا دور دورہ ہو جاتا ہے۔

۱۔ جامع الترمذی، ابواب البیوع، باب ماجاء فی التغلیظ فی الکذب والزور ونحوہ

۲۔ جامع الترمذی، ابواب الایمان، باب ماجاء فی علامۃ المنافق

غیبت

علم ربانی

﴿وَلَا يَغْتَبِ بَعْضُكُم بَعْضًا يَحِبُّ أَحَدُكُمْ أَنْ يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوهُ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ تَوَّابٌ رَحِيمٌ﴾ (الحجرات ۱۲:۳۹)

تم میں سے کوئی شخص دوسرے کی غیبت نہ کرے، کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرتا ہے کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے، تم تو اسے ناپسند کرتے ہو، تو اللہ سے ڈرو۔ یقیناً اللہ تعالیٰ بہت رجوع کرنے والا نہایت مہربان ہے۔

﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا﴾ (الاسراء ۱۲:۳۶)

اس چیز کے پیچھے مت پڑو جس کا تمہیں علم نہیں، بے شک کان، آنکھ اور دل، ان سب ہی سے باز پرس ہوگی۔

فرمان نبوی

— ”کل المسلم علی المسلم حرام دمہ و عرضہ و مالہ“ (۱)

ہر مسلمان کا خون، اس کی آبرو اور اس کا مال ہر دوسرے مسلمان پر حرام ہے۔

— ”لَمَّا عَرِجَ بَنُو مَرْرُثَ بِقَوْمٍ لَهُمْ أَظْفَارٌ مِنْ نَحَاسٍ يَخْمِسُونَ وَجُوهَهُمْ وَصُدُّوهُمْ - فَقُلْتُ مَنْ هَؤُلَاءِ يَاجَبْرِئِلُ؟ قَالَ: هَؤُلَاءِ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ لَحْمَ النَّاسِ وَيَقْعُونَ فِي أَعْرَاضِهِمْ“ (۲)

جب مجھے معراج کرائی گئی تو میرا گزر کچھ ایسے لوگوں کے پاس سے ہوا جن کے ناخن تانبے کے تھے، وہ (ان سے) اپنے چہروں اور سینوں کو نوچ رہے تھے تو میں نے پوچھا، جبریل! یہ کون لوگ ہیں؟ آپ نے فرمایا: یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کا گوشت کھاتے ہیں (غیبت کرتے ہیں) اور ان کی عزتوں کو پامال کرتے ہیں۔

(۱) جامع الترمذی، کتاب البیڑ، باب ماجاء فی شفقة المسلم علی المسلم

(۲) سنن ابی داؤد، کتاب الاوب، باب الغیبه

س: غیبت کی تعریف؟

ج: کسی شخص میں موجود خامی کو اس کی غیر موجودگی میں (بلا کسی شرعی ضرورت کے) بیان کرنا غیبت ہے۔ (۱) اس میں ضروری نہیں کہ نیت تحقیر و تذلیل کی ہو۔

غیبت کا تعلق ان گناہوں سے ہے جو معاشرت اور صحبت کی خرابی کے ساتھ ساتھ ایک ایسی افتاد طبع سے پیدا ہوتے ہیں جو دین کی مطلوبہ طبیعت سے یکسر متصادم ہے۔ دین ہمارے لئے حقوق العباد اور اس کی نگہداری کا ایک پورا نظام بناتا ہے جس کا مرکزی نقطہ دوسروں کا اکرام اور خیر خواہی ہے یعنی دینی معاشرت کی بنیاد مسلمان بلکہ محض انسان کی تعظیم اور ہمدردی پر استوار ہے۔ ہر وہ عمل جو اس بنیاد پر ضرب لگائے وہ نہایت شدت سے منافی دین ہے اور اس کے علاج اور ازالے کے لیے ایسی ہی کوشش اور فکر درکار ہے جیسی کہ آدمی حقوق اللہ کی راہ میں آنے والی رکاوٹیں دور کرنے کی خاطر کرتا ہے یا اسے کرنی چاہیے۔ یہ صحیح ہے کہ جدید ذہنیت کے اکثر لوگ جس انداز سے حقوق العباد کو حقوق اللہ پر ترجیح دیتے ہیں، وہ بالکل غلط ہے کیونکہ حقوق العباد کی اصل حقوق اللہ ہی ہیں تاہم اتنا ضرور ہے کہ جو چیز حقوق اللہ میں غفلت کا سبب بنتی ہے وہ اس چیز کے مقابلے میں کم خطرناک ہے جو حقوق العباد کی خلاف ورزی پر اکساتی ہے۔ حقوق اللہ میں غفلت عام طور پر نفس کی کسی خلقی کمزوری (مثلاً کابلی وغیرہ) کی بنیاد پر ہوتی ہے لیکن وہ داعیہ جو حقوق العباد کو نظر انداز کرواتا ہے سراسر شیطانی ہے اور تکبر پر مبنی ہے کیونکہ شیطان نے بھی اپنی دانست میں حقوق اللہ کے مثالی درجے کو ملحوظ رکھ کر آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کیا تھا۔ یہ انکار اس قبیل کے تمام گناہوں کا سرچشمہ ہے۔

ہماری سمجھ میں تو یوں آتا ہے کہ دین گویا ایک نظام تعلق ہے جس کی پاسداری

۱۔ صحیح مسلم، کتاب البر و الصلة، باب تحریم الغیبة

کے لیے ایک خاص قسم کی طبیعت اور ذہنیت مطلوب ہے۔ خود اللہ تعالیٰ اپنے اور اپنے رسول ﷺ کے لیے جس تعلق کا تقاضا کرتے ہیں وہ اپنی ماہیت میں انسانوں میں پائے جانے والے تعلقات سے مختلف نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حقوق العباد کی صورت میں ہم میں تعلق کی مطلوبہ صلاحیت پیدا کی جاتی ہے جو اپنے کمال کو پہنچ کر حقوق اللہ کی تعمیل کا ذریعہ بنتی ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ کوئی شخص تعلقات کے انسانی دائرے میں کسی بڑی گڑبڑ میں مبتلا ہو اور اللہ کے ساتھ صحیح اور سچا تعلق رکھتا ہو۔ اس اصول کے پیش نظر ہم یہ اعتماد سے کہہ سکتے ہیں کہ غیبت یا اس جیسے دیگر معاشرتی گناہ آدمی کو تعلق مع اللہ کی استعداد سے محروم کر دیتے ہیں اور یہی اس کا اصل نقصان ہے۔

س: آپ کی بات سے اندازہ ہوا کہ قرآن میں غیبت کو مردہ بھائی کا گوشت کھانے سے تعبیر کرنے (الحجرات ۱۲:۳۹) کا کیا مطلب ہے! عام طور پر قرآن و سنت کا یہ مستقل اسلوب دیکھنے میں آتا ہے کہ گناہ کی سختی سے سخت سزا کو بھی اس قدر قابل نفرت اور مکروہ مثال سے نہیں سمجھایا گیا بلکہ اسے خوف پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے لیکن غیبت اور سود کے معاملے میں کراہت کو خوف پر غالب کر دیا گیا ہے۔ اس کا کوئی سبب ذہن میں آتا ہو تو بتائیے؟

ج: یہ اچھا نکتہ ہے۔ بیشتر گناہوں کے لیے واقعی یہ کافی سمجھا گیا کہ ان کے انجام سے خوفزدہ کر دیا جائے لیکن غیبت اور سود جو حقوق العباد کی صریح خلاف ورزی ہیں، ان کے لیے محض انذار پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ ان کے حوالے سے ایک ایسی تصویر کشی کی گئی جو انسانی نفس کی پست ترین اور مسخ ترین صورت کے لیے بھی سخت گھناؤنی اور قطعاً ناقابل قبول ہے۔ اس کے کچھ اسباب فوری طور پر اس طرح سمجھ میں آتے ہیں کہ ان افعال کے بارے میں ایک فوری اجتماعی رد عمل پیدا کر دیا جائے تاکہ ان

کے سد باب میں اجتماعی سطح پر ایک بیتابی پیدا ہو اور دوسرے یہ کہ چونکہ یہ اللہ ہی کا بنایا ہوا قانون ہے کہ بندوں کی حق تلفی وہ معاف نہیں کریں گے بلکہ اس کے لیے متاثرہ آدمیوں ہی کو اختیار دیا جائے گا اس لیے اللہ کی مرضی کچھ یوں معلوم ہوتی ہے کہ جن لوگوں کی عزت یا وسائل زندگی پر چوٹ لگی ہو ان کے لیے خود پر زیادتی کرنے والوں کو معاف کرنا سخت مشکل بلکہ ایک سطح پر عام آدمی کے لیے تو غیر فطری ہے۔ لہذا معافی کے امکان کو زندہ حالت میں موجود رکھنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ ان غلطیوں کی طرف سے انفرادی و اجتماعی سطح پر ایک مٹی بر نفرت رد عمل پیدا کر دیا جائے جن کا آخرت میں معاف ہونا نہایت دشوار بلکہ تقریباً ناممکن ہے۔ یہ بھی ایک وجہ وہ سکتی ہے اس اسلوب تمثیل کی۔

نیز یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ حقوق العباد کے دائرے میں کوتاہیوں کی ایک لمبی فہرست ہے لیکن غیبت اور سود کے علاوہ غالباً کسی اور کے بارے میں یہ انداز اختیار نہیں کیا گیا۔ اس کی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ غیبت اور سود کے اندر بندوں کی حق تلفی کی تمام صورتیں جمع ہیں اور پھر یہ بھی ہے کہ یہ دو گناہ ایسے ہیں جو معاشرے کے تمام افراد میں سرایت کر سکتے ہیں اور رفتہ رفتہ معاشرت کا ایک ایسا ہمہ گیر حصہ بن سکتے ہیں جس کی مضرت ذہنوں سے فراموش ہونے جاتی ہے اور یہ خود ایک معاشرتی قدر بن جاتی ہے جیسا کہ ہمارے مشاہدے میں ہے۔ تو گویا یہ نتیجہ نکالنا شاندار درست ہو کہ جن گناہوں کا گناہ ہونا فراموش ہو سکتا ہو وہ زیادہ خطرناک ہوتے ہیں اور ان کے ازالے کے لیے محض ڈرانا کافی نہیں ہوتا بلکہ طبیعت اور ذہن میں ایک مخالف قوت کو ابھارنا پڑتا ہے جو ان کی کشش یا براس حیثیت کو زائل کر دے جو انہوں نے اجتماعی سطح پر حاصل کر لی ہوتی ہے۔

س: غیبت کی تعریف میں آپ نے یہ بتایا کہ یہ کسی شخص میں موجود خرابی کا اس کی غیر موجودگی میں بیان ہے جس کی کوئی شرعی ضرورت نہ ہو اور چاہے اس میں نیت اس آدمی کی تحقیر و توہین کی نہ ہو، ان دو باتوں کی وضاحت ضروری ہے کہ یہاں شرعی ضرورت کا کیا مفہوم ہے؟ اور غیبت میں توہین و تحقیر کی نیت کا نہ ہونا کیسے ممکن ہے؟

ج: غیبت کی بنیادی تعریف تو محض اتنی ہے کہ کسی کی غیر موجودگی میں اس کے کسی نقص کا اعلان۔ اس تعریف کو مد نظر رکھ کر آپ غور کریں تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ بعض صورتوں میں ایسا کرنا شرعاً ضروری ہو جاتا ہے مثلاً آپ کے علم میں آیا کہ فلاں شخص کسی مسلمان کو نقصان پہنچانے کا منصوبہ بنا رہا ہے تو اس وقت آپ پر یہ واجب ہے کہ اس آدمی کو جسے نقصان پہنچانے کی تیاری کی جا رہی ہے، خبردار کر دیں۔ یہ تو ہوئی شرعی ضرورت، باقی رہا توہین و تحقیر کی نیت نہ ہونا تو یہ بات دو طرح سے ثابت ہے۔ اس کی دینی سند تو رسول اللہ ﷺ کی وہ حدیث ہے جس کے مطابق حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ایک خاتون کے بارے میں یہ کہا کہ ”وہ لمبے فراق والی“، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم نے اس کی غیبت کی (۱)۔ اب بظاہر اس واقعے سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کی نیت اس خاتون کی توہین و تحقیر کی نہیں تھی بلکہ محض پہچان مقصود تھی جسے انہوں نے ذرا بے تکلفی سے کہہ دیا، لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ نے سختی سے گرفت فرمائی اور اس کو بھی غیبت پر محمول فرمایا۔ دوسرے اس واقعے میں ہمارے لیے جو سبق پوشیدہ ہے وہ یہ ہے کہ ہر وہ عمل جو کسی مسلمان کی سبکی پر منتج ہو سکتا ہو، غلط ہے خواہ وہ مٹی بر بے تکلفی ہی کیوں نہ ہو۔ دوسری دلیل نفسیاتی ہے۔ بعض مرتبہ آدمی مزا جاً تحقیر کا شعوری قصد نہیں کرتا۔

ایسی غیبت جس میں تحقیر کا شعوری قصد یعنی نیت نہ کی گئی ہوگی اسی مزاج سے صادر ہوتی ہے۔ ایسے مزاج کی کارفرمائی پر روک لگانا ایک شرعی ذمہ داری ہے۔ امید ہے کہ اب بات واضح ہوگئی ہوگی۔

س: غیبت کے عملی نقصانات کیا ہیں؟

ج: ہر گناہ کی طرح غیبت کے بھی کچھ نقصانات نفسیاتی ہیں اور کچھ معاشرتی۔ اس کا بہت بڑا نفسیاتی نقصان یہ ہے کہ غیبت کے عادی شخص میں گناہ پر ندامت اور توبہ کی خواہش باقی نہیں رہتی۔ مطلب یہ ہے کہ غیبت ایک ایسا گناہ ہے کہ اول تو ہم اس کے ارتکاب کے لیے ایسے بہانے آسانی سے ڈھونڈ نکالتے ہیں جن سے اس کا گناہ ہونا محسوس نہیں ہوتا۔ اس معاملے میں کچھ قصور اہل علم کا بھی ہے جنہوں نے غیبت کے تباہ کن نفسیاتی اور معاشرتی اثرات کو پوری طرح محسوس نہیں کیا اور اس معاملے میں بعض ایسی رخصتیں نکال کر اپنے عمل کے ذریعے سے رائج کر دیں کہ اس نہایت بڑے گناہ کی وہ ہولناکی، جس کا ہر مسلمان کو فطری طور پر احساس ہونا چاہیے تھا، ایک قانونی رخ اختیار کر گئی جس کی وجہ سے وہ خوف نہ ہونے کے برابر رہ گیا جو گناہ سے بچنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہوتا ہے۔ ہماری رائے میں اگر اس طبیعت اور ذہن کو بدلنا مقصود ہو جو بعض معاشرتی خرابیوں کی وجہ سے غیبت جیسے گناہ کو معمول بنا لیتا ہے تو اس کے لیے اس گناہ کے بارے میں ایک سرد قانونی رویہ اختیار کرنا اور پھر اس کی ایسی درجہ بندی کرنا، جس کے باہمی امتیازات بھی بہت زیادہ واضح نہ ہوں، سخت مضر ہے بلکہ اس کا مضر ہونا پوری طرح ثابت ہو چکا ہے۔ بہتر تدبیر یہ ہوتی کہ غیبت کے پورے عمل کو سختی سے رد کرنے کے بعد بعض انفرادی یا مخصوص صورتوں میں اس کی اباحت کا حکم لگایا جاتا اور جہاں کسی دوسرے مسلمان کے

عیوب کا اظہار اور اطلاع کسی شرعی ضرورت سے ناگزیر ہو جاتی تو وہاں سنت کے مزاج کو اچھی طرح ملحوظ رکھتے ہوئے اس کا عنوان مشاورت رکھا جاسکتا تھا۔ ایسی مشاورت جو اپنی قبیل میں غیبت سے بالکل مختلف چیز ہوتی ہے۔ جب ہم غیبت کا نام لے کر اس کی کسی صورت کو مباح یا جائز قرار دیتے ہیں تو اس سے عام ذہن اور عام طبیعت پورے عمل غیبت کے جواز پر پہنچ جاتی ہے۔ بہر حال یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا، اب ہم غیبت کے نقصانات نمبر وار عرض کرتے ہیں:

۱۔ غیبت کرنے والا دوسرے مسلمانوں کے حقوق پورے کرنے کی صلاحیت گنوا بیٹھتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا تعلق باہمی خیر خواہی کی بنیاد پر قائم ہے۔ غیبت اس خیر خواہی کے خلاف ہے اور اگر عادت بن جائے تو خیر خواہی کے پورے تصور ہی کو منہ کر رکھ دیتی ہے۔

۲۔ عام طور پر غیبت حب جاہ کی وجہ سے سرزد ہوتی ہے لیکن بعض اوقات خود اس عمل سے حب جاہ پیدا ہو جاتی ہے جو ایک ایسی خرابی ہے جو اسلام کے نمونہ بندگی کے بالکل برعکس ہے۔

۳۔ اس کے عادی شخص میں دو خرابیاں ضرور پیدا ہو جاتی ہیں ایک جھوٹ اور دوسرے چغل خوری اور ان تینوں کا امتزاج غیبت کو بہتان کے درجے تک پہنچا دیتا ہے۔

۴۔ معاشرتی بگاڑ: مسلمانوں کے باہمی تعلقات میں معاشرتی سطح پر جو چیزیں شرعاً درکار ہیں مثلاً بھائی چارہ اور ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہونا وغیرہ، غیبت کا رواج انہیں ختم کر دیتا ہے۔

۵۔ غیبت سے نفاق یقیناً اور یا غالباً پیدا ہو جاتا ہے۔ نفاق اس لیے کہ عام طور پر غیبت دو احوال سے خالی نہیں ہوتی، یا تو یہ برائے تفریح ہوتی ہے یا برائے توہین۔

تفریح میں آدمی کا دل ممکن ہے اس شخص کو اچھا جانتا ہو جس کی غیبت وہ کر رہا ہے اور توہین میں غیبت کرنے والا عموماً خود کو ایک خیر خواہ اور ہمدرد آدمی کے روپ میں پیش کرتا ہے، جو کہ وہ ہوتا نہیں۔ ریا کا خطرہ اس لیے ہے کہ غیبت کرنے والا دوسروں کے جن عیوب کا اظہار کرتا ہے، ان سے خود کو پاک دکھانے کی کوشش بھی کرتا ہے، یہ صاف ریا ہے۔

۶۔ غیبت سے تجسس بھی پیدا ہوتا ہے جس کی ممانعت قرآن و سنت میں آئی ہے (الحجرات ۱۲:۴۹) (۱) غیبت کرنے والے کی نفسیاتی ساخت ہی ایسی بن جاتی ہے کہ وہ دوسروں کی ٹوہ میں رہے بغیر نہیں رہ سکتا۔

۷۔ عیب جوئی: یہ غیبت کے عادی آدمی کی ضرورت ہے کہ دوسروں کے عیب ڈھونڈے اور ان کا ڈھنڈورا پیٹے۔ اس کو آپ غیبت کا سرچشمہ کہہ سکتے ہیں۔

۸۔ سنگ دلی: گو کہ یہ غیبت کا لازمہ نہیں ہے لیکن اس کا خطرہ بہر حال ہوتا ہے۔

۹۔ وقت کا ضیاع: غیبت عام طور پر تفصیل سے ہوتی ہے گویا وقت کا اچھا خاصہ حصہ ایک گناہ میں بسر ہوتا ہے جو اپنی جگہ خود بڑا گناہ ہے۔

۱۰۔ بقول مولانا تھانویؒ غیبت کی مضرت دین و دنیا دونوں میں ہے (۲)۔ دنیا کی مضرت تو یہ ہے کہ اس سے باہمی تشویش و نا اتفاقی پیدا ہوتی ہے اور دین کی مضرت یہ ہے کہ قیامت کے دن غیبت کرنے والے کی نیکیاں اس کو مل جائیں گی جس کی غیبت کی تھی۔ (۳)

۱۱۔ عبادات میں دل نہ لگنا، دوسروں کے دکھ درد میں پوری طرح شریک نہ ہونا،

۱۔ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب ما ینبی عن التحاسد والتدابیر

۲۔ مولانا شرف علی تھانویؒ (مرتب مولانا محمد دین) شریعت و طریقت، ص ۷۷، ادارہ اسلامیات، لاہور ۱۹۸۱ء

۳۔ جامع الترمذی، ابواب البر و الصلۃ، باب ما جاء فی الذب عن (عرض) المسلم

۱۱۔ لہو و لعب، کم عقلی، لاپرواہی، عجب اور کسی قدر بے جمہیتی..... یہ سبھی غیبت کے نتائج ہو سکتے ہیں اور آخرت کا نقصان یعنی اللہ تعالیٰ کی ناراضی اور دوزخ تو اس فعل قبیح کا نتیجہ ہیں ہی۔ (۱)

س: شریعت و طریقت میں مولانا تھانویؒ نے یہ لکھا ہے کہ غیبت غصے کا نتیجہ ہوتی ہے، اس کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

ج: مولانا تھانویؒ کی یہ بات درست ہے لیکن غالباً اس کتاب کے مرتب کرنے والے نے پوری بات نقل نہیں کی۔ غیبت غصے کا بھی نتیجہ ہے لیکن اس کا اصل مصدر کینہ ہوتا ہے یعنی غصہ آیا، اس کا بدلہ لینے کی طاقت نہیں تھی، لہذا اسے دل میں بٹھالیا۔ یہاں غصہ کینہ بن گیا۔ پھر کسی موقع پر اس کینے کا چھپ چھپا کراٹھا کر دیا۔ یہ غیبت ہے۔ کینے کے علاوہ غیبت کی ایک وجہ حسد بھی ہو سکتی ہے۔

س: یہ مرض اتنا بڑا ہے تو اس کا علاج بھی حاصل کیا اور تفصیلی ہوگا؟

ج: بالکل نہیں۔ غیبت اور دیگر تمام اختیاری و ارادی گناہ اپنے اسباب و مضرات میں چاہے جتنے تفصیلی کیوں نہ ہوں، ان کا علاج ہمیشہ سادہ، مختصر اور دونوک ہوتا ہے۔ غیبت کا اصولی علاج تو یہی ہے کہ غیبت نہ کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا جائے۔ تاہم اس ارادے تک پہنچنے کے لیے کچھ تدابیر درکار ہیں جن میں سے کچھ مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ حسد اور غصے کا ازالہ کیا جائے۔ اس کی تدابیر ان خرابیوں کے علاج کی ذیل میں دیکھ لی جائیں۔ اس طرح غیبت کا منبع بند ہو جائے گا۔

۲۔ جس شخص کی غیبت کی ہو اس سے واضح لفظوں میں معافی طلب کی جائے اور اس معافی کی اطلاع ان لوگوں کو بھی کی جائے جن کے سامنے غیبت کی تھی۔

۳۔ جن لوگوں کی غیبت کی ہو، ان کے لیے کثرت سے دعائے خیر اور استغفار کی جائے۔ (۱) اگر ان میں سے کچھ فوت ہو چکے ہوں یا لاپتہ ہو چکے ہوں یا رسائی سے دور چلے گئے ہوں تو اس عمل میں مزید شدت کی جائے اور اللہ تعالیٰ کے آگے گڑگڑایا جائے کہ اے اللہ! قیامت کے دن ان کے دلوں کو میرے لیے نرم کر دینا۔

۴۔ غیبت سننے سے مکمل پرہیز کیا جائے اور اس میں کسی کی بھی رعایت نہ کی جائے۔ یہ بات یاد رکھیں کہ غیبت سننے والا بھی اتنا ہی گنہگار ہے جتنا غیبت کرنے والا، اور نہ صرف یہ بلکہ مناسب انداز میں غیبت کرنے والے کو نوکا بھی جائے اور اسے احساس بھی دلایا جائے کہ وہ کتنا بڑا جرم کر رہا ہے۔ اس عمل کی جزا حضور ﷺ نے جنت قرار دی ہے۔ (۲)

۵۔ کچھ مدت تک بلا ضرورت کلام نہ کرنے کی عادت ڈالی جائے۔ اس کے بعد بھی (قلت کلام کی) اس عادت کو جائز حدود میں وسعت تو دے دی جائے مگر اسے یکنخت ترک نہ کیا جائے۔

۶۔ نوافل اور تلاوت کی پابندی، ان سے طبیعت کی ٹیڑھ درست ہوتی ہے اور گناہوں کی رغبت کم ہوتی ہے۔

۷۔ اچھے لوگوں کی صحبت اختیار کی جائے۔

۸۔ اگر کبھی بلا ارادہ غیبت سرزد ہو جائے تو معافی وغیرہ کے علاوہ اپنے اوپر کوئی مالی جرمانہ عائد کریں۔ یہ طریقہ ان شاء اللہ تمام گناہوں میں موثر ہے۔



۱۔ رواہ الطحاوی ورفحہ

۲۔ جامع الترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی الذب عن (عرض) المسلم

بہتان تراشی

حکم ربانی

— ﴿مَا يَلْفُظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ﴾ (ق: ۵۰: ۱۸)

جو لفظ وہ اپنی زبان سے نکالتا ہے اسے محفوظ کر لینے کے لئے ایک نایک مستعد نگران موجود ہوتا ہے۔

— ﴿وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ بَغَيْرِ مَا كُتِبُوا فَقَدْ

احْتَمَلُوا بُهْتَانًا وَإِثْمًا مُبِينًا﴾ (الاحزاب: ۵۸: ۳۳)

اور وہ لوگ جو مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کو بغیر تصور کے تکلیف پہنچاتے ہیں تو انہوں نے بہتان اور صریح گناہ کا بوجھ اٹھایا۔

فرمان نبوی

— ”اتَذَرُونَ مَا الْغِيْبَةُ؟ قَالُوا: اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ۔ قَالَ: ذِكْرُكَ

أَخَاكَ بِمَا يَكْهَرُهُ۔ قِيلَ: أَفَرَأَيْتَ إِنْ كَانَ فِي أَخِي مَا أَقُولُ؟ قَالَ: إِنْ كَانَ فِيهِ مَا تَقُولُ، فَقَدْ اغْتَبْتَهُ، وَإِنْ لَمْ يَكُنْ فِيهِ مَا تَقُولُ فَقَدْ بَهْتَنَهُ“ (۱)

(نبی کریم ﷺ نے پوچھا) کیا تم جانتے ہو، غیبت کیا ہے؟ صحابہؓ نے عرض

کیا، اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: اپنے بھائی کا ایسے انداز

میں ذکر کرنا جسے وہ پسند نہ کرے۔ آپؐ سے پوچھا گیا، اگر میرے بھائی میں وہ چیز

موجود ہو جس کا میں ذکر کروں؟ آپؐ نے فرمایا: اگر اس میں وہ چیز موجود ہو جس کا تو

ذکر کرے تو یقیناً تو نے اس کی غیبت کی اور اگر اس میں وہ بات نہیں ہے جو تو اس

کے بارے میں بیان کرے، تو پھر تو نے اُس پر بہتان باندھا۔

(۱) صحیح مسلم، کتاب البر، باب تحریم الغیبة

— ”مَنْ يَضْمَنْ لِي مَا بَيْنَ لَحْيَيْهِ وَمَا بَيْنَ رَجْلَيْهِ أَضْمَنْ لَهُ الْجَنَّةَ“ (۱)

جو شخص مجھے دو جبروں کے درمیان چیز (زبان) کی اور دو ٹانگوں کے درمیان چیز (شرم گاہ) کی حفاظت کی ضمانت دے تو میں اس کے لئے جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔

س: بہتان کسے کہتے ہیں؟

ج: بہتان کی جامع و مانع تعریف جو ایک صحیح حدیث سے ثابت ہے، یہ ہے کہ کسی شخص میں وہ عیب دیکھنا اور اسے مشہور کرنا جو اس شخص میں نہیں پایا جاتا یعنی جھوٹا عیب لگانا۔ (۲) اس کو بھی غیبت اور چغلی وغیرہ کے خاندان کا ایک مرض سمجھنا چاہیے۔ ان گناہوں کا محرک ایک ہی ہے یعنی کسی مسلمان بلکہ کسی انسان کو نقصان پہنچانے کی خواہش۔

س: اس کا علاج کیا ہے؟

ج: اس کے علاج میں عموماً وہی چیزیں کارگر ہیں جو غیبت کے علاج میں تجویز کی گئی ہیں، تاہم ایک چیز ایسی ہے جس کو اختیار کرنا اس کے ازالے کے لیے ضروری ہے اور وہ ہے سزا۔ بہتان کا مرض سزا اور رسوائی کے بغیر ختم نہیں ہو سکتا۔ یعنی بہتان کی بیماری میں مبتلا شخص اگر دل سے اپنی اصلاح چاہتا ہے تو اسے ایک تو متاثرہ فریق سے معافی مانگنے کے ساتھ ساتھ خود کو بدلے کے لیے پیش کرنا چاہیے اور دوسرے اپنی غلطی اور اس سے توبہ کو شہرت دینی چاہیے۔ ان دو باتوں پر عمل کیے بغیر بہتان طرازی کا علاج مشکل ہے۔

(۱) صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب حفظ اللسان

(۲) صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب تحریم الغیبة

ایک اصول ذہن میں رکھنا چاہیے کہ حقوق اللہ میں ہونے والی کوتاہیاں پوشیدہ رکھی جائیں تو بہتر ہیں، لیکن حقوق العباد کے معاملے میں ہونے والی بعض اقسام کی غلطیوں کو اپنے تعارف کا ایک حصہ بنانا چاہیے تاکہ ان سے ندامت بھی حاصل ہو اور توبہ پہنچنی قائم رہنے کی بنیاد پیدا ہو جائے۔

س: حقوق العباد میں ہونے والی غلطیوں کو شہرت دینے کا مطلب کیا ہے؟ بعض لوگ یہ بھی سمجھ سکتے ہیں کہ اپنی غلطی کی پوری تفصیل بیان کی جائے۔ اس طرح کئی مزید خرابیاں پیدا ہو سکتی ہیں مثلاً ایک زانی یہ بتانے لگے کہ میں نے فلاں فلاں کے ساتھ اس فعل فتنج کا ارتکاب کیا ہے تو کیا اس سے دوسرے فریق کی حرمت مجروح نہیں ہوگی؟ اس طرح کی اور بھی کئی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ لہذا اس امر کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اس اصول کی ایسی وضاحت کر دی جائے جس سے اس طرح کی غلطی کا امکان نہ رہے۔

ج: بہت اچھا سوال ہے۔ اس اصول میں یہ بات محذوف ہے کہ دوسروں کی ایذا کا کوئی سامان نہ کیا جائے۔ حقوق العباد کا یہی بنیادی مطلب ہے۔ آپ کے اندیشے کو حقیقی سمجھتے ہوئے ہم یہ وضاحت کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ جن گناہوں کے اشتہار و اعلان سے متاثرین پر حرف آتا ہو، ان کا اخفا ضروری ہے۔ جن گناہوں کے ارتکاب سے کسی کی نیک نامی مجروح ہوئی ہو، اعلان صرف ان کا درکار ہے۔

دوسری بات یہ ملحوظ رہنی چاہیے کہ بعض گناہوں کا تذکرہ ایک طرح کی لذت اندوزی اور فخر کا سبب بھی بن سکتا ہے لہذا اظہار گناہ گاری میں گناہ کی جزئیات بیان کرنے سے بچنا چاہیے۔

چغلی (نمیمہ)

حکم ربانی

— ﴿وَلَا تُطْعُ كُلَّ خَلَافٍ مَّهِينٍ ۝ هَمَّازٍ مَّشَاءٍ بَنِيمٍ﴾ (القلم ۶۸: ۱۰، ۱۱)
آپ کسی ایسے شخص کا کہنا نہ مانیں جو بہت قسمیں کھانے والا ہو، بے وقعت ہو،
طعنے دینے والا ہو اور چغلی لگاتا پھرتا ہو۔

﴿يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ أَلْسِنَتُهُمْ وَأَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾
(النور ۲۴/۲۴)

اس دن جب ان کے خلاف خود ان کی اپنی زبانیں، اپنے ہاتھ اور پاؤں گواہی
دیں گے کہ وہ یہ کام کرتے تھے۔

فرمان نبوی

— ”لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ نَمَامٌ“ (۱)

چغل خور جنت سے محروم رہے گا۔

— ”خِيَارُ عِبَادِ اللَّهِ الَّذِينَ إِذَا رَأَوْا ذِكْرَ اللَّهِ وَشَرَارُ عِبَادِ اللَّهِ الْمَشَاوُنَ

بِالنَّمِيمَةِ الْمُفْرِقُونَ بَيْنَ الْأَحِبَّةِ الْبَاغُونَ الْبَرَاءَ الْغَنَتَ“ (۲)

اللہ کے بہترین بندے وہ ہیں جن کو دیکھ کر اللہ یاد آئے، اور بدترین بندے وہ
ہیں جو چغلیاں کھانے والے اور دوستوں میں جدائی ڈالنے والے ہیں۔ اور جو اس
کے طالب اور ساعی رہتے ہیں کہ اللہ کے پاک دامن بندوں کو کسی گناہ میں ملوث
یا کسی مصیبت اور پریشانی میں مبتلا کریں۔

س: چغلی کسے کہتے ہیں؟

ج: چغلی، جسے لگائی بجھائی بھی کہا جاتا ہے، ایک زمانہ مرض تھا جو رفتہ رفتہ مردوں میں

(۱) صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان غلط تحریم النمیمہ

(۲) مسند احمد والبیہقی فی شعب الایمان

بھی سرایت کر گیا ہے۔ اس کا مطلب ہے ایک کی بات دوسرے کو پہنچانا تاکہ ان میں جھگڑا ہو جائے۔

س: چغلی کے نقصانات کیا ہیں؟

ج: چغلی سے ہونے والے نقصانات کی فہرست پیش کرنے سے پہلے چغلی اور اس سے ملتے جلتے گناہوں کے ایک بنیادی سبب کی وضاحت کرنا ضروری محسوس ہوتا ہے۔ وہ سبب ہے فساد معاشرت، یعنی شریعت نے معاشرت کے لیے کچھ اصول عطا فرمائے ہیں تاکہ ہم مطلوبہ سطح تک دین دار بننے کے لیے ایک پورے انسانی ماحول کی کمک بھی حاصل کر سکیں۔ اور سچی بات یہ ہے کہ دین کے بعض انتہائی بڑے فضائل محض دینی ماحول کی برکت سے نصیب ہوتے ہیں۔ ماحول میں فساد ہو تو آدمی چاہے لاکھ مجاہدہ کرے، ان فضائل کو پوری طرح سے حاصل نہیں کر سکتا۔ جب سے ہم نے دین کے معاشرتی اصولوں سے گریز کی راہ اختیار کی ہے، ہماری پوری نفسیات احکامِ الہیہ اور ارشاداتِ نبوی ﷺ کا تاثر قبول کرنے کی صلاحیت بڑی حد تک کھو بیٹھی ہے۔ اس فساد معاشرت کا بہت بڑا سبب بے پردگی اور مردوں عورتوں کا بے قید میل جول ہے۔ اس کا ایک خمیازہ تو ہم واضح طور پر بھگت رہے ہیں کہ اب مردوں میں بھی وہ خرابیاں در آئی ہیں جو اچھے وقتوں میں ایک خاص قسم کی عورتوں سے مخصوص تھیں، مثلاً زبان درازی، حب مال، آرام طلبی، چغلی وغیرہ۔

جولوگ انسانی معاشرت کے اصول تشکیل کا علم رکھتے ہیں وہ بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ عورتوں اور مردوں کے ذہنی، قلبی اور نفسیاتی خصائص کا باہمی امتیاز اگر قائم نہ رہے تو خود انسانیت اپنی روح میں مرجھانے لگتی ہے اور وہ اصول نموکمزور پڑ جاتا ہے جو نوٹِ انسانی کی تہذیبی، تاریخی اور نفسیاتی پیش رفت کی بنیاد ہے۔ کیونکہ ہر شرعی قانون،

قانون فطرت بھی ہے لہذا مرد و زن کو جدار کھنے والی آڑ کو ہٹا کر ہم نے اپنے دین کا نقصان تو کیا ہی ہے، خالص انسانی سطح پر بھی اپنے جواز کو کمزور کر لیا ہے۔ بہر حال اب ان نقصانات کی طرف آتے ہیں جو چغلی کی عادت سے پیدا ہوتے ہیں:

۱۔ چغلی کا مریض نفسیاتی اعتبار سے ایسا بن جاتا ہے کہ وہ بعض ایسی چیزوں کی طرف اپنی رغبت کنٹرول نہیں کر سکتا جو خلاف شریعت ہیں، مثلاً عورتوں کی صحبت، میب جوئی، فضول قصے کہانیوں کی مجالس وغیرہ

۲۔ چغلی سے مردوں میں ایک طرح کی نسائیت پیدا ہو جاتی ہے جو ان کی بنیادی ساخت سے ناموافق ہونے کی وجہ سے ان کے اندر بعض ذہنی اور نفسی پیچیدگیاں پیدا کرتی ہے۔

۳۔ طبیعت میں گھٹیا پن

۴۔ بزدلی اور بے جہمتی

۵۔ تجسس اور میب جوئی

۶۔ جھوٹ، غیبت اور بہتان

۷۔ اس بری عادت کا ایک بہت بڑا نقصان یہ ہے کہ اس میں مبتلا شخص چونکہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی طرف سے غفلت کا بھی مریض ہوتا ہے لہذا اس کے اندر رفتہ رفتہ وہ استعداد ہی مرجاتی ہے جو تعلق باللہ کے لیے درکار ہے۔ ویسے بھی یہ بات یاد رہنی چاہیے کہ گھٹیا باتوں میں منہمک رہنے سے ایک مزاج پیدا ہو جاتا ہے جو دین کے لیے بیزاری کا رویہ پیدا کر دیتا ہے۔ پست فطرت آدمی آسمانی تقاضے کبھی پورے نہیں کر سکتا۔ اس کے اندر یہ صلاحیت ہی مفقود ہو جاتی ہے۔

۸۔ مذاہب آخرت انبی کریم ﷺ کی حدیث ہے کہ چغلی خور ہرگز جنت میں نہ جائے گا

محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

(۱) اور دوسری جگہ فرمایا کہ اس کے ہونٹ قیامت میں لوہے کی قینچیوں سے کا۔
جائیں گے۔ (۲)

س: چغلی کی عادت کا علاج کیا ہے؟

ج: یہ مرض غیبت کی قبیل سے ہے اس لیے اس کا پورا علاج غیبت کے علاج کے ضمن میں ہی ہو جاتا ہے، لہذا اس کے علاج کے لیے اس کتاب کا وہ حصہ دیکھ لیا جائے جہاں غیبت کا علاج مذکور ہے۔



۱۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان غلط تحریم النمیمہ

۲۔ منہج بہیقی، شعب الایمان، ج ۳ ص ۵، دارالکتب العربیہ، بیروت ۱۹۹۰ء

فحش کلامی

حکم ربانی

— إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَايَ ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ
الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ ۚ (النحل: ۹۰)

اے مسلمانو! بے شک اللہ حکم دیتا ہے انصاف کا، لوگوں کے ساتھ بھلائی کا اور
رشتہ داروں کی امداد کرنے کا۔ اور وہ تمہیں روکتا ہے بے حیائی سے، بربرائی
سے اور سرکشی سے۔

— إِنَّ الَّذِينَ يَجُوبُونَ أَنْ تَشِيعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِينَ آمَنُوا لَهُمْ عَذَابٌ
الِيمٌ ۚ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۚ (النور: ۲۴)

بے شک جو یہ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں میں بے حیائی کا چرچا ہوان کے لیے دنیا
اور آخرت میں دردناک سزا ہے اور یاد رکھو کہ اللہ جانتا ہے تم نہیں جانتے۔

فرمان نبوی

— ”سباب المسلم فسوق وقتاله كفر“ (۱)

مسلمان کو گالی دینا فسق (اللہ کی حکم عدولی) اور اس کو قتل کرنا کفر ہے۔

— ”ليس المؤمن با لطفان ولا اللعان ولا الفاحش ولا البذي“ (۲)

مومن طعن و تشنیع کرتا ہے نہ لعنت اور فحش کلامی کرنے والا ہوتا ہے اور نہ

بذربان۔

(۱) صحیح بخاری، کتاب الادب، باب ما تنهى من السباب واللعن

(۲) سنن الترمذی، ابواب البر، باب ما جاء فی الملعنة

س: کیا فحش کلامی کی یہ تعریف کافی ہے کہ جو شخص ایسے الفاظ زبان پر لائے جو شریعت

تہذیب اور مروجہ اخلاق کی رو سے رکیک ہوں تو اسے فحش گوئی کہا جائے گا؟

ج: جی ہاں! یہ ایک جامع تعریف ہے۔ گالیاں بکنا، ناشائستہ مذاق کرنا، اور جن چند باتوں کو شریعت نے مخفی رکھنے کی تاکید کی ہے انہیں بلا ضرورت، محض تفریح و ضیع کے لیے کھول کر بیان کرنا، فحش گوئی ہی کے بڑے بڑے مظاہر ہیں۔

س: فحش گوئی کے نقصانات کیا ہیں؟

ج: فحش گو آدمی تمام عبادات کی برکت اور فیض سے محروم رہتا ہے خصوصاً وہ عبادات جن میں زبان کا کوئی کردار ہو۔ یعنی ایسا شخص ذکر، تلاوت وغیرہ کی طرف اول و مائل ہی نہیں ہوتا اور اگر اس کا کوئی معمولی سامیان اس میں پیدا ہو بھی جائے تو بھی وہ اس کے ابتدائی فوائد بھی حاصل نہیں کر سکتا۔ ظاہر ہے کہ اس سے بڑی یہ بد نصیبی ہوگی کہ آدمی عبادت ہی کے لائق نہ رہے۔ فحش گوئی کے معاشرتی، اخلاقی اور دینی نقصانات اتنے واضح ہیں کہ ان کی نشان دہی طوالت کا موجب ہوگی۔ مختصراً طور پر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ نبی کریم ﷺ کے قول کے مطابق زبان کی حفاظت آدمی کو جنت میں لے جاتی ہے (۱) اور اس کا غلط استعمال انسان کو جہنم تک پہنچا دیتا ہے (۲) اسی لیے آپ ﷺ نے فرمایا: اچھی بات کرو ورنہ خاموش رہو۔ (۳)

س: فحش گوئی کا علاج کیا ہے؟

ج: فحش گوئی کے علاج میں مندرجہ ذیل امور کو پیش نظر رکھنا چاہیے:

۱۔ اپنے سے بڑے اور نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرنا

۱۔ صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب حفظ اللسان

۲۔ جامع الترمذی، ابواب الایمان، باب ما جاء فی حرمة الصلوة

۳۔ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب من کان یومن باللہ والیوم الآخر

- ۲۔ موت کی یاد
- ۳۔ رسول کریم (ﷺ)، کسی صحابی یا اسلاف میں سے کسی بزرگ کا تذکرہ تفصیل سے پڑھنا اور اسے ذہن میں دہرانا۔
- ۴۔ زبان کو کسی مختصر ورد کا عادی بنانا
- ۵۔ بے تکلف دوستوں کو بھی آپ جناب سے مخاطب کرنے کی عادت ڈالنا
- ۶۔ نظر بد سے بچنے کی کوشش کرنا
- ۔۔ اپنے اختیار و پوری طرح کام میں لانا۔



مداہنت اور خوشامد

حکم ربانی

﴿مَا يَلْفُظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ﴾ (ق: ۵۰: ۱۸)

جو لفظ انسان اپنی زبان سے نکالتا ہے اسے محفوظ کر لینے کے لیے ایک نہ ایک مستعد نگران (فرشتہ) موجود ہوتا ہے۔

﴿وَلَا تُلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ﴾ (البقرہ: ۲: ۴۲)

اور حق کو باطل کے ساتھ نہ ملاؤ اور سچ کو جان بوجھ کر نہ چھپاؤ۔

فرمان نبوی

— ”اذا رأيتم المداحين فاحشوا في وجوههم التراب“ (۱)

جب تم خوشامدیوں کو دیکھو تو ان کے چہروں پر مٹی ڈالو۔

— ”عن ابی بکرہؓ، قال: ائنی رجل“ علی رجل عند النبیؐ، فقال:

ویلک قطععت عنک اخیک ”ثلاثاً“ من کان منکم مادحاً لامحاله

فلیقل احسب فلاناً، واللہ حسبیہ“ ان کان یری انه کذلک ولا

یزکی علی اللہ احداً.....“ (۲)

حضرت ابی بکرؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی مجلس میں ایک صاحب نے

دوسرے کی تعریف کی تو آپؐ نے (تین دفعہ) فرمایا: کہ تم نے تو اسے ہلاک کر

دیا۔ پھر فرمایا کہ اگر تمہیں کسی کی تعریف کرنا ہی ہو اور وہ حقیقتاً اس تعریف کا مستحق ہو

تو یوں کہو کہ فلاں کو میں ایسا سمجھتا ہوں اور حقیقت سے تو اللہ ہی واقف ہے۔

(۱) صحیح مسلم، کتاب الزہد، باب انہی عن المدح اذا کان فیہ افراط

(۲) صحیح مسلم، کتاب الزہد، باب انہی عن المدح اذا کان فیہ افراط

س: کیا مد اہنت اور خوشامد میں کوئی فرق ہے؟

ج: مد اہنت اور خوشامد ایک ہی مزاج کے مظاہر ہیں تاہم ان کی تعریف میں ایک فرق ہے۔ اس فرق کے فہم کے لیے پہلے ایک بات سمجھ لیں کہ مد اہنت کل ہے اور خوشامد اس کا ایک جزو۔ خوشامد اپنے کسی دنیاوی مفاد کو حاصل کرنے کے لیے کسی باختیار شخص کی جھوٹی تعریف کرنے کو کہتے ہیں، جب کہ مد اہنت میں کم از کم ایک بڑی چیز زائد ہے۔ مد اہنت کرنے والا اپنے مطلب کے لوگوں کی ہاں میں ہاں ملانے کا اس قدر عادی ہو جاتا ہے کہ حق اور ناحق کی تمیز بھی کھو بیٹھتا ہے، یعنی خوشامدی آدمی جب اپنے مدوح کی ناجائز باتوں اور ناروا افعال کی بھی تائید کرنے لگے تو وہ خوشامد سے بڑھ کر مد اہنت میں داخل ہو جاتا ہے۔ گویا کسی کو جھوٹی سچی تعریفوں سے خوش کرنا خوشامد ہے تو غیر مشروط طور پر ہاں میں ہاں ملانا یہ منہ دیکھی بات کرنا مد اہنت ہے۔

س: ان دونوں خرابیوں کا بڑا محرک کیا ہے؟

ج: دنیا پرستی اور غیر اللہ کا خوف، ان خرابیوں کے بنیادی محرکات ہیں۔ یہ خرابیاں کبھی فائدہ اٹھانے کی ہوس سے پیدا ہوتی ہیں اور کبھی نقصان سے بچنے کے لیے۔ اس لیے خوشامدی اور مد اہن آدمی دنیا طلب اور بزدل ضرور ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ ایک چیز اور بھی ہے جو اس بگاڑ کا سبب بھی کہلا سکتی ہے اور نتیجہ بھی، اور وہ ہے بے حمیت۔ یعنی ان خرابیوں میں مبتلا آدمی غیرت و حمیت سے بھی محروم ہوتا ہے یا بالآخر ہو جاتا ہے۔

س: ان کے نقصانات کیا ہیں؟

ج: چند بڑی خرابیوں کا ذکر تو اوپر آچکا ہے۔ باقی کچھ یوں ہیں:

- ۱۔ جھوٹ کی عادت پڑ جاتی ہے
- ۲۔ ریا اور نفاق ایسی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں
- ۳۔ اللہ سے تعلق مجموعی طور پر بے معنی اور کمزور ہو جاتا ہے
- ۴۔ دین کا مطلوبہ معیار شخصیت بالکل اجنبی بن کر رہ جاتا ہے اور آدمی اسے پسند یا طلب کرنے کے قابل بھی نہیں رہتا۔
- ۵۔ عیاری اور مکاری
- ۶۔ دل سخت ہو جاتا ہے
- ۷۔ حق اور خیر کی کشش باقی نہیں رہتی
- ۸۔ دینی شخصیات خصوصاً رسول اکرم ﷺ سے محبت کی حقیقی بنیاد غائب ہو جاتی ہے۔
- ۹۔ اللہ کا خوف دل سے رخصت ہو جاتا ہے
- ۱۰۔ ہمت کی پستی اور طبیعت کی گراوٹ آگھیرتی ہے
- ۱۱۔ خوشامدی آدمی کہیں بھی قابل عزت نہیں رہتا، حتیٰ کہ گھر میں بھی۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ کسی کی تعریف میں مبالغہ شیطانی فعل ہے (۱) اور چونکہ خوشامد مدوح کو فتنہ میں ڈالنے کا شدید احتمال رکھتی ہے اس لیے ایک آدمی نے جب آنحضرت ﷺ کی مجلس میں ایک دوسرے آدمی کی تعریف میں مبالغہ کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تو نے اسے ذبح کر دیا۔ (۲) اور اسی وجہ سے صحابہ کرام کا یہ طریقہ تھا کہ وہ حسب فرمان نبوی ﷺ خوشامدی کے منہ پر سچ مچ مٹی ڈال دیا کرتے تھے، جیسا کہ کتب حدیث میں آتا ہے کہ ایک صاحب نے خلیفہ ثالث حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تعریف ان کے منہ پر کی تو حضرت مقداد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کے منہ پر مٹی ڈال دی اور حضرت

۱۔ سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فی کرہیۃ التمداح

۲۔ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب ما یکرہ من التمداح

عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پوچھنے پر بتایا کہ یہ رسول اکرم ﷺ کا حکم ہے۔ (۱)
س: ان کا علاج کیا ہے؟

ج: خوشامد اور مدائنت کا شمار ان امراض میں ہوتا ہے جن کا مریض علاج کی ضرورت یا رغبت سرے سے محسوس نہیں کرتا لہذا اس کا علاج مریض کو نہیں بلکہ اس سے تعلق رکھنے والے خیر خواہ لوگوں کو بتایا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل چیزیں ان شاء اللہ مفید اور موثر ہو سکتی ہیں:

۱۔ ایسے آدمی میں عزت نفس کا شعور اور احساس ابھارنے کی مسلسل کوشش کی جائے۔ یہ کوشش کبھی اس کو تعظیم دے کر کی جائے اور کبھی غیرت دلا کر۔ آغاز میں اس کے سوئے ہوئے جذبات کو بیدار کرنے کی تدبیر کرنی چاہیے تاکہ اس کے اندر وہ جوش پیدا ہو جائے جو بہت بنیادی نوعیت کے فیصلے کرنے پر اکساتا ہے۔ اس کے بعد اسے یہ باور کرانا چاہیے کہ خود تمہارے اندر ایسے بہت سے اوصاف ہیں جنہیں بزوئے کار لا کر تم دوسروں کے لیے انسانی خوبیوں اور کامیابیوں کا ایک نمونہ بن سکتے ہو۔ ان دونوں پہلوؤں سے آگے بڑھنے کے لیے جو عملی صورتیں درکار ہوں گی وہ چونکہ انفرادی ہیں لہذا ان کی تفصیل میں نہیں جایا جاسکتا۔ آدمی اور حالات کو دیکھ کر کوئی مناسب طریقہ اختیار کیا جاسکتا ہے۔

۲۔ اس کے سامنے ان عظیم شخصیات کا زیادہ سے زیادہ تذکرہ کرنا چاہیے جو دنیاوی اور ذاتی مفادات سے بلند ہو کر کامیابیوں اور کامرانیوں کی انتہا پر پہنچے ہوں۔ ان میں بھی وہ شخصیات زیادہ کارگر رہیں گی، جن میں غیرت، بہادری اور غربت شدت سے پائی جاتی ہوں۔

۱۔ صحیح مسلم، کتب الزہد، باب انہی عن المذبح

۳۔ خوشامدی آدمی عام طور پر گفتگو میں تیز ہوتا ہے، اگر ایسا ہو تو اس شخص سے فرمائش کرنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی شان، رسول اللہ ﷺ کی شان اور معروف صحابہؓ کی عظمت بیان کرے۔ اگر وہ اس طرف آجائے تو شروع میں اس کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔ پھر دو چار مرتبہ کے بعد اس کی توجہ اس طرف مبذول کرائی جاسکتی ہے کہ ان تقریروں کی کوئی جھلک خود اس کی ذات میں کیوں نہیں آتی؟ اس طرح ایک مثبت اور محرک عمل ندامت پیدا ہو سکتی ہے۔

۴۔ اس آدمی کو جہاں بھی خوشامد میں مشغول دیکھیں سختی سے ٹوک دیں۔ اس کا بہترین علاج اس حدیث مبارکہ میں بیان کر دیا گیا ہے جس کی رو سے منہ پر تعریف کرنے والے پر خاک ڈالنی چاہیے (۱)۔ خوشامد کے علاج میں یہ ایک مشکل لیکن انتہائی موثر عمل ہے۔

وعدہ خلافی

حکم ربانی

— ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَوْفُوا بِالْعُقُودِ﴾ (المائدہ ۱:۵)

اے ایمان والو! عہدوں کو پورا کرو۔

— ﴿وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا﴾ (۳۴:۱۷)

عہد کو پورا کرو، اس لئے کہ عہد کی بابت پوچھا جائے گا۔

فرمان نبوی

— ”أَرْبَعٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ، كَانَ مُنَافِقًا خَالِصًا، وَمَنْ كَانَتْ فِيهِ خَصْلَةٌ

مِنْهُنَّ، كَانَ فِيهِ خَصْلَةٌ مِنَ النِّفَاقِ حَتَّى يَدْعَوْهَا: إِذَا أُوتِيَ خَانَ، وَإِذَا

حَدَّثَ كَذَبَ، وَإِذَا عَاهَدَ غَدَرَ، وَإِذَا خَاصَمَ فَجَرَ“ (۱)

چار خصائیں ہیں، جس میں وہ ہوں گی وہ خالص منافق ہوگا اور جس میں ان

میں سے کوئی ایک خصلت ہوگی تو اس میں نفاق کی ایک خصلت ہوگی، یہاں تک کہ

وہ اسے چھوڑ دے۔ جب اس کے پاس امانت رکھوائی جائے تو خیانت کرے،

جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب کوئی عہد کرے تو بے وفائی کرے اور جب

کسی سے جھگڑے تو خوب لڑے اور بدزبانی کرے۔

— ”لِكُلِّ غَادِرٍ لِّوَاءٍ“ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يُقَالُ هَذِهِ غَدْرَةُ فُلَانٍ“ (۲)

قیامت والے دن ہر عہد توڑنے والے کے لئے ایک جھنڈا ہوگا، کہا جائے گا

کہ یہ فلان کی بد عہدی کا جھنڈا (نشان) ہے۔

(۱) صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب علامات المنافق

(۲) صحیح بخاری، کتاب الجہاد، باب إثم الغادر

س: وعدہ خلافی کی تعریف کیا ہے؟

ج: وعدہ خلافی کی ضروری تعریف عام طور پر لوگوں کو معلوم ہی ہے، تاہم سہولت کے لیے ہم اس کمزوری کے دو حصے کر سکتے ہیں: ۱۔ وعدہ کرتے وقت ہی اسے پورا کرنے کی نیت نہ ہونا۔ ۲۔ وعدہ کرتے وقت اسے پورا کرنے کی نیت تو ہونا لیکن بغیر کسی قوی عذر کے اسے پورا کرنے کی جو کوشش ضروری ہے، اس سے دانستہ گریز یا تساہل کرنا۔

پہلی قسم دراصل دھوکا اور فریب ہے جس کا اظہار وعدہ خلافی کی صورت میں ہوتا ہے، البتہ دوسری قسم اصل وعدہ خلافی ہے جسے حدیث شریف میں نفاق کی ایک علامت فرمایا گیا ہے (۱) ہم یہاں اسی دوسری قسم تک محدود رہیں گے۔

س: جیسا کہ آپ نے کہا وعدہ خلافی کا مطلب ہر آدمی جانتا ہے لیکن غالباً اکثر اس عمل کی باریکیوں پر نظر نہیں رکھتے لہذا نتیجتاً اس میں مبتلا رہتے ہیں یا وعدہ خلافی کی ایک بے پلک تاویل پر اعتماد کر کے ان اعذار کو بھی قبول کرنے پر راضی نہیں ہوتے جن کی وجہ سے وعدے کا پورا نہ ہو سکتا وعدہ خلافی کے زمرے میں نہیں آتا۔ لہذا ضروری محسوس ہوتا ہے کہ اس مسئلے کی کچھ وضاحت کر دی جائے؟

ج: آپ کے سوال کی حدود میں رہیں تو وعدہ خلافی کا تعین مشکل ہو جائے گا کیونکہ وعدہ خلافی کی عادت میں مبتلا شخص جھوٹ اور فریب کاری کی عادت میں بھی اکثر گرفتار ہوتا ہے۔ اس لیے عادی وعدہ خلاف کے بتائے ہوئے بیشتر اعذار، **إلا ما شاء الله**، عام طور پر جھوٹ ہی ہوتے ہیں۔ اس صورت حال میں بہتر طریقہ غالباً یہ ہوگا کہ ہم وعدہ خلافی سے متعلق ایک عمومی گفتگو کر لیں جو کم از کم اس آدمی کے لیے ضرور مفید ہوگی جو کسی درجے میں اس برائی کا شکار ہے اور اس سے نکلنا

(۱) صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب علامات المنافق

ہے۔ ہمارے پیش نظر یہی آدمی ہے۔

جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا کہ وعدہ خلافی کے تین اہم اجزاء ہوتے ہیں:

۱۔ جھوٹ ۲۔ کاہلی، اور ۳۔ فریب کاری

اگر ہماری تعریف کو ملحوظ رکھا جائے تو اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ محض ایقائے عہد نہ ہونا وعدہ خلافی نہیں ہے۔ وعدہ خلافی کے لیے ضروری ہے کہ وہ کسی قوی عذر کے بغیر ہو۔ وہ عذر جو عہد پرانہ کر سکنے کو وعدہ خلافی کے حکم میں نہیں آنے دیتے اپنی نوعیت کے اعتبار سے تین طرح کے ہوتے ہیں:

۱۔ ناتجربہ کاری

۲۔ نسیان

۳۔ ایسے خارجی موانع جنہیں عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔

س: عذر کی ان تین قسموں کی مزید وضاحت کر دی جائے تو مناسب ہوگا؟

ج: ۱۔ ناتجربہ کاری یہ ہے کہ ایک آدمی کو اس کام کے بارے میں زیادہ پتہ نہیں تھا جس کی تکمیل کا اس نے وعدہ کر لیا تاہم اس عذر کی بنیاد پر آدمی وعدہ خلافی کے الزام سے تونج جائے گا لیکن غیر ذمہ داری کا مرتکب ضرور قرار پائے گا جو اپنی جگہ ایک نقص ہے۔

۲۔ نسیان: اس کا عذر ہونا ظاہر ہے اور اسے شریعت نے بڑے بڑے دینی کاموں میں بھی عذر مانا ہے، جیسے روزے میں بھول کر کھاپی لینا۔ (۱)

۳۔ خارجی موانع: عام طور پر تسلیم شدہ خارجی موانع بہت سے ہیں مثلاً وعدہ کرنے والے کا سخت بیمار ہو جانا، کسی بڑی مصیبت میں گرفتار ہو جانا، ایقائے عہد کے لیے

(۱) صحیح بخاری، کتاب الصوم، باب الصائم اذا اكل أو شرب ناسيا

۳۔ جو صلاحیتیں درکار ہیں، ان میں سے کچھ یا کسی ایک کا فقدان ہو جاتا، ناگہانی حالات اور موسم وغیرہ۔ ان میں سے کسی ایک کی موجودگی میں خود ایسے عہدہ کا منتظر شخص بھی وعدہ خلافی کا شکوہ نہیں کرتا۔

س: وعدہ خلافی کے اسباب کیا ہیں؟

ج: — خوشامد

— لا پرواہی

— ڈسپلن کی کمی

— بہانے بازی

— طبیعت میں جھوٹ کا رجحان

— خود غرضی

— دوسرے سے وقتی طور پر جان چھڑانے کی خواہش

— حمیت کی کمی

— دوسرے کو اہمیت نہ دینا

— کسل

— حسن معاشرت سے محرومی وغیرہ۔

اس کی ضروری تفصیل یہ ہے کہ یہ سمجھا جائے کہ آدمی وعدہ خلافی کیوں کرتا ہے؟

اس کے کئی جواب ہو سکتے ہیں لیکن ان میں کچھ چیزیں مشترک ہوں گی مثلاً کسی آدمی سے اپنا مطلب نکالنے کے لیے اس کے کسی کام کو پورا کرنے کا وعدہ کر لینا، محض چالیلوسی میں بلاسوچے سمجھے کوئی ذمہ داری اپنے سر لینا یا دوسروں کی نظر میں اچھا بننے کے لیے ان کی ہر فرمائش پر ہاں کر لینا یا جس کام کا کوئی تجربہ نہ ہو اسے انجام دینے کی حامی بھر لینا یا کسی کو

نانے کے لیے اسے کوئی امید دلادینا یا کاہلی وغیرہ۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو وعدہ خلافی کی تمام صورتوں میں ان اسباب میں سے کچھ ضرور پائے جائیں گے جو اوپر بتائے گئے ہیں۔ ہمیں احساس ہے کہ ان میں سے ایک آدھ سبب پہلی نظر میں نامانوس لگے گا لیکن تھوڑا سا تدبر کر کے اس کا تعلق سمجھ میں آسکتا ہے مثلاً بے حیثیتی کو وعدہ خلافی سے یہ نسبت ہے کہ ایک حیثیت والا آدمی اپنے اوپر وعدہ خلافی کا داغ لگوانا ہرگز پسند نہیں کرے گا لہذا وہ وعدہ سوچ سمجھ کر کرے گا اور پھر اسے پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے جان لڑا دے گا۔

س: دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض ایسے حضرات جو قابل رشک دینی فضائل کے حامل ہوتے ہیں وہ بھی اس بیماری میں مبتلا ہیں، اس کی کیا وجہ ہے؟

ج: بد قسمتی سے آپ کا مشاہدہ ٹھیک ہے۔ ہمارے یہاں دین، عبادات یا عبادات سے ظاہری نسبت رکھنے والی چیزوں تک محدود کر دیا گیا ہے جب کہ دین میں پھیلاؤ کی جو قوت اور انسانی زندگی کا احاطہ کرنے کی جو طاقت پائی جاتی ہے، وہ اپنی روح میں اجتماعی اور معاشرتی ہے۔ جن اصحاب فضیلت کا آپ نے حوالہ دیا ہے ان کی فضیلت کی، اگر سب نہیں تو اکثر و بیشتر بنیادیں، کثرت ذکر و عبادت یا حسن اخلاق اور رقیق القلبی کی چند مسلمہ صورتوں پر استوار ہیں۔ سچی بات تو یہی ہے کہ ایسی دینداری، جس کی سچائی اور خلاص سے ہمیں انکار نہیں، اگر وعدہ خلافی جیسی نہایت خطرناک خرابی پر حاوی نہیں آسکتی تو اس کا سیدھا سا مطلب یہی ہے کہ یا تو ان حضرات کا تصور دین محدود ہے یا پھر ان کی دینداری میں ایک بڑا نقص تاحال موجود ہے۔ ویسے حسن ظن کے طور پر شاید یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس طرح کے لوگوں کی مشغولیات میں تنوع اور کثرت ہوتی ہے جس کی وجہ سے بعض ضروری

معاملات یا تو انہیں یاد نہیں رہتے یا ان کی گرفت سے نکل جاتے ہیں۔

س: وعدہ خلافی کی عادت کا علاج کیا ہے؟

ج: اس علاج کے اہم نکات یہ ہیں:

۱۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ جب تک وعدہ خلافی کی عادت پوری طرح ختم نہ

ہو جائے، آدمی کو کوئی وعدہ نہیں کرنا چاہیے۔ اس بات کو ہمیشہ ملحوظ رکھنا چاہیے۔

۲۔ وعدہ خلافی کے علاج کے دو اصول ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس کا محرک دریافت کر کے

اس کا ازالہ کیا جائے اور دوسرا یہ کہ اس پورے مزاج ہی کی اصلاح کا ذوق والا

جائے جس کے لیے وعدہ خلافی ایک طبعی چیز بن جاتی ہے۔

پہلے اصول کی روشنی میں دیکھیں تو وعدہ خلافی کا ایک عمومی محرک یہ ہے کہ معاملات

پر سے شریعت کی گرفت کمزور پڑ جائے۔ اس کے لیے پہلے درجے میں معاملات

کے بارے میں شریعت کے احکام معلوم کرنے چاہئیں اور خاص طور پر ان احکام

سے روگردانی کی جو سزا بتائی گئی ہے اسے ذہن میں دہراتے رہنا چاہیے اور تنہائی

میں اپنے تخیل کو بروئے کار لا کر ان سزاؤں کو گویا نظر کے سامنے مجسم کرنے کی

کوشش کرنی چاہئے۔ یہ مشق ان شاء اللہ نفس کی بہت سی خرابیوں میں موثر ثابت

ہوگی۔ ایک صحیح حدیث میں چونکہ وعدہ خلافی کو نفاق کی نشانیوں میں سے ایک نشانی

فرمایا گیا ہے لہذا اس سے چھٹکارا پانے کے لیے ایک بالواسطہ طریقہ یہ بھی اختیار

کیا جاسکتا ہے کہ اپنے اندر اس یقین کو تقویت دینے کی کوشش کی جائے جس کا

شریعت مطالبہ کرتی ہے۔ جیسے جیسے یہ یقین قوی ہوتا جائے گا ویسے ویسے نفاق کے

پوشیدہ امکانات بھی ختم ہوتے جائیں گے۔

یہ یقین پیدا کرنے کا بہترین ذریعہ تین اجزاء پر مشتمل ہے:

۱۔ آیات انذار پر تدبر، خواہ خود سے یا کسی عالم دین کی مدد سے

۲۔ کثرت ذکر، خصوصاً استغفار کی کثرت، اور

۳۔ لوگوں کے چھوٹے چھوٹے کام کرنا۔ چھوٹے کاموں سے مراد وہ کام

ہیں جو معاشرتی سطح پر ایک شخص کے معروف مرتبے سے کمتر ہوں۔

اللہ کے فضل سے قوی امید ہے کہ ان چیزوں کو ملحوظ رکھ کر ان پر عمل کرنے کی سعی کوشش کر کے نفس کا وہ داعیہ پوری طرح قابو میں آجائے گا جو دیگر گناہوں کے ساتھ ساتھ وعدہ خلافی پر اکساتا ہے۔

۳۔ نفس میں رذائل کی رغبت ترہیب سے اور فضائل سے غفلت ترغیب سے دور ہوتی

ہے۔ یہ نفس یا مزاج کی اصلاح کا ایک جامع قاعدہ ہے۔ وعدہ خلافی کی عادت میں مبتلا شخص کو ترہیب کے عمل سے گزرنے کی تجویز ہم اوپر دے آئے ہیں۔ اس کی حیثیت نظری تھی اب ہم ترہیب کا عملی پہلو تجویز کریں گے۔

ایک سادہ سی وعدہ خلافی میں بھی تین گناہ تو ضرور موجود ہوتے ہیں:

۱۔ جھوٹ ۲۔ کسی کا حق تلف کرنا، اور ۳۔ فرض کی ادائیگی میں کسل

اگر غور سے دیکھیں تو اس پورے مجموعے میں ایک چیز بہت واضح ہے اور وہ یہ کہ وعدہ خلافی کا مرتکب شخص حقوق العباد یا انسانی تعلق و معاشرت کے دینی اصول کو ضروری اہمیت دینے کی طرف اراداً مائل نہیں ہوتا اور جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ معاشرت کا فساد، خواہ اپنے وقوع میں کسی قدر داخلی ہی کیوں نہ ہو، سزا اور خوف کے بغیر ٹھیک نہیں ہوتا۔ اس اصول کے تحت وعدہ خلافی کے ارتکاب کے بعد خود پر ملامت اس گناہ کے کفارے اور آئندہ کے لیے اس سے بچنے کی خواہش، خود کو کسی سزا سے گزارے بغیر پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتی۔ ویسے بھی انسانی معاشرت

کے ضمن میں حقوق العباد کو مجروح کرنا، اپنی کلیت میں قابل معافی نہیں ہے۔ یعنی الفاظِ توبہ اور احساسِ ندامت اس کے کفارے کے لیے کافی نہیں۔ وقتیکہ اس نقصان کی تلافی نہ کی جائے جو دوسرے بندے کو پہنچایا گیا ہو۔ لہذا وعدہِ خلائی ہو جائے تو ضروری ہے کہ توبہ و ندامت کے ساتھ ساتھ متاثرہ فریق سے معافی بھی حاصل کی جائے خواہ اس کے لیے کتنی بھی ذلت و مشقت سے گزرنا پڑے۔ یاد رکھیں کہ نفس کی قوتوں میں تین قوتیں بنیادی ہیں:

۱۔ انانیت ۲۔ سرکشی، اور ۳۔ شہوت

ان میں سے ہر ایک اپنے دفعیے کے لیے ایک خاص طرح کی سختی اور شدت کی متقاضی ہے۔

۴۔ وعدہِ خلائی کا ایک انتہائی موثر علاج نماز باجماعت کی پابندی ہے۔ اس تجویز کو ہر گز ہلکانہ سمجھیں۔ تاثیر کے اعتبار سے غالباً اس کا درجہ سب سے اونچا ہے۔

س: وعدہِ خلائی کے نقصانات؟

ج: ۱۔ دینی اعمال میں استقامت نہیں رہتی

۲۔ اخلاص کمزور پڑ جاتا ہے اور دوسروں کی خیر خواہی کا جذبہ ماند پڑ جاتا ہے۔

۳۔ غیر ذمہ داری اور کسل کو تقویت ملتی ہے۔

۴۔ جھوٹ اور بہانے بازی کی رفتہ رفتہ عادت پڑ جاتی ہے۔

۵۔ وعدہ خلاف آدمی لوگوں کی نظر میں ہلکا اور ناقابل اعتبار ہو جاتا ہے۔

۶۔ بڑی چیزوں کی اہمیت باقی نہیں رہتی۔

بد نظری

حکم ربانی

﴿قُلْ لِلْمُؤْمِنِينَ يَغُضُّوْنَ أَبْصَارَهُمْ وَيَحْفَظُوْا أَرْوَاحَهُمْ...﴾

(النور: ۳۰)

اے نبی! آپ ﷺ مؤمن مردوں سے کہیں کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنے ستر کی حفاظت کریں۔

﴿قُلْ لِلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ أَبْصَارِهِنَّ...﴾ (النور: ۳۱)

اور اے نبی! آپ مؤمن عورتوں سے کہیں کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں۔

فرمان نبوی

— ”العينان زناهما النظر.....“ (۱)

آنکھوں کا زنا (غیر محرم کو) دیکھنا ہے۔

— ”وعن جرير رضى الله عنه قال: سألت رسول الله صلى الله

عليه وسلم عن نظر الفجأة فقال: اصرف بصرک“ (۲)

حضرت جریرؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا کہ اگر

(غیر محرم پر) اچانک نظر پڑ جائے تو (کیا کروں؟) آپؐ نے فرمایا اپنی نظر پھیر لو۔

(۱) صحیح بخاری، کتاب الاستئذان، باب زنی الجوارح

(۲) سنن ابی داؤد، کتاب النکاح، باب فیما یومر بہ من غض البصر

س: بد نظری کیا ہے؟

ج: بد نظری کے دو پہلو ہیں: ایک نامحرم کو رغبت اور شہوت کی نظر سے دیکھنا۔ دوسرے نامحرم پر بلا ضرورت قصدِ اُدوسری نگاہ ڈالنا۔

س: بد نظری کے اسباب کیا ہیں؟

ج: بد نظری ایک ایسا مرض ہے جس میں خاصی تعداد میں وہ لوگ بھی مبتلا ہیں جو بظاہر دیندار ہیں۔ اس کا شمار ان گناہوں میں ہوتا ہے جو طبیعت میں دینداری کے فقدان اور کمی سے پیدا ہوتے ہیں۔ بد نظری چونکہ چوری کی طرح کا ایک نمل ہے جس میں آدمی یہ سمجھتا ہے کہ اس کا پتہ دوسروں کو نہیں چلے گا لہذا اس کا بھرم کھنسنے کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ یہ دو وجوہ، یعنی طبیعت میں دینداری کا نہ ہونا اور ریا کاری، خود اپنی جگہ بدنگاہی سے بھی بڑی خرابیاں ہیں۔

ان کے علاوہ بعض ضمنی اسباب بھی ہیں مثلاً بری صحبت، مخلوط تعلیم، گھر میں بے پردگی کا ماحول، سیر و تفریح اور بازاروں میں پھرنے کی عادت، ٹی وی ڈراموں اور فلموں کی طرف رغبت اور ایسے لٹریچر کا ذوق جس میں عورتوں کی تصویریں وغیرہ ہوں۔

س: بد نظری کے مضر اثرات کیا ہیں؟

ج: اس کے مضر اثرات حسب ذیل ہیں:

۱۔ بے حیائی اور بے حمیتی

۲۔ ریا کاری

۳۔ نفس میں پاکیزگی کے امکان کا خاتمہ

۴۔ ایسے دینی اعمال میں خرابی جن میں ذہن بھی شامل ہوتا ہے۔

۵۔ بد نظری سے آدمی کے اندر اور باہر کا ماحول بگڑ جاتا ہے یعنی نہ باطن مسلمان کا باطن

رہتا ہے اور نہ معاشرت اس قابل رہتی ہے کہ اس میں اسلامی زندگی کے تقاضوں کو سہولت سے پورا کیا جاسکے گویا یہ ہماری اندرونی حالت اور معاشرت دونوں میں دینی خرابی پیدا کرنے کا ایک بہت بڑا سبب ہے۔

۶۔ اس کی وجہ سے عورتوں کو وہ آزادی دینا محال ہو جاتا ہے جو خود دین نے انہیں دی ہے۔

۷۔ خیانت کی عادت

س: بد نظری کا علاج کیا ہے؟

ج: اس کے معاملے میں سب سے پہلے وہ تدابیر اختیار کرنی چاہئیں جن سے طبیعت میں دین کی قبولیت پیدا ہو اور ریا کا سد باب ہو۔ طبیعت میں دین کی قبولیت کے لیے مندرجہ ذیل چیزیں مفید ہیں:

— دین دار، منکسر المزاج اور آپس میں محبت رکھنے والوں کی صحبت

— کسی شفیق اور ذہین مربی سے نسبت

— اچھی قرأت کی سماعت

— استغفار اور درود شریف کی کثرت، پورے دھیان کے ساتھ۔

— نفل نماز میں آنکھ بند کر لینے سے بھی طبیعت متاثر ہوتی ہے یہ عمل کبھی کبھی کر لینا

چاہیے۔

ریا کا جو علاج اس کتاب میں بتایا گیا ہے، بد نظری کے معاملے میں اس سے بھی مدد ملی جائے۔ عمومی معاملے کے طور پر مندرجہ امور کو اختیار کرنے کی کوشش کرنی چاہیے:

۱۔ بد نظری کے مواقع سے بچنا، چاہے اس سے کوئی دینی فضیلت یا دنیاوی ضرورت ہی کیوں نہ متاثر ہوتی ہو۔

۲۔ زیادہ تر وقت اچھے لوگوں کے ساتھ بسر کرنا خاص طور پر باہر نکلتے وقت یہ کوشش کرنی چاہیے کہ کچھ اچھے اور بڑے لوگوں کی معیت میسر ہو۔

۳۔ اس خواہش کا غلبہ ہو تو تکلف سے یہ خیال لانا چاہیے کہ جس نظر سے میں دوسروں کو دیکھ رہا ہوں اس نظر سے میری ماں، بہن اور بیٹی کو دیکھا جائے تو میرا کیا حال ہوگا؟

۴۔ عورت کی تصویر کو دیکھنا بھی بدنظری کے حکم میں داخل ہے۔ اس سے شدت سے پرہیز کرنا چاہیے اور اس وہم میں نہیں رہنا چاہیے کہ محض ایک سادہ سی تصویر کا نفس پر کیا اثر ہو سکتا ہے۔ یہ تمام تصویریں ذہن میں جمع ہو کر آدمی کے اندر ایسی خرابیاں پیدا کر دیتی ہیں کہ جن کا احساس اور ادراک بہت بعد میں ہوتا ہے۔ سچا مسلمان وہ ہے کہ جس کا تخیل اور حافظہ بھی ناپسندیدہ چیزوں سے پاک ہو۔ یہ بے احتیاطی اس پاکیزگی کو قائم نہیں ہونے دیتی۔

۵۔ موت کی یاد اور دوزخ کا تصور

۶۔ وہ ارشاد ربانی ذہن میں رکھنا چاہیے جس میں اللہ تعالیٰ نے بدنظری کو خیانت سے تعبیر کیا ہے اور شاہانہ تہدید کے انداز میں فرمایا ہے کہ تمہاری بدنظری مجھ سے چھپی ہوئی نہیں ہے (المومن ۱۹: ۴۰) اور نبی کریم ﷺ کا وہ قول مبارک بھی سامنے رکھنا چاہیے جس میں آپ ﷺ نے بدنظری کو آنکھ کا زنا قرار دیا ہے (۱) العیاذ باللہ من ذلک۔

طول امل

حکم ربّانی

﴿ذُرُّهُمْ يَأْكُلُوا وَيَتَمَتَّعُوا وَيُلْهِهِمُ الْأَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ﴾ (الحجر ۱۵:۳)

اے نبی! آپ ﷺ ان کو چھوڑ دیں کہ وہ کھائیں پیئیں، عیش کریں اور خیالی امیدوں میں مگن رہیں۔ آئندہ انہیں اپنا انجام معلوم ہو جائے گا۔

﴿الْهَلْكُمْ التَّكَاثُرُ ۚ حَتَّى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ﴾ (الحکاثر ۱۰۲:۲)

لوگو! تمہیں بہت زیادہ حرص نے غافل کر دیا ہے۔ یہاں تک کہ تم قبروں میں جا پہنچتے ہو۔

فرمان نبوی

— ”لا يزال قلب الكبير شاباً في اثنين في حب الدنيا و طول الامل“ (۱)

بوڑھے آدمی کا دل دو چیزوں کے بارے میں ہمیشہ جوان رہتا ہے ایک دنیا کی محبت اور دوسرے لمبی لمبی تمنائیں۔

”عن عبد الله قال: خط النبي ﷺ خطاً مربعاً و خط خطافى

الوسط خارجاً منه، و خط خططاً صغاراً إلى هذا الذى فى الوسط من

جانبه الذى فى الوسط، فقال: هذا الانسان و هذا اجل محيط به،

و هذا الذى هو خارج امله، و هذه الخطط الصغار الاعراض، فان

اخطأه هذا نهشه هذا، و ان اخطأه هذا نهشه هذا“ (۲)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے زمین پر ایک مربع

شکل بنائی۔ پھر اس کے وسط میں ایک خط کھینچا جو اس سے باہر نکل رہا تھا اور مربع

(۱) صحیح مسلم، کتاب الزکاة، باب کراہۃ الحرص علی الدنیا

(۲) صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب فی الامل و طولہ

کے وسط میں جو خط تھا اس سے باہر نکلتے ہوئے متعدد چھوٹے چھوٹے خط کھینچے اور فرمایا: یہ (مربع گویا) انسان (کا مسکن) ہے اور مربع کا بیرونی خط گویا موت ہے جو اس کو گھیرے ہوئے ہے اور جو خط باہر نکل رہا ہے وہ اس کی آرزوئیں اور تمنائیں ہیں اور یہ جو چھوٹے چھوٹے خط ہیں، یہ اس کے وہ تجاوزات ہیں جو وہ راہِ حق سے ہٹ کر کرتا ہے۔

س: طولِ اہل سے کیا مراد ہے؟

ج: طولِ اہل یعنی لمبی لمبی امیدیں باندھنا اور ایسی خواہشات رکھنا جن کی تکمیل کے لیے لمبا عرصہ درکار ہے۔

س: آپ کی تعریف سے یہ واضح نہیں ہوا کہ طولِ اہل دنیاوی معاملات میں ہوتا ہے یا دینی امور میں بھی اس کا دخل ہو سکتا ہے؟

ج: طولِ اہل دین میں بھی ہوتا ہے اور دنیا میں بھی۔ دین میں طولِ اہل کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص ساری دنیا میں اسلامی نظام کے نفاذ اور غلبے کے خواب دیکھتا رہتا ہے لیکن خود اپنی ذات پر بالکل سامنے کے احکام کو بھی نافذ نہیں ہونے دیتا اور اسلام کے ان مطالبات پر تو اس کا دھیان نہیں رہتا جو گھٹے دو گھٹے میں ممکن العمل ہیں مگر منصوبے وہ لمبی مدت کے بناتا ہے جن کی کامیابی کے ضروری اسباب اسے میسر نہیں ہوتے۔ یہ شخص گویا دین سے کوئی سچی اور سنجیدہ وابستگی نہیں رکھتا بلکہ اپنے دینی نقائص کو خود اپنی نظر سے اوجھل رکھنے کے لیے ایسی بڑی بڑی باتیں سوچتا رہتا ہے جو اگر پوری ہو جائیں تو دین کے عظیم ترین فضائل حاصل ہو سکتے ہیں۔ گویا دوسرے لفظوں میں دینی معاملات میں طولِ اہل اپنی بے عملی پر پردہ ڈالنے یا اس کی خلش سے بچنے کی ایک کوشش ہے۔

دنیا میں طول اہل یہ ہے کہ ایک آدمی ترقی اور کامیابی کے ایسے منصوبوں میں خود کو منہمک کر لیتا ہے جنہیں پورا کرنے کے لیے عمر نوح بھی کم ہو۔ یعنی اس پر دنیا کی محبت کا ایسا غلبہ ہے کہ وہ بالکل سامنے کی چیز یعنی انسانی زندگی کی محدودیت کو بھی فراموش کر دیتا ہے۔ یہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ بیشتر خرابیوں کی طرح اس خرابی کے بھی بعض نقصانات دینی ہیں اور بعض نفسیاتی۔

س: تو کیا نفسیاتی ضرر دینی ضرر نہیں ہوتا؟

ج: اگر دینی ضرر کو قانونی معنی میں یعنی آخرت کے نقصان کے معنی میں لیا جائے تو ضروری نہیں کہ ہر نفسیاتی ضرر دینی ضرر بھی ہو، کیونکہ نفسیات میں خلل پیدا کرنے والی کئی چیزیں شریعت میں عذر سمجھی جاتی ہیں اور عذر کا مضر نہ ہونا واضح ہے مثلاً پاگل پن ایک نفسیاتی خرابی تو ہے مگر قانونی نقطہ نظر سے اسے دینی خرابی نہیں کہا جاسکتا۔

س: ذرا ٹھہر کر طول اہل کے دینی اور نفسیاتی نقصانات پر کچھ روشنی ڈال دیں؟

ج: طول اہل کے دینی نقصانات:

۱۔ طول اہل کا ایک بڑا نقصان یہ ہے کہ بندے کے ذہن میں توکل، دعا، توفیق وغیرہ کا صحیح دینی تصور یا تو باقی نہیں رہتا یا اتنا بگڑ جاتا ہے کہ اسے ان چیزوں سے ادنیٰ مناسبت بھی حاصل نہیں رہتی۔ مثلاً کسی غمی آدمی کا یہ دعا کرنا کہ اللہ تعالیٰ اسے امام ابو حنیفہؒ بنادے یا کسی ناکارہ شخص کی یہ امید کہ وہ اللہ کی توفیق سے عمر بن عبدالعزیزؒ ایسا بن سکتا ہے یا کسی فاسق و فاجر کی یہ خوش فہمی کہ اللہ اسے جنت پیش کر دے گا۔ یہ سب طول اہل کی مثالیں ہیں جن سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک یا تو توکل کو مسخ کرتی ہے یا دعا اور توفیق کے تصور کو۔ اب سوچنے

کی بات یہ ہے کہ توکل، دعا اور توفیق وغیرہ تعلق باللہ کے وہ لوازم ہیں جو بندگی کی عمارت میں بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں، اگر انہی میں خرابی پیدا ہو جائے تو بقیہ عمارت کو گرنے سے کیسے روکا جاسکتا ہے؟ اس چیز کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ عام طور سے طول اہل سے بندگی کی ایک جھوٹی فضا پیدا ہوتی ہے جو بظاہر حقیقی بندگی کی فضا سے کہیں زیادہ وسیع اور پرکشش ہوتی ہے۔ اس میں مبتلا ہو کر بندہ بندگی کی حقیقی حدود سے اس طرح تجاوز کر جاتا ہے کہ اس کا فہم بھی بگڑ جاتا ہے اور ذوق بھی۔ ظاہر ہے کہ صحیح فہم اور صحیح ذوق سے محروم ہو کر دین سے تعلق کی کوئی شرط بھی پوری نہیں ہو سکتی۔

۲۔ اس سے ایک خاص طرح کا نفاق پیدا ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ آدمی کی نظر اپنی واقعی شخصیت کی بجائے مفروضہ شخصیت پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ یعنی وہ یہ نہیں دیکھتا کہ میں واقعتاً کیسا ہوں۔ بلکہ جو وہ ہونا چاہتا ہے اسے اپنی حقیقی شخصیت فرض کر لیتا ہے۔ یہ نفاق کی وہ قسم ہے جو کلیتاً قانونی نہ ہونے کے باوجود اپنے بعض مضمرات کی وجہ سے اصطلاحی نفاق سے کچھ بہت زیادہ دور نہیں ہے۔ ایسا آدمی لاشعوری اور غیر ارادی طور پر ہی سہی مگر دین کی حقانیت کا زیادہ قائل نہیں رہتا اور اس کے باوجود خود کو دین کے اعلیٰ مراتب پر دیکھتا ہے یا دیکھنا چاہتا ہے۔

۳۔ بے عملی، یعنی طول اہل کی وجہ سے طبیعت میں روزمرہ کے ضروری دینی اعمال کی طرف سے بے رغبتی بلکہ تحقیری پیدا ہو جاتی ہے کیونکہ جو شخص خواب میں بادشاہ بنا بیٹھا ہو وہ بیداری میں مزدور بننا پسند نہیں کرتا۔ اسی طرح جو لوگ بہت بڑے بڑے منصوبے بناتے رہتے ہیں وہ اپنی عملی صلاحیت اور اس کے استعمال کی طرف زیادہ مائل نہیں ہوتے۔ یہی بے رغبتی اور عدم میلان بڑھتے بڑھتے بے عملی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ویسے یہ بھی ملحوظ رہے کہ بے عملی طول اہل کا ایک بڑا

محرك بھی ہے یا یوں کہنا چاہیے کہ طول اہل بے عملی سے پیدا ہوتا ہے اور بے عملی ہی پیدا کرتا ہے۔

۴۔ خود پسندی: طول اہل کے بنیادی محرکات میں بے عملی کے ساتھ خود پسندی سرفہرست ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ طول اہل میں گرفتار شخص خود پسند نہ ہو۔

۵۔ رجوع الی اللہ یعنی توبہ سے محرومی۔ طول اہل کے مارے ہوئے آدمی میں وہ آنکھ ہی اندھی ہو جاتی ہے جو اپنے نقائص کا مشاہدہ کرواتا ہے اور بندے کو استغفار پر اکساتی ہے۔

۶۔ غور سے دیکھیں تو طول اہل ایک طرح سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ مذاق ہے۔ یعنی ادنیٰ استحقاق کے بغیر اللہ سے بڑے بڑے مطالبے کرنا اس سے مذاق نہیں تو اور کیا ہے؟

طول اہل کے نفسیاتی نقصانات:

- ۱۔ بے عملی، دنیاوی پہلو سے
- ۲۔ شعور اور ارادے کے فطری تعلق کا کمزور پڑ جانا۔ اس سے آدمی نارمل انسانوں کی فہرست میں شامل رہنے کے قابل نہیں رہتا۔
- ۳۔ وہم اور التباس کا غلبہ
- ۴۔ پست ہمتی اور فرار پسندی
- ۵۔ خوش فہمی خصوصاً اپنے بارے میں
- ۶۔ غیر متوازن داخلیت، جس سے آدمی کے اندر دوسری چیزوں سے تعلق کی استعداد کم ہوتے ہوتے غائب ہو جاتی ہے۔
- ۷۔ دوہری شخصیت یا شیذوفرینا یعنی آدمی کی شخصیت کا دو حصوں میں بٹ جانا اور غیر حقیقی شخصیت کا حقیقی شخصیت پر غالب آ جانا۔

طول اہل کے انہی نقصانات کی وجہ سے قرآن حکیم نے بھی اس کی مذمت کی ہے (المحجر ۱۵: ۳) اور رسول کریم ﷺ نے بھی اسے فساد کی جڑ قرار دیا ہے (۱)۔

س: طول اہل کا علاج کیا ہے؟

ج: طول اہل اگر دنیاوی معاملات میں ہو تو اس کا بہترین علاج انفاق ہے۔ انفاق اگر اپنے مطلوبہ معیار کے ساتھ ہو تو یہ دنیاوی طول اہل کا فطری علاج ہے۔ انفاق کے بارے میں تفصیلی کلام تو ابنِ شفاء اللہ ہم اس کتاب کے فضائل کے حصے میں کریں گے، تاہم سر دست اس کا وہ پہلو واضح کر دینا ضروری ہے جسے ابھار کر طول اہل سے نجات حاصل کی جاسکتی ہے۔ یہ پہلو جو ایک طرح سے انفاق کی روح ہے، یہ ہے کہ اپنی کوئی پسندیدہ یا ضروری چیز اللہ کی راہ میں دے دی جائے۔ اس کے بغیر انفاق اندر سے ناقص ہے اور اتنا موثر بہر حال نہیں رہتا کہ کسی باطنی خرابی کا ازالہ کر سکے۔ اپنی پسندیدہ چیزیں اللہ کی راہ میں دے دینا یا کسی دوسرے کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر عملاً ترجیح دینا، آدمی کو پہلے ہی قدم پر دنیا اور اس عارضی زندگی کی محبت سے ایک درکار حد تک دور کر دیتا ہے۔ یہ دوری ہی دراصل طول اہل کا علاج ہے۔

دوسرا علاج، جو دراصل انفاق ہی کا ایک شعبہ ہے، یہ ہے کہ آدمی دولت اور جائیداد وغیرہ بنانے کی تگ و دو میں اتنا مشغول نہ ہو جائے کہ بعض شرعی مطالبات واضح طور پر مجروح ہونے لگیں۔ یہ شرعی مطالبات یا در ہے کہ صرف قانونی سطح تک محدود نہیں ہیں۔ اللہ اپنے بندوں کو حصولِ فرائض میں حریص دیکھنا چاہتا ہے۔ ہماری وہ مصروفیات جو اس حرص کو ختم یا کمزور کر دیں ہماری اس بندگی کو کامل نہیں ہونے دیتیں جس کا اللہ تعالیٰ ہم سے

مطالبہ کرتا ہے۔ گویا اگر کوئی شخص اپنی ضروریات سے زائد اسباب کے لیے اتنا وقت اور محنت صرف کرتا ہے کہ اس کے اندر دین میں آگے بڑھنے کا تقاضا دم پڑنے لگے تو اس آدمی کو اس بارے میں سنجیدگی سے فکر کرنے کی ضرورت ہے۔ مختصر یہ ہے کہ دنیا جمع کرنے کی بیشتر صورتوں سے بچنے کی کوشش کریں۔ اس کوشش میں جتنی کامیابی ہوتی جائے گی اتنی ہی طول اہل سے رہائی کی صورتیں بھی نکلتی چلی جائیں گی۔

اصولی بات یہ ہے کہ جو بندہ آخرت کو دنیا پر ترجیح دے گا اور اخروی زندگی و دنیوی زندگی کے مقابلے میں زیادہ حقیقی سمجھے گا وہ طول اہل سے نکل جائے گا۔ یہ اصول کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیے۔

طول اہل کا ظہور دینی سرگرمیوں میں بھی ہوتا ہے۔ اس کے عموماً دو اسباب ہوتے ہیں: اپنے آپ کو ممتاز کرنے کی خواہش اور جذبات کا ذہن پر غالب آ جانا۔ پہلا سبب ظاہر ہے کہ منافی اخلاص ہے اور اپنی جگہ طول اہل سے بھی ایک بڑی برائی ہے البتہ دوسری وجہ مخلص لوگوں کو پیش آتی ہے اور غلط ہونے کی صورت میں بھی لائق اجر ہے۔ تاہم علاج دونوں کا ضروری ہے۔ پہلی صورت میں علاج کا واحد راستہ اخلاص کی کمی کو دور کرنا ہے۔ اس کی تدبیروں کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ دوسری صورت میں علاج کی دو سادہ سی ترکیبیں ہیں:

۱۔ اس بات پر یقین کہ بندہ نتائج پیدا کرنے کا مکلف نہیں ہے۔ ہو گا وہی جو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی مرضی کبھی خالی از مصلحت نہیں ہوتی۔ اس استحضار سے جذبات کی وہ شدت کم ہو جاتی ہے جو ذہن سے کام نہیں لینے دیتی۔

۲۔ زمینی حقائق یعنی اپنی صلاحیت اور باہر کی صورتحال کا صحیح اندازہ لگانا۔ اس سے ذہن میں وہ قوت پیدا ہو جاتی ہے جو جذبات کو غالب آنے سے روک سکتی ہے۔ یہ ملحوظ رہے کہ طول اہل دنیاوی معاملات میں ایک ہو لانا ک چیز ہے۔ دینی

امور میں اس کی بنیاد سرے سے غلط بھی ہو تو بھی مثبت ہے، لہذا علاج کے لیے ترجیح اس کی پہلی قسم کو دینی چاہیے۔ کیونکہ اس سے ایک رذیلے کا ازالہ ہوگا۔ طول اٹل کی دینی نوعیت کا معالجہ کسی برائی کے خاتمے کے لیے نہیں بلکہ ایک فضیلت یعنی فراست کے حصول کے لیے ہے۔



بے ادبی اور غلو ادب

حکم رسانی

— ﴿يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ وَلَا تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ الْإِلَاحَ ۚ﴾

(النساء: ۴۷: ۱)

اے اہل کتاب! اپنے دین میں غلو اور کمی بیشی نہ کرو اور اللہ کے بارے میں صرف حق بات کہو۔

— ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَنْ تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تَشْعُرُونَ﴾

(الحجرات: ۲۹: ۲)

اے ایمان والو! اپنی آوازیں نبی ﷺ کی آواز سے اونچی مت کرو اور نہ نبی ﷺ کو اس طرح آواز دے کر پکارو جیسے تم آپس میں ایک دوسرے کو پکارتے ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال برباد ہو جائیں اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔

فرمان نبوی

— ”ایاکم والغلو فی الدین فانما هلك من كان قبلکم بالغلوفی

الدین“ (۱)

دین میں غلو سے بچو کہ تم سے پہلی قومیں دین میں غلو کی وجہ سے ہی ہلاک ہوئیں۔

— ”ان اهل قريظه نزلوا على حكم سعد، فارسل النبي اليه، فجاء

فقال: قوموا إلى سيدكم.....“ (۲)

بنو قریظہ نے حضرت سعد کو حکم (ثالث) مان لیا تو آپ ﷺ نے انہیں بلا بھیجا

(۱) من النساء، کتاب المناسک، باب التقاط الحصى

(۲) صحیح بخاری، کتاب الاستئذان، باب قول النبی، قوموا إلى سيدکم

جب وہ آئے تو آپ ﷺ نے اہل مجلس سے کہا: اپنے سردار کے احترام میں کھڑے ہو جاؤ۔

س: بے ادبی کیا ہے؟

ج: بے ادبی کے کئی پہلو ہیں جن سے مل کر یہ ایک رویے کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ ان پہلوؤں کی طرف ہم بعد میں جائیں گے پہلے اس کی ایک نسبتاً جامع تعریف وضع کر لینا مناسب ہوگا۔ بے ادبی کا مطلب ہے کسی شخص یا کسی چیز کو اس کے حقیقی مقام سے، جو شریعت اور معاشرے میں موجود اخلاقی اقدار کا دیا ہوا ہو، نیچے اتار دینا۔ اس کا سادہ مفہوم یہ ہے کہ ایک شخص یا ایک چیز کی جو تعظیم ہم پر شرعاً یا اخلاقاً واجب ہے، وہ نہ کرنا۔ اب اس کے ان پہلوؤں کی طرف آتے ہیں جن کی طرف ابھی ہم نے اوپر اشارہ کیا تھا، بے ادبی کے کئی پہلو ہیں مثلاً:

۱۔ شریعت کو اپنی رائے کے تابع کرنا۔ اس میں پورا دین ہی خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ خیال رہے کہ شریعت میں عقائد اور اعمال دونوں شامل ہیں۔

۲۔ احکام کی علانیہ خلاف ورزی کرنا۔

۳۔ دینی شعائر یا علامات کا استخفاف کرنا۔ دینی شعائر وغیرہ کی ایک صورت قانونی ہے اور دوسری اخلاقی و نفسیاتی۔ قانونی استخفاف واضح ہے، سمجھنے کی چیز اس کا نفسیاتی و اخلاقی پہلو ہے۔ تقریباً تمام دینی شعائر یا علامات، قانون کے علاوہ مختلف قوموں کے عرف میں بھی تعظیم کی مخصوص صورتیں رکھتے ہیں۔ ان صورتوں کی خلاف ورزی، اگر شرعاً ضروری نہ ہو تو بھی بے ادبی ہے۔ مثال کے طور پر ہمارا عرف یہ ہے کہ قرآن شریف کو نیچے نہ رکھو، اس کی طرف پشت نہ کرو، قبلے کی طرف پاؤں نہ پھیلاؤ۔ یہ اور اس طرح کے تمام امور اس مزاج کی تشکیل کرتے

ہیں جو شریعت کو مطلوب ہے، لہذا شریعت کی طرف سے تاکید نہ ہونے کے باوجود ان چیزوں کو عملاً رد کرنا یا طبعاً ان کے ساتھ مناسبت نہ رکھنا، بے ادبی ہی کہائے گا اور موجودہ عرف میں رہتے ہوئے اس بے ادبی کا نقصان دینی ہی ہوگا۔

۴۔ دین کی بنیاد پر امتیاز رکھنے والے لوگوں کی اہانت یا دل میں ان کی تعظیم کا نہ ہونا۔ اس خرابی کا اظہار عام طور پر اسلاف کی بے توقیری کی شکل میں ہوتا ہے۔ جبکہ سلف صالح کے بارے میں مسلمانوں کا رویہ تعظیم، احسان مندی اور محبت کے علاوہ نہیں ہو سکتا، اور اگر ہوگا تو غیر اسلامی اور غیر فطری ہوگا۔

۵۔ اپنے سے بڑوں کے سامنے کسی بھی وجہ سے گستاخانہ رویہ اختیار کرنا۔ ان میں والدین بھی آتے ہیں اور وہ تمام مسلمان بھی جو ہم سے مرتبے یا عمر میں بڑے ہوں۔

س: کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ان تمام پہلوؤں کی چند ٹھوس مثالیں بھی بیان کر دی جائیں تاکہ بات ہر ذہنی سطح کے آدمی کی سمجھ میں آجائے؟

ج: بے ادبی کی چند صورتوں کی مثالیں یہ ہیں:

۱۔ شریعت کو اپنی رائے کے تابع کرنا جیسے:

— عقائد کو فلسفہ بنا دینا جیسے بعض متکلمین اور صوفیائے کیا۔

— احکام کو توڑ مروڑ دینا جیسا کہ تمام گمراہ فرقوں کا خاصہ ہے، مثلاً یہ حکم فلاں وقت تک کے لیے تھا (جیسے جہاد کا حکم) یا اس کا مطلب امت آج تک نہیں سمجھی۔ نماز کا مطلب نظام ربوبیت کا قیام ہے یا قربانی صرف مکے کے لیے تھی یا بشری جہت سے، معاذ اللہ، ہم میں اور رسول اللہ ﷺ میں کوئی فرق نہیں، یا ہم آپ ﷺ کی انسانی رائے کے برخلاف کوئی رائے رکھ سکتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

— قیاس واجتہاد کو غیر مشروط حجت بنا دینا، یعنی کسی امتی کی رائے کو ویسی ہی سند بنالینا جیسی کہ قرآن وسنت کو حاصل ہے۔

— دین میں نئی باتیں پیدا کرنا اور ان کی اشاعت کی کوشش کرنا۔

— شریعت اپنے اندر ایک نظام ترجیحات رکھتی ہے، اس نظام میں بگاڑ پیدا کرنا۔
اس کی ایک مثال یہ ہے کہ شریعت کو اللہ کی مستقل یا داوریگاہ سے بچاؤ دونوں مطلوب ہیں، لیکن اگر ایک شخص ان دونوں بیماریوں میں مبتلا ہو تو شریعت پہلے قدم پر گناہ سے بچاؤ پر اصرار کرتی ہے اور ذکر الہی کی مختلف صورتوں مثلاً نوافل یا کثرت اعمال کو اس کے بعد رکھتی ہے۔ ہمارے ہاں اکثر حلقوں میں یہ ترتیب الٹ گئی ہے۔ یہ ہے شریعت کے نظام ترجیحات میں خلل ڈالنا۔

شریعت کو اپنی تمام دینی، روحانی اور اخلاقی ضروریات کی تکمیل کے لیے کافی نہ سمجھنا۔ آدمی خواہ اس کا اقرار کرے یا نہ کرے، اس کا عمل دیکھا جائے گا۔

احکام کی علانیہ خلاف ورزی کرنا۔ اس میں فسق وفجور کی تمام صورتیں آجاتی ہیں مثلاً ترک نماز، ترک صوم وغیرہ

۳۔ دینی شعائر و علامات کا استخفاف۔ یہ استخفاف قانونی بھی ہو سکتا ہے اور عرفی بھی۔

قانونی استخفاف کی چند مثالیں یہ ہیں: نماز کے لیے مسجد کو نہ جانا، استطاعت کے باوجود حج نہ کرنا، خود داڑھی نہ رکھنا اور دوسرے کی داڑھی کو حقارت سے دیکھنا، اتباع سنت کی ظاہری صورتوں مثلاً مسواک وغیرہ کی طرف سے بے پروائی برتنایا انہیں غیر ضروری سمجھنا یا کسی دوسرے میں ان کا اہتمام دیکھ کر نا پسندیدگی محسوس کرنا۔

عرفی استخفاف: اس کی مثالیں اوپر گزر چکیں۔ اس میں البتہ ایک بات ملحوظ رہے کہ امت میں عرف ایک نہیں ہے۔ ہر قوم اپنی بعض نفسیاتی اور معاشرتی قیود میں رہتے

ہوئے ایک خاص مزاج پیدا کر لیتی ہے جو دوسروں قوموں کے لیے بامعنی نہیں ہوتا۔ اس لیے عربی بے ادبی کا دائرہ اتنا وسیع نہیں ہے کہ اس میں پوری امت کو داخل کر دیا جائے۔ عین ممکن ہے کہ ایک عمل ہمارے ہاں بے ادبی کا مظہر ہو لیکن عربوں میں ایسا نہ ہو، لہذا ضروری ہے کہ اپنے عرف کو معیار بنا کر ان کی تردید نہ کی جائے مثلاً قبلے کی طرف پاؤں دراز کرنا ہمارے مزاج کے مطابق ایک بے ادبی ہے لیکن عربوں کا ذہن اس طرح کا کوئی شائبہ تک نہیں رکھتا۔ انہیں اگر سمجھانا ہو تو پھر شرعی دلیل لانی پڑے گی۔ ہم اپنے عرف کو ان پر حجت نہیں بنا سکتے۔ اس چیز کا خاص خیال رکھنا چاہیے کیونکہ اس میں غفلت کی وجہ سے ہمارے اکثر لوگ اہل عرب کے بارے میں بدگمانی سے بڑھ کر غیبت اور غیبت سے بڑھ کر بہتان تک پہنچ جاتے ہیں۔

س: بے ادبی کے نقصانات کیا ہیں؟

ج: بے ادبی سے جو نقصانات پہنچتے ہیں وہ بیک وقت شرعی و روحانی بھی ہیں اور اخلاقی و نفسیاتی بھی۔ آدمی ایک پہلو سے کسی ضروری حکم پر عمل سے قاصر رہ جاتا ہے یا شریعت کو بہت زیادہ مطلوب کسی فضیلت کے حصول سے محروم ہو جاتا ہے اور دوسری طرف چونکہ بنیادی طور پر یہ ایک رویہ ہے لہذا اس کی وجہ سے انسان کی باطنی ساخت بھی مجروح ہوتی ہے اور شریعت پر چلنے کے لیے جو داعیات ضروری ہیں وہ کمزور پڑ جاتے ہیں یا پیدا ہی نہیں ہوتے۔ غرض ہر جہت سے یہ رویہ مضر ہے اور اس سے پہنچنے والا ہر ضرر شخصیت کے بگاڑ میں ایک مجموعی اور کلی کردار رکھتا ہے۔ یعنی اگر بے ادبی طبیعت پر اثر انداز ہو تو اعمال عبودیت بھی متاثر ہو جاتے ہیں اور مخلوق کے حقوق بھی ضائع ہو جاتے ہیں۔ اس کا اثر ذہنی ہو تو آدمی میں وہ خود رائی پیدا ہو جاتی ہے جو اسے قرآن و سنت کی واقعی مراد سے منحرف یا دور کر

دیتی ہے۔ بے ادب آدمی ہر سطح پر اور ہر جہت سے چند ایسے نقائص میں مبتلا ہو جاتا ہے جو اسے شریعت سے متعلق رہنے کے ابتدائی مراحل سے بھی دور کر دیتے ہیں۔ اس طرح کے چند نقصانات درج ذیل ہیں:

- ۱۔ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی محبت خطرناک حد تک کم ہو جاتی ہے۔
- ۲۔ سنگ دلی پیدا ہو جاتی ہے اور دل میں گداز کی کوئی صورت نہیں رہتی۔
- ۳۔ شریعت جس معاشرت کا مطالبہ کرتی ہے، بے ادب آدمی اس میں کبھی نہیں کھپ سکتا۔
- ۴۔ دین جس غیر مشروط اطاعت کا نام ہے، بے ادبی اس کی ضد ہے۔
- ۵۔ اچھے لوگوں کی دل آزاری، جو گناہوں میں ایک بڑا گناہ ہے، زیادہ تر بے ادبی کی وجہ سے سرزد ہوتا ہے۔

غلو ادب

یہاں ایک وضاحت ضروری ہے، اور وہ یہ کہ جس طرح بے ادبی ایک بری چیز ہے، اسی طرح ادب میں غلو بھی مضر ہے۔ ادب میں غلو کا مطلب یہ ہے کہ پیر، امام، استاد، افسر، ماں باپ یا کسی بھی شخص کو اپنے لیے اتنا مکرم و محترم بنالینا کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کی خلاف ورزی ہونے لگے۔ مثلاً اکثر لوگ فرط ادب سے اپنے پیر کو ایسا سمجھنے لگتے ہیں کہ شرک کی حدود شروع ہو جاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ دین میں سب سے بڑا نقصان ہے جو اس رویے سے لاحق ہوتا ہے۔ لہذا یہ بات بہت احتیاط سے سمجھ لینی چاہیے کہ حقیقی ادب اعتدال کا نام ہے، جو جس کا حق ہے اسے دو اور دوسرے مسلمانوں کو اپنے سے اچھا جانو۔ ادب کے تمام تقاضے یہاں پہنچ کر پورے ہو جاتے ہیں۔

س: بعض لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ حب رسول ﷺ کی آڑ میں وہ ایسے اقوال و افعال کے مرتکب ہوتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ اور اللہ تعالیٰ کی ذات گرامی میں نعوذ باللہ، بس نام کا فرق ہے۔ کیا یہ ادب میں غلو نہیں ہے؟

ج: شیطان نے ادب میں غلو کی جتنی صورتیں ایجاد کی ہیں، ان میں سب سے خطرناک صورت یہی ہے جو آپ کے سوال میں مذکور ہے۔ شرک و بدعت کے پھیلاؤ میں سب سے بڑا کردار اسی فریب کاری کا ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا حوالہ آتے ہی مسلمان کی طبیعت اور ذہن میں غیر مشروط قبولیت کا دروازہ کھل جاتا ہے لہذا اس سے فائدہ اٹھا کر شیطان بہت سی ایسی باتیں بھی بھجھا دیتا ہے جو رسول اللہ ﷺ اور آپ کے معبود کے درمیان پائے جانے والے مطلق فرق کو یا تو ختم کر دیتی ہیں یا محض برائے نام باقی رکھتی ہیں۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ اس معاملے میں خود رسول اللہ ﷺ کے واضح ارشادات کی پابندی بھی نہیں کرتا۔ رسول اللہ ﷺ کے سلسلے میں ادب میں غلو کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس میں مبتلا شخص جس کا ادب کرتا ہے، اس کی اتباع نہیں کرتا۔ دراصل اس طرح کے تمام رویے بے ادبی ہی کی صورتیں ہیں۔ انہیں ادب سے کوئی نسبت نہیں، کیونکہ ادب اظہار محبت ہی نہیں بلکہ اتباع حکم کا بھی نام ہے۔ تاہم اللہ معاف فرمائے، اس معاملے میں بہت بڑی احتیاط درکار ہے۔ یہاں غلو بھی کفر تک پہنچا دیتا ہے اور ذرا سی بے ادبی کا بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے۔

س: رسول اللہ ﷺ کے ادب میں جھوٹے غلو کی بات تو سمجھ میں آگئی لیکن یہ جاننا بھی درکار ہے کہ اللہ و رسول ﷺ کی شان میں بے ادبی کی کیا صورتیں ہیں؟ ان کا بیان بھی ہو جائے تو خاصی آسانی ہو جائے گی؟

ج: اللہ تعالیٰ کی جناب میں بے ادبی کا وہ مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے، کبھی محبت کے نام پر، کبھی خوف کے نام پر اور کبھی معرفت کے نام پر۔ اس کی کچھ مثالیں یہ ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ کی محبوبیت پر ایسا اصرار کہ اس کا رعب اور جلال ملحوظ نہ رہے۔ اس مرض میں مبتلا آدمی، اللہ سبحانہ کو بھی گویا اپنی سطح پر لانے کی کوشش کرتا ہے۔ بے ادبی کا خلاصہ یہی تو ہے کہ چھوٹا بڑے تک پہنچنے کی کوشش کرنے کی بجائے اسے اپنی سطح پر لانے کی خواہش کرے۔ یہ خرابی ہماری شاعرانہ اور صوفیانہ روایت کے بڑے حصے میں موجود ہے۔

۲۔ اللہ سے ڈرنے کی ایسی صورتیں فرض کر لینا کہ اپنی نجات و بخشش سے مایوس ہو جانا۔ یہ بھی بے ادبی ہے کیونکہ اس میں رحمت الہیہ کا ایک ایسا تصور کا فرما ہے جس کی نسبت اللہ کی طرف کرنا اس کی توہین ہے۔

۳۔ یہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ اللہ کے کچھ راز ہیں جنہیں اس کے علاوہ کوئی نہیں جانتا اور نہ کوئی جان سکتا ہے۔ ان رازوں تک پہنچنے کا دعویٰ اور کوشش و خواہش بھی بے ادبی ہے۔ ایسا آدمی گویا اللہ کے قول پر یقین نہیں رکھتا کہ اللہ تو ایک چیز کو محال فرما رہا ہے اور یہ اس کے حصول کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔

۴۔ بعض اہل علم تاویل کے خطرات کو بھانپ کر ذات و صفات الہیہ کے بارے میں ایسے خیالات رکھتے ہیں جن سے کوئی بڑا عیب اللہ سے منسوب ہو سکتا ہے مثلاً اللہ کے لیے جسم اور جہت وغیرہ ماننا یا کوئی ایسا عقیدہ رکھنا جس سے یہ خرابیاں لازم آتی ہوں۔ یہ بھی بے ادبی کی ایک قسم ہے اور آدمی کو دین سے خارج کر سکتی ہے۔

۵۔ راحت میں شکر اور مصیبت میں صبر نہ کرنا۔ یہ بے ادبی کی وہ قسم ہے جو مسلمانوں

میں سب سے زیادہ عام ہو چکی ہے۔ کوئی کامیابی ہوتی ہے تو اس پر خود کو شاباش دی جاتی ہے یا کسی انسان کی توجہ، تصرف وغیرہ کا نتیجہ سمجھ لی جاتی ہے اور جس کے حکم سے یہ کامیابی ہوئی ہے، اسے بالکل فراموش کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح کوئی مصیبت آتی ہے یا دعاؤں کے باوجود نہیں ملتی تو اللہ کی شکایت تک پر اتر آتے ہیں۔

۶۔ واضح احکام میں چوں چرا کرنا۔ یہ بھی بے ادبی کی وہ قسم ہے جو بہت عام ہے، لہذا یہ فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ عقیدے اور عمل میں اللہ تعالیٰ کے احکام و ارشادات کی خلاف ورزی کی ہر قسم بے ادبی ہے۔

۷۔ اللہ سے براہ راست تعلق نہ رکھنا اور اس میں کسی غیر نبی کی اجارہ داری کو فرض کر لینا، یہ بے ادبی کی وہ قسم ہے جو ایسے آدمی سے سرزد ہوتی ہے جس کا ایمان ابھی ناقص ہے اور اس کے دل میں شرک کے کچھ جراثیم پائے جاتے ہیں۔

۸۔ نتائج پیدا کرنا صرف اور صرف اللہ کا اختیار ہے۔ یہ نتائج چاہے دنیوی ہوں یا اخروی، ان کو حاصل کرنے کے لیے کسی مخلوق کو پکارنا یا اس کے بارے میں یہ گمان رکھنا کہ وہ چاہے تو فلاں چیز ہو جائے گی یا فلاں چیز نہیں ہوگی یا وہ چاہے تو اللہ سے اپنی بات منوا سکتا ہے، اس طرح کے معتقدات گویا بے ادبی کی پرورش گاہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی اس سے بڑھ کر توہین کیا ہو سکتی ہے کہ جس قدرت و اختیار کو اس نے اپنے لیے واضح طور پر خاص کر رکھا ہے اس میں کسی دوسرے کو شریک کر لیا جائے۔ عام طور پر شیطان اس خرابی میں رسول اللہ ﷺ کا حوالہ دے کر مبتلا کرتا ہے۔

س: رسول اللہ ﷺ کی شان اقدس میں بے ادبی کی بھی مثالیں دے دی جائیں تاکہ

بات بالکل واضح ہو جائے۔

ج: رسول اللہ ﷺ کی بے ادبی کے ارتکاب کی دو صورتیں ہیں: ایک ذات رسول ﷺ کی بے ادبی اور دوسرے احکام رسول ﷺ کی بے ادبی۔ ان کی ضروری تفصیل یہ ہے کہ بعض لوگ آپ کے احکام پر پوری طرح چلنے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن اس جوش اتباع میں آپ کی ذات اقدس کا ضروری ادب نظر انداز کر دیتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے لیے رسول اللہ ﷺ متبوع تو ہیں مگر مطلوبہ حد تک محبوب نہیں۔ دوسری قسم کی بے ادبی کے مرتکب وہ لوگ ہیں جو محبت رسول ﷺ کے مدعی بن کر جوش محبت میں احکام رسول ﷺ کو نہ صرف یہ کہ فراموش کر دیتے ہیں بلکہ ان کی صریح خلاف ورزی میں بھی انہیں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی۔ ان لوگوں کی نظر میں رسول اللہ ﷺ محبوب تو ہیں مگر متبوع نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا جو ادب امت پر واجب ہے وہ شدید ترین محبت اور غیر مشروط اور بلا تاویل اتباع کا مجموعہ ہے۔ ان میں سے کوئی ایک چیز بھی کم رہ جائے تو اس ادب کا بنیادی تقاضا فوت ہو جائے گا۔ بے ادبی کی ان دونوں قسموں کے کچھ مظاہر یہ ہیں:

۱۔ رسول اللہ ﷺ کی بشریت پر ایسا اصرار کرنا جس کے نتیجے میں رسول کی حیثیت سے آپ کا حقیقی امتیاز کمزور پڑ جائے۔ اس خیال کے حاملین کی پہچان یہ ہے کہ وہ آپ ﷺ کی بشریت کا اثبات نقائص بشری کی روشنی میں کرتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ بشریت ہمارے لیے تو موجب نقائص ہو سکتی ہے رسول اللہ ﷺ کی نسبت سے یہ سراسر کمال ہے۔

۲۔ رسول اللہ ﷺ سے ایک بے لچک اور ٹھنڈے قانونی تعلق پر قانع ہو جانا اور آپ کی طبعی پسندنا پسند وغیرہ سے کوئی مناسبت محسوس نہ کرنا۔ اس طرح کا آدمی

محبت رسول ﷺ کے شرعی تقاضے کی تکمیل کے قابل نہیں رہتا۔

۳۔ آپ ﷺ کو محبوب بنا کر خدا کے مقابلے میں لے آنا اور آپ ﷺ کے اظہار بندگی کو کوئی اہمیت نہ دینا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے بعض اوقات جہاں بیعت و جلال کے ساتھ آپ ﷺ کو مخاطب فرمایا ہے، ان خطابات کا ترجمہ یا تفسیر کرتے وقت مراد کو بالکل بدل دینے کی جسارت کرنا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو، نعوذ باللہ، اللہ کو بھی اس طرح دیکھتے ہیں جیسے وہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے مودب رہتا ہے۔ اس خرابی کی بہت سی مثالیں ہمارے معاشرے میں بکثرت موجود ہیں اور عوام تو عوام کئی علما و صوفیا بھی اس میں مبتلا ہیں۔

۴۔ رسول اللہ ﷺ کی شفاعت کی حدود کو اتنا بڑھا دینا کہ اللہ کا اقتدار اور خود آپ ﷺ کے لائے ہوئے دین کا نظام جزا و سزا بے معنی ہو کر رہ جائے۔ یہ اور ان سے ملتی جلتی دیگر چیزیں رسول اللہ ﷺ کی شدید توہین کے مترادف ہیں، اللہ تعالیٰ ان سے محفوظ رکھے۔

س: بے ادبی کا علاج کیا ہے؟

ج: بے ادبی کے رویے اور عمل سے نجات کے لیے مندرجہ ذیل تدابیر اختیار کی جائیں تو ان شاء اللہ مفید ہوں گی:

۱۔ نماز میں ظاہری حسن پیدا کرنا، جس کے ضروری اجزاء یہ ہیں: قیام میں تھوڑا سا جھک کر کھڑے ہونا، کوشش کرنا کہ پوری نماز میں نماز کی حرکات کے علاوہ جسم حرکت نہ کرے اور نسبتاً لمبے رکوع و سجود کرنا۔ یہ چیزیں آدمی میں بندگی کی قوت اور کیفیت میں اضافہ کرتی ہیں جو بے ادبی کے علاج میں سب سے زیادہ ضروری ہیں۔

۲۔ سیرت النبی ﷺ اور صحابہؓ کے سوانح کا بکثرت مطالعہ، اس سے ادب کا ایک زندہ

ماڈل سامنے آجاتا ہے جو انتہائی محفوظ بھی ہے۔

۳۔ کسی دین دار آدمی سے اپنی اصلاح کا تعلق پیدا کرنا اور اس کے مشوروں پر، بلا ضرورت شرعی، تنقیدی نظر نہ ڈالنا۔ اس سے وہ ادب پیدا ہوتا ہے جو شریعت کو مختلف المراتب انسانوں کے درمیان مطلوب ہے۔

۴۔ خدمت خلق۔ اس سے ایک طرف تو خود غرضی اور خود پسندی کا ازالہ ہوتا ہے اور دوسری جانب نیکی کا ایک وسیع اور متنوع تصور پیدا ہوتا ہے۔ بے ادبی کے خاتمے کے لیے یہ دونوں چیزیں ضروری ہیں۔

۵۔ گاہے بگاہے کچھ ایسی چیزیں سننا جو دل اور طبیعت پر اثر کرتی ہوں مثلاً اچھی قرأت، کوئی محفوظ کلامِ حق کے ساتھ، کوئی وعظ وغیرہ۔

۶۔ جن چیزوں سے نشاط طبع پیدا ہوتی ہے انہیں معمول بنانا: مثلاً باغ کی سیر، کوئی کھیل وغیرہ، کیونکہ بے ادب آدمی طبیعت میں بند اور خشک ہوتا ہے۔ عام طور پر ہشاش بشاش رہنے والا شخص بے ادب نہیں ہوتا۔

س: آپ کی اس گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے کہ حسن ادب اسلام کی بنیادی تعلیمات میں سے ہے؟

ج: آپ ٹھیک سمجھے۔ حسن ادب کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ لوگ حضور ﷺ کے ادب کا حق نہیں ادا کر رہے تھے تو خود اللہ تعالیٰ نے مداخلت فرمائی اور صحابہ کو سکھایا کہ رسول اللہ ﷺ سے بات کیسے کرنی چاہیے (الحجرات ۴۹:۲۴)۔ اسی طرح گھروں میں پرائیویسی (النور ۵۸:۲۴)، گھر سے باہر عورتوں کے لباس (الاحزاب ۵۹:۳۳)، میاں بیوی کے باہمی تعلقات (النساء ۳۴:۳۴) اور دوسرے بہت سے معاملات میں قرآن نے مسلمانوں کو آداب سکھائے۔ اور آداب کے

سلسلے میں آنحضرت ﷺ کی تعلیمات تو اتنی وسیع ہیں کہ مسلمانوں کے علاوہ، کافروں، جانوروں، پرندوں، لباس، سفر، طعام، سلام، مجلس غرض زندگی کی چھوٹی چھوٹی جزئیات کے بارے میں آپ ﷺ نے اتنی تفصیلی رہنمائی دی ہے کہ اسلامی اخلاقیات (جو ایک چوتھائی دین ہیں) — کہ عام طور پر دین کو عقائد، اخلاق، عبادات اور معاملات چار شعبوں میں تقسیم کیا جاتا ہے) کا بہت بڑا حصہ آداب ہی پر مشتمل ہے۔ لہذا اسلامی آداب کو محض دنیوی ایٹی کیٹس (Etiquettes) کی طرح نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ یہ تو جزو دین ہیں اور ہم ان پر عمل کے مکلف ہیں اور روز قیامت ان پر جزا اور سزا کا نفاذ ہوگا۔



بدعت

حکم ربانی

— ﴿فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ.....﴾ (النساء: ۵۹)
 پھر اگر تمہارے درمیان کسی چیز میں اختلاف ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی
 طرف پھیر دو۔

— ﴿فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ إِلَّا الضَّلَالُ﴾ (یونس: ۳۲)
 پھر حق بات معلوم ہو جانے کے بعد اسے نہ ماننا گمراہی کے سوا اور کیا ہے؟

فرمان نبوی

— ”.....إِنْ خَيْرَ الْحَدِيثِ كِتَابُ اللَّهِ وَخَيْرُ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ ﷺ

وشر الامور محدثاتها وكل بدعة ضلالة“ (۱)

یقیناً بہترین بات اللہ کی کتاب ہے اور بہترین راستہ محمد ﷺ کا راستہ ہے اور
 بدترین کام دین میں نئے پیدا کردہ کام ہیں اور (ایسا) ہر نیا کام (بدعت) گمراہی ہے۔

— ”مَنْ أَحْدَثَ فِي أَمْرِنَا هَذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ“ (۲)

جس نے ہمارے دین میں نئی بات کا اضافہ کیا وہ رد کردی جائے گی۔

س: بدعت کی تعریف کیا ہے؟

ج: جو چیز دین نہیں ہے اسے دین بنا لینا۔ یہ عمل خواہ واضح اور علانیہ ہو یا اشارۃ اور
 کنائیہ، بدعت ہے۔ فہم اور تعبیر کی غلطیاں اور ان پر عقیدہ و عمل اس تعریف سے
 خارج ہے۔ گویا بدعت یہ ہے کہ آدمی یہ جاننے کے باوجود کہ فلاں خیال یا عمل
 قرآن و سنت سے ثابت نہیں ہے اس خیال اور عمل کو دین بنا کر اختیار کرے اور

(۱) صحیح مسلم، کتاب الجمعة، باب تخفيف الصلاة و الخطبة

(۲) صحیح بخاری، کتاب الصلح، باب اذا صطلحو اعلی صلح جور

ج: دین ہی کی حیثیت سے اس کی تعلیم دوسروں کو دے اور اس کی مخالفت کے جواب میں وہی رویہ اپنائے جو دین کی مدافعت میں اپنایا جاتا ہے۔ تعبیر کی غلطی کسی غلط دلیل کی بنا پر ہوتی ہے جو صحیح دلیل ملنے پر چھوڑ دی جاتی ہے، لیکن اوپر کی تفصیل کے مطابق بدعت کا یہ معاملہ نہیں ہے۔

س: اگر آپ چند مثالیں دیں سکیں تو بات مزید واضح ہو جائے گی؟

ج: وہ افکار و خیالات اور رسوم و اعمال جن کے بدعت ہونے میں کوئی شبہ نہیں ان میں سے چند درج ذیل ہیں:

۱۔ وجود باری تعالیٰ پر فلسفیانہ بحث کرنا مثلاً ذات و صفات کی عینیت و غیریت کا مسئلہ، مراتب الہیہ کا بحث، اللہ تعالیٰ کے قدیم ہونے کی توجیہ، اللہ کے لامحدود ہونے کی توضیح، علم الہیہ کی تفصیل وغیرہ۔

۲۔ مسئلہ تقدیر کی حقیقت جاننے کی کوشش کرنا۔

۳۔ تشابہات کی قطعی تفسیر کرنا

۴۔ جنت و دوزخ کو مقامات کی بجائے احوال یا علامات سمجھنا

۵۔ شفاعت کے متعلق یہ عقیدہ رکھنا کہ رسول اللہ ﷺ ہماری ہر طرح کی نافرمانیوں کے باوجود ہمیں بخشوا لیں گے۔

۶۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تمام صحابہ سے افضل سمجھنا

۷۔ کسی شخص کی غیر مشروط پیروی کرنا

۸۔ اولیاء اللہ کے لیے یہ عقیدہ رکھنا کہ وہ گناہوں اور غلطیوں سے محفوظ ہیں۔

۹۔ قبروں پر نمٹیں ماننا اور صاحب قبر کو نہ صرف یہ کہ یقین سے زندہ سمجھنا بلکہ اسے متصرف بھی جاننا۔

۱۰۔ کسی بزرگ کے مزار سے ملحقہ مسجد کو دوسری مساجد پر ترجیح دینا۔ ویسے بھی چار مسجدوں، مسجد حرام، مسجد نبوی ﷺ، مسجد اقصیٰ اور مسجد قباء کو چھوڑ کر کسی مسجد کو دوسری مساجد سے افضل نہیں کہا جاسکتا۔

۱۱۔ موجودہ زمانے میں پیری مریدی کی اکثر صورتیں مثلاً پیر کے ادب میں غلو کرنا، اس کو اپنی نجات کے لیے کافی سمجھنا، اسے غیب دان ماننا، اس کی ہر دعا کو یقیناً مستجاب سمجھنا، اس کے لیے بڑے بڑے القابات کا استعمال مبالغے کے ساتھ کرنا، بزرگوں کے عرس کو میلے کی شکل میں منانا اور اس میں شرکت کو باعث ثواب جاننا، قبروں پر چادریں چڑھانا، چراغ جلانا، وہاں بیٹھ کر قرآن پڑھنا، قبر کو بوسہ دینا، برکت کے لیے اسے ہاتھوں سے سینے یا رخسار سے مس کرنا، ان کا طواف کرنا وغیرہ۔

۱۲۔ قبروں کو پختہ اور بلند کرنا

۱۳۔ عورتوں کا اپنے پیر کے سامنے بے پردہ ہونا۔

۱۴۔ قبروں پر سجدہ کرنا، خواہ اسے سجدہ تعظیمی ہی کیوں نہ سمجھیں۔

۱۵۔ صوفیاء کے تجویز کردہ اعمال و اشغال کو قولاً یا فعلاً دینی درجہ دینا، یعنی ان کی وہی حیثیت جاننا جیسی کہ قرآنی اور مسنون اوراد و اذکار کی ہے یا ان میں ایسا انہماک کہ ذکر و عبادت کی مسنون صورتوں پر عمل کی مقدار کم ہو جائے یا ختم ہو جائے۔

۱۶۔ تزکیہ نفس کے نام پر صرف وہی ذرائع اختیار کرنا جو خود ساختہ ہیں۔ مطلب یہ کہ مسنون زندگی گزارتے ہوئے معاملے کے طور پر تزکیے کے کچھ وسائل اختیار کیے جاسکتے ہیں، بلکہ غور سے دیکھیں تو بعض شریعت کی رو سے ضروری بھی ہیں تاہم ان کا تناسب اور مرتبہ شرعی اعمال کے مقابلے میں کم اور ثانوی ہونا چاہیے۔

۱۔ محافل میلاد میں قیام کو فرض یا واجب سمجھنا..... وغیرہ۔

س: ان میں سے بعض امور صریحاً کفر و شرک معلوم ہوتے ہیں۔ انہیں بدعت کہہ کر آپ کہیں ان کی خرابی کو بلا کا تو نہیں کر رہے؟

ج: نہیں، یہ بدعتیں ہی ہیں کیونکہ کفر و شرک کے لیے ارادہ کفر و شرک ضروری ہے۔ یہ افعال اور ان کا نتیجہ ضرور کفریہ اور مشرکانہ ہو سکتا ہے لیکن ان کے مرتکب کو کافر اور مشرک اس وقت تک نہیں کہنا چاہیے جب تک وہ کفر و شرک کا خود اقرار نہ کر لے یعنی یہ ثابت نہ ہو جائے کہ اس کا ارادہ ہی شرک اور انکار دین کا تھا۔ لیکن یہ بات انہی یا ان جیسے اعمال تک محدود ہے ورنہ ٹھیکہ کفر و شرک میں ارادہ نہیں دیکھا جائے گا۔

س: وجود باری تعالیٰ پر عقلی مباحث کو بدعت کہنے کا مطلب تو یہ ہوا کہ تقریباً تمام متکلمین اور اکثر صوفیاء بدعت کے مرتکب تھے؟

ج: وجود باری تعالیٰ کے اثبات یا تجزیے میں عقل، قیاس، تخیل، کشف وغیرہ کو حکم بنانا اور بعض متعینہ اصطلاحات میں گفتگو کرنا یقیناً بدعت ہے۔ تاہم ہماری روایت میں یہ کام ضرورتاً زیادہ ہوا ہے مثلاً مخاطبین ہی ایسے تھے کہ اس طرح کا انداز ناگزیر ہو گیا تھا یا پھر عیسائیوں وغیرہ کے اعتراضات نے ایمانیات کو عقل کی روشنی میں ثابت اور واضح کرنے پر مجبور کر دیا۔ مختصر یہ کہ کسی تبلیغی اور تعلیمی مصلحت سے تو ایسے کام ایک محدود معنی میں روا سمجھے جاسکتے ہیں لیکن انہیں بلا ضرورت خود مسلمانوں میں رائج کرنا بہر حال بدعت ہی محسوس ہوتا ہے۔

س: بدعت کے نقصانات کیا ہیں؟

ج: ایک مسلمان کا اس سے بڑا اور کیا نقصان ہو سکتا ہے کہ وہ دین سے دور جا پڑے۔

دین کے قانونی دائرے میں رہتے ہوئے اس سے دوری بلکہ محرومی کا سب سے بڑا سبب یہی بدعت ہے۔ اس کا دوسرا بڑا ضرر نقص ایمان ہے۔ یہ نبوی نہیں سکتا کہ بدعت کا شکار شخص ایمان میں کامل، صادق اور مضبوط ہو۔ تیسرا نقصان عمل کا ہے۔ دین میں عمل کی تعریف یہ ہے کہ اس کے نتیجے میں اللہ کی خوشنودی اور جنت حاصل ہو جب کہ بدعت جن اعمال کا نام ہے وہ از روئے نفس جہنم میں لے جانے والے ہیں۔ نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے کہ دین میں ہر نئی بات مردود ہے (۱) یہ بدعت ہے اور ہر بدعت کا نتیجہ گمراہی ہے، اور ہر گمراہی کا (آخری) نتیجہ دوزخ ہے (۲)۔ آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ محدثات و بدعات کا مرتکب حشر کے روز حوض کوثر کے پانی سے محروم رہے گا (۳) اور اس کا نماز، روزہ، حج اور کوئی نیکی بھی قبول نہ ہوگی (۴)۔ گویا اس نقصان کو آخرت کا نقصان کہنا چاہیے بدعتی اللہ کی رحمت، رسول اللہ ﷺ کی نسبت اور آخرت کی خوشحالی سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس سے بڑے نقصان کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

۲۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اہل بدعت جس چیز کی سب سے زیادہ آڑ لیتے ہیں وہ محبت ہے یعنی اللہ سے محبت، رسول اللہ ﷺ سے محبت یا کسی اور برگزیدہ، ستی سے محبت۔ شیطان ان سے محبت کے نام پر اس طرح کھیلتا ہے کہ انہیں اتباع اور اطاعت، جو گل شریعت ہیں، کی مخالف سمت میں کھڑا کر دیتا ہے۔ جس کسی کو یہ کہتے سنو کہ ہم اللہ کے طالب ہیں، جنت کے نہیں یا رسول اللہ ﷺ نے اپنی تعظیم کے طریقے اپنے مرتبے کی بلندی پر بنائے تو واضح بیان نہیں کی تو یقین سے سمجھ لو کہ یہ شخص بدعتی

۱۔ صحیح بخاری، کتاب الصلح، باب اذا اصطلحو اعلیٰ صلح جو رد فالصلح مردود

۲۔ سنن ابن ماجہ، کتاب السنہ، باب اتباع سنۃ الخلفاء الراشدین المہدیین

۳۔ صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب الحشر

۴۔ سنن ابن ماجہ، کتاب السنہ، باب اجتناب البدع والجدل

ہے اور کفر کے اتنا نزدیک پہنچ چکا ہے کہ شریعت کو آج نہیں تو کل نامکمل ضرور کہے گا۔

۳۔ مبتدع اپنی رائے اور خواہش کو حکم شریعت پر غالب کرنے کا عادی ہوتا ہے۔ یہ خرابی روح بندگی کو ماردیتی ہے۔

۴۔ اہل بدعت دراصل دین کے تسلسل میں رکاوٹ ڈالتے ہیں اور یہ کھلم کھلا دشمنی ہے اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ۔ اس کا عنوان جو چاہے رکھ لیں لیکن اپنی تاثیر اور نتائج کے اعتبار سے اسے دشمنی ہی کہا جائے گا، یعنی بدعتی گروہ دین کو صحیح صورت میں آگے منتقل ہونے نہیں دیتا۔ یہ اسلام کے تاریخی وجود سے کھیلنے کے مترادف ہے۔

س: بدعت کا علاج کیا ہے؟

ج: اس کا علاج اصولاً ایک ہی ہے اور وہ ہے تمسک بالقرآن والسنہ۔ بدعت کے ازالے کا اس کے سوا اور کوئی نسخہ نہیں۔ تمسک بالقرآن والسنہ کے لیے مندرجہ ذیل چیزیں درکار ہیں:

۱۔ دین سارے کا سارا قرآن و سنت میں بند ہے۔ اس سے باہر جو کچھ ہے وہ دین نہیں۔ اس عقیدے پر ہر حال میں استقامت درکار ہے۔

۲۔ دین کے نام پر پھیلانی جانے والی ہر نئی صورت اور نئی بات سے بچنا، چاہے اس میں اپنی دانست میں کسی ایسی چیز کا نقصان ہی کیوں نہ ہو جائے جس کا ہونا خود دین میں پسندیدہ ہو۔ اس کی مزید وضاحت یہ ہے کہ قرآن و سنت سے باہر کسی خیال، کسی عمل، کسی تصور کو دین نہیں ماننا چاہیے، چاہے وہ ثابت شدہ مقاصد دین کی تکمیل ہی کیوں نہ کرتا ہو۔ بدعات کا فروغ اصل میں اسی اصول کو فراموش

کرنے سے ہوتا ہے کہ کسی غیر نبی کا صحیح قول بھی دینی حجت نہیں ہے یعنی اس کی یہ حیثیت نہیں ہے کہ اس سے اختلاف کرنے والا آخرت میں خطرے سے دوچار ہو جائے۔ اس ضابطے کو سختی سے ملحوظ رکھنا چاہیے تاہم اتنی فراست ضرور درکار ہے کہ دین کی صحیح تعبیرات کے دین ہونے کا انکار تو صحیح ہے مگر ان کی صحت کی نفی نہیں کرنی چاہیے۔ یہ بے عقلی کا کام ہوگا جو شریعت میں پسندیدہ نہیں۔



www.KitaboSunnat.com

تجسس

حکم ربانی

— ﴿..... وَلَا تَجَسَّسُوا.....﴾ (الحجرات ۱۲/۳۹)

نوہ مت لگاؤ (یعنی مسلمانوں کے عیبوں اور کمزوریوں کو تلاش مت کرو)۔

— ﴿..... وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوا فَقَدْ

احْتَمَلُوا بُهْتَانًا وَإِنَّمَا مُبِينًا﴾ (الحزاب ۵۸/۳۳)

اور وہ لوگ جو بغیر قصور کے مومن مردوں اور مومن عورتوں کو تکلیف پہنچاتے ہیں، پس انہوں نے یقیناً بہتان اور صریح گناہ کا بوجھ اٹھایا۔

فرمان نبوی

— ”إِيَّاكُمْ وَالظَّنَّ فَإِنَّ الظَّنَّ أَكْذَبُ الْحَدِيثِ، وَلَا تَحَسَّسُوا،

وَلَا تَجَسَّسُوا وَلَا تَنَاقَسُوا.....“ (۱)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بدگمانی سے بچو کیونکہ بدگمانی سب سے بڑا جھوٹ ہے اور عیبوں کی نوہ مت لگاؤ اور نہ جاسوسی کرو اور نہ دوسرے کا حق غصب کرنے کی حرص اور اس کے لئے کوشش کرو.....“

— ”إِنَّكَ إِنِ اتَّبَعْتَ عَوْرَاتِ الْمُسْلِمِينَ أَفْسَدْتَهُمْ.....“ (۲)

اگر تو مسلمان بھائیوں کے عیبوں کی تلاش میں رہے گا تو تو ان کے اندر بگاڑ پیدا کر دے گا۔

(۱) صحیح مسلم، کتاب البر، باب تحریم ظلم المسلم وخذله

(۲) سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب انہی عن التجسس

س: تجسس کی تعریف؟

ج: کسی کی ٹوہ میں رہنا اور جن چیزوں کو کوئی آدمی چھپانا چاہتا ہے انہیں جاننے کی کوشش کرنا تجسس ہے۔

س: تجسس کا داعیہ پیدا کس طرح ہوتا ہے؟

ج: تجسس دراصل عیب جوئی کا نام ہے۔ اس کے پیچھے دوسروں کی خامیاں، کوتاہیاں اور معائب جاننے کی خواہش کا رفرما ہوتی ہے۔

س: حکومت کے لیے دشمنوں، مجرموں، قانون شکنوں وغیرہ کی سرگرمیوں کا کھوج لگانا اور ان کے پوشیدہ ٹھکانوں پر حکومتی اہل کاروں کا چھاپہ مارنا۔ یہ باتیں تجسس کے زمرے میں آتی ہیں یا نہیں؟

ج: اس میں ایک اصول ہے، اور وہ یہ کہ بعض خرابیاں اور گناہ انفرادی ہوتے ہیں اور ان کا نقصان بھی اسی شخص کو پہنچتا ہے جو ان کا مرتکب ہوتا ہے۔ اس طرح کی صورتحال میں سوال میں مذکور چیزیں تجسس کی ذیل میں آسکتی ہیں۔ تاہم بعض سرگرمیاں ایسی ہوتی ہیں جن کا ضرر اجتماعی ہوتا ہے مثلاً زنا، جوا، مجرمانہ منصوبہ بندی، سازش وغیرہ۔ ان کی طرف سے باخبر رہنے اور ان کو پھیلنے سے روکنے کی ہر کوشش، خواہ حکومتی سطح پر ہو خواہ غیر سرکاری سطح پر، جائز بلکہ ضروری ہے مثلاً ایک آدمی اپنے گھر میں چھپ کر اگر شراب پی رہا ہو تو اسے پکڑنے کی کوئی بھی کوشش ٹھیک نہیں البتہ اگر یہی شخص خفیہ طور پر شراب بنانے کا کام کرتا ہو تو اس کا سراغ بھی لگانا چاہیے اور اسے رنگے ہاتھوں پکڑنے کی کارروائی بھی کی جانی چاہیے۔ حکومت کا معاملہ ایک خصوصیت رکھتا ہے کہ وہ حسب ضرورت سراغ رسانی کا اختیار استعمال کر سکتی ہے۔ اسے غالباً شرعاً چیلنج نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی اسے تجسس کہا جائے گا۔

س: تجسس کے نقصانات کیا ہیں؟

ج: تجسس کے چند بڑے نقصانات یہ ہیں:

۱۔ طبیعت میں پستی، بے حمیتی اور بے حیائی پیدا ہو جاتی ہے۔

۲۔ مردوں میں یہ عادت بڑے بڑے مردانہ اوصاف کو کم یا ختم کر کے ایک گھٹیا قسم کا زمانہ پن پیدا کر دیتی ہے۔

۳۔ سوچ منفی ہو جاتی ہے۔

۴۔ تجسس کی طرف میلان سے غیبت، بہتان اور عیب جوئی کا دروازہ بھی کھل جاتا ہے۔

۵۔ لوگوں میں رسوائی ہوتی ہے اور معاشرہ ایسے شخص کو اپنے میں سے خارج کر دیتا ہے۔

۶۔ اس عادت کی وجہ سے بعض مرتبہ وہ چیزیں بھی دیکھنے سننے میں آ جاتی ہیں جنہیں کوئی غیرت مند آدمی برداشت نہیں کر سکتا۔

۷۔ کسی پر بھی اعتماد باقی نہیں رہتا۔

۸۔ دل ہر قسم کی محبت سے خالی ہو جاتا ہے۔

۹۔ جھوٹ اور فریب سازی کی عادت پڑ جاتی ہے۔

۱۰۔ یہ ایک عمل آنکھ، کان، زبان حتیٰ کہ تمام جوارح کو الگ الگ گناہ میں مبتلا کر دیتا ہے۔

۱۱۔ تجسس اور چوری کے امراض ایک ہی طرح کی نفسیات سے پیدا ہوتے ہیں۔

محض اس بات سے اس کے گھٹیا پن کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

۱۲۔ مسلمان کی پردہ دری ایک بہت بڑا گناہ ہے (۱) لہذا تجسس کی عادت سخت مضر

(۱) سنن ابن ماجہ، کتاب الحدود، باب الستر علی المومن

ہے، دینی لحاظ سے بھی اور نفسیاتی اعتبار سے بھی۔

تجسس کے ان ہی نقصانات کی وجہ سے قرآن و سنت نے تجسس کی مذمت کی ہے اور اسے شدت سے منع کیا ہے، دیکھیے (الحجرات ۱۲:۴۹، صحیح بخاری (۱)

س: اس عادت کا علاج کیا ہے؟

ج: اس علاج کے اہم نکات یہ ہیں:

— ایسے صالح لوگوں کی صحبت اختیار کرنا جو باتیں کم کرتے ہوں لیکن ان کے اعمال کو دیکھ کر یا ان میں شریک ہو کر آدمی اپنے اندر مثبت تبدیلی کی ایک لہر محسوس کر سکتا ہو۔

— قرآن و حدیث میں تجسس کی مذمت میں جو باتیں آئی ہیں ان کی تفسیر پڑھنا اور سننا۔

— جس کے لیے تجسس کا داعیہ پیدا ہو، اسے اس داعیے سے مطلع کر دینا۔

— مردوں کا عورتوں کی صحبت سے بچنا۔

— پراسرار قسم کے لوگوں کے ساتھ تعلق نہ رکھنا، کیونکہ ایسے لوگ تجسس کے جذبے کو ہوا دیتے ہیں۔

— کسی کے ساتھ مقابلے کی فضا نہ پیدا ہونے دینا۔

— اپنے جاننے والوں کی غائبانہ تعریف کرنے کی عادت ڈالنا۔

— اگر گفتگو کے دوران میں آنکھ نیچی رکھنے کی عادت ہو تو اس کو ترک کرنے کی

کوشش کرنی چاہیے۔ یہ عادت بیشتر انہی لوگوں میں ہوتی ہے جو دوسروں کی

ٹوہ میں لگے رہتے ہیں۔ البتہ طبیعت میں حیا کا غلبہ ہو تو دوسری بات ہے۔

اسراف

حکم ربانی

— ﴿وَكُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا، إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ﴾

(الاعراف ۷: ۳۱)

کھاؤ پیو مگر فضول خرچی نہ کرو کہ اللہ فضول خرچی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

— ﴿وَالَّذِينَ إِذَا أَنْفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا، وَكَانَ بَيْنَ ذَلِكَ قَوَامًا﴾

(الفرقان ۲۵: ۶۷)

اور جو خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ بخل سے کام لیتے ہیں

بلکہ کفایت شعاری اختیار کرتے ہیں۔

فرمان نبوی

— ”ان النبی ﷺ مر بسعد وهو يتوضأ فقال: ما هذا السرف يا سعد؟

فقال أفي الوضوء سرف؟ قال: نعم، وإن كنت على نهر جار“ (۱)

حضرت سعدؓ وضو کر رہے تھے کہ نبی کریم ﷺ پاس سے گزرے اور کہا: سعد

فضول پانی ضائع نہ کرو۔ انہوں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ! کیا وضو میں زیادہ پانی

خرچ کرنا بھی فضول خرچی ہے؟ آپؐ نے فرمایا ہاں! خواہ تم دریا کے کنارے بیٹھ

کر ہی وضو کیوں نہ کر رہے ہو!

— ”من بذّر حرمہ اللہ“ (۲)

جو فضول خرچ کرتا ہے اللہ اسے محروم کر دیتا ہے۔

(۱) ترمذی ابن ماجہ، کتاب الطہارۃ، باب ماجاء فی القصد فی الوضوء.....

(۲) مسند الشہاب عن منہاج الصالحین، ص ۳۰۹

س: اسراف کی تعریف؟

ج: اسراف عرف عام میں فضول خرچی کو کہتے ہیں لیکن اپنی اصل میں یہ ایک باطنی خرابی ہے جو آدمی کو مالی و غیر مالی امور میں شریعت کی مقرر کردہ حدود میں نہیں رہنے دیتی۔ یعنی صحیح معنوں میں اسراف کا مطلب ہے حد سے تجاوز کرنا۔ مالی امور میں اسراف کا مطلب وہ خرچ ہے جس کا کوئی دینی یا دنیوی فائدہ نہ ہو اور جو محض اپنے نفس کی خواہش پر اور اپنے نفس کی راحت کے لیے کیا جائے۔ ضرورت مندوں کی امداد میں خرچ کی کوئی واضح حد نہیں ہے۔ اس میں دل کھول کر خرچ کرنا انفاق ہے، اسراف نہیں۔

س: اسراف کی صورتیں کیا ہیں؟

ج: اسراف کی معروف صورتیں یہ ہیں:

— جائیدادیں بنانا اور بڑے بڑے گھر تعمیر کرنا۔

— اپنی ملکیت میں فضول چیزوں کا اضافہ کرتے رہنا جو دینی طور پر مضر اور دنیاوی طور پر لغو ہوں۔

— محض اپنی ناموری کے لیے غیر مستحق لوگوں کو بڑے بڑے تحفے دینا۔

— شادی بیاہ اور دیگر معاشرتی رسوم میں ہونے والے بیشتر مروجہ اخراجات۔

— اچھا کھانے اور اچھا پہننے کی بے لگام خواہش کی تکمیل کے ذرائع پیدا کرنا۔

س: اسراف کے نقصانات کیا ہیں؟

ج: ہر خرابی کی طرح اسراف کے ظاہری نقصانات بھی ہیں اور باطنی بھی مثلاً:

۱۔ افلاس

۲۔ بلاوجہ مقروض ہونا

۳۔ دکھاوے کے مرض میں مبتلا ہونا یعنی خود نمائی

۴۔ حب دنیا اور حب مال

۵۔ شریعت کی پسندیدہ زندگی سے بالکل دوری

۶۔ اللہ واللہ کے رسول ﷺ کی طرف سے مستقل غفلت

۷۔ نفسانیت اور ہوی پرستی

۸۔ انسانی مراتب اور فضائل کا عملی انکار

۹۔ دین اور دینی شعائر سے بے رغبتی

۱۱۔ آخرت کی فکر کا خاتمہ

۱۲۔ حصول مال کے لیے ناجائز ذرائع ڈھونڈنا۔

اسراف کی انہی خرابیوں کی وجہ سے قرآن حکیم میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ فضول خرچوں کو پسند نہیں کرتا (الاعراف ۷: ۳۱)، انہیں ہدایت نہیں دیتا (مومن ۴۰: ۲۸)، وہ شیطان کے بھائی ہیں (بنی اسرائیل ۷: ۲۷) اور ان کا ٹھکانہ دوزخ ہے (مومن ۴۰: ۴۳) اور مومنوں کی صفت یہ بیان فرمائی کہ وہ فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ ہی بخل بلکہ معتدل رویہ رکھتے ہیں (الفرقان ۲۵: ۶۷) اور نبی کریم ﷺ نے اسراف سے بچنے کی تعلیم دیتے ہوئے اپنے اصحاب (اور امت) کو سونے چاندی کے برتنوں میں کھانے اور ریشمی لباس پہننے سے منع فرمادیا (۱) اور ایک دفعہ نبی کریم ﷺ نے حضرت سعدؓ کو وضو کرتے ہوئے دیکھا تو فرمایا: وضو میں اسراف سے کام نہ لو۔ حضرت سعدؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ (ﷺ) کیا وضو میں بھی اسراف ہوتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں! خواہ تم دریا کے کنارے ہی وضو کیوں نہ کر رہے ہو؟ (۱)

۱۔ صحیح بخاری، کتاب اللباس، باب افتراش الحریر

۱۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الطہارۃ، باب ماجاء فی القصد فی الوضوء

س: اسراف کا علاج کیا ہے؟

ج: اس کے علاج کی کوئی جزوی تدبیر نہیں ہے کیونکہ مسرف آدمی لذت پرست ہوتا ہے اور اپنے مرض کو مرض سمجھنے پر تیار نہیں ہوتا ورنہ تو سادہ سی بات تھی کہ اسراف کا علاج یہ ہے کہ اسراف سے بچا جائے۔ اس سے جان چھڑانے کی اگر کوئی موثر صورت ہے تو وہ یہ کہ آدمی دین پر چلنے کا مصمم ارادہ کرے اور طبیعت کی اسراف پسندی کو قابو میں رکھنے کے لیے اس کا رخ انفاق اور فیاضی کی طرف موڑ دے، یعنی جتنا خود پر خرچ کرتا تھا وہ ارد گرد کے مستحق لوگوں پر خرچ کر دے۔ اس کے علاوہ اسراف کا کوئی قابل اعتماد علاج نہیں ہے کیونکہ یہ ان خرابیوں میں سے ہے جو طبیعت کا داعیہ ہوتی ہے۔ داعیات کا ازالہ نہیں ہوتا ان کا مصرف اور سمت البتہ تبدیل ہو سکتی ہے۔



خود رانی

حکم ربّانی

﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُبِينًا﴾
(الاحزاب ۳۳: ۳۶)

کسی مومن مرد یا عورت کے لیے گنجائش نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول ﷺ کسی معاملے کا فیصلہ کر دیں تو پھر ان کے لئے اس میں کوئی اختیار باقی رہے اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا تو وہ کھلی گمراہی میں پڑ جائے گا۔
﴿فَلَا وَرَيْكَ لَيُؤْمِنُونَّ حَتَّى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا﴾

(النساء ۴/۶۵)

پس اے نبی! آپ کے رب کی قسم! ایسے لوگ کبھی ایمان والے نہیں ہو سکتے جب تک وہ اپنے تمام باہمی جھگڑوں میں آپ کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں پھر جو فیصلہ آپ کریں اس پر وہ اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی محسوس نہ کریں بلکہ ہل و جان سے اسے تسلیم کر لیں۔

فرمان نبوی

— ”عن ابن مسعود: انه جاء يوم الجمعة والنبي يخطب فسمعه يقول ”اجلسوا“ - فجلس بباب المسجد اى حيث سمع النبي يقول ذلك. فراه النبي ﷺ فقال له: تعال يا عبد الله بن مسعود“ (۱)

(۱) علاء الدین علی المتقی الہندی، کنز العمال، ج ۱۱ ص ۱۸۳، دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۴۱۹ھ

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ جمعہ کے وقت میں مسجد نبویؐ میں داخل ہوا، رسول اللہ ﷺ خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ میں نے سنا آپؐ فرما رہے تھے ”بیٹھ جاؤ“ میں اس وقت مسجد کے دروازے پر تھا وہیں بیٹھ گیا۔ آنحضرت ﷺ نے مجھے دیکھا تو فرمایا: عبداللہ آگے آ جاؤ۔

— ”عن ابی سعید الخدریؓ قال بینما رسول اللہ ﷺ یصلی باصحابہ اذ خلع نعلیه فوضعہما عن یسارہ، فلما رأى القوم ذلك القوا نعالہم، فلما قضی صلاتہ قال: ما حملکم علی القائنکم نعالکم؟ قالوا رايانا القيت نعلیک ا فقال: ان جبریل اخبرنی ان فیہا قدر“ (۱)

حضرت ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ نبی کریم ﷺ صحابہ کو نماز پڑھا رہے تھے کہ آپ ﷺ نے جوتے اتار کر اپنے بائیں طرف رکھ دیے۔ سب صحابہ نے بھی جوتے اتار دیے۔ نماز ختم ہونے کے بعد آپؐ نے صحابہ سے پوچھا کہ تم لوگوں نے جوتے کیوں اتار دیے؟ انہوں نے عرض کیا: آپؐ نے جوتے اتارے تو ہم نے بھی اتار دیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: میں نے تو اس لیے اتارے تھے کہ مجھے جبریل نے آکر بتایا تھا کہ میرے جوتے کو لندگی لگی ہوئی ہے۔

(۱) رواہ القاضی عیاض فی کتابہ الشفاء

س: خود رائی سے آپ کی کیا مراد ہے؟

ج: اس مرض کا سلسلہ تکبر، خود پسندی، عجب اور خود نمائی وغیرہ سے ملتا ہے۔ اس کی عام طور پر دو شکلیں ہوتی ہیں، جس کی وجہ سے اس کی تعریف میں کسی قدر تبدیلی آ جاتی ہے۔ خود رائی کی پہلی اور بڑی شکل یہ ہے کہ آدمی حق کو جاننے کے باوجود قبول نہ کرے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی صورتاً اور مزاجاً ایسا بن جائے کہ اس کے لیے اپنی رائے دوسروں کی رائے کے مقابلے میں قابل ترجیح اور قابل تسلیم بن جائے۔ پہلی صورت میں اس کی رائے اس حال میں حق پر غالب آ جاتی ہے کہ وہ یقین سے جانتا ہے کہ یہ حق ہے۔ دوسری شکل میں اسے سامنے والے کی دلیل کی صحت کا یقین ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ اسے قبول نہیں کرتا۔ خود رائی کی پہلی شکل اختیار کر کے آدمی دین پر قائم نہیں رہ سکتا اور دوسری صورت میں پڑ کر دین کے واقعی حدود سے تجاوز کرنے سے نہیں رک سکتا۔ یعنی پہلی کا نتیجہ کفر ہے اور دوسری کا گمراہی۔

ویسے خود رائی کی ایک تیسری قسم بھی ہے جس کا تعلق آدمی کی نفسیاتی بناوٹ سے ہے۔ ایسا شخص کسی چیز کو اس کے حق یا ناحق ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنی مرضی اور پسند ناپسند کی بنیاد پر قبول یا رد کرتا ہے اور اس سلسلے میں معاشرت میں اس چیز کی جو حیثیت مسلم ہے، اسے نظر انداز کر دیتا ہے۔ خود رائی کی یہ قسم جدید تعلیم یافتہ لوگوں میں عام ہے۔ غور سے دیکھیں تو خود رائی کی یہ قسم پہلی دو اقسام کا مجموعہ ہے اور اس کا ضرر ان دونوں کے مجموعی ضرر کے برابر ہے۔ اس طرح کی خود رائی میں مبتلا شخص اپنے آپ کو سنجیدگی اور کمٹمنٹ کی ادنیٰ ترین سطح سے بھی گرا دیتا ہے اور اس کا مجموعی رویہ انکار یا نافرمانی کی بجائے دین کو اپنے تابع کر لینے کا ہوتا ہے۔ یہ رویہ صاف انکار سے بھی زیادہ خطرناک مضمرات رکھتا ہے اور اس کی

وجہ سے دین اتنا سکڑ جاتا ہے کہ اس کے تشخص کی کوئی بھی صورت باقی نہیں رہتی۔ ہماری رائے میں مسلمان معاشرے میں خود رائی کی یہی قسم زیادہ تر پائی جاتی ہے اور ہمیں اسی کے ازالے کی کوشش زیادہ یکسوئی اور انہماک کے ساتھ کرنی چاہیے۔

س: خود رائی کے کچھ مظاہر کی نشاندہی کر دی جائے تاکہ پہچاننے میں آسانی رہے؟

ج: ان مظاہر کی فہرست بنانے سے پہلے تمہیداً ایک بات کہنا ضروری ہے۔

مسلمانوں میں خود رائی کا سب سے بڑا مظہر سنت رسول اللہ ﷺ سے انحراف ہے۔ دین اپنی اعتقادی اور عملی تمام صورتوں میں اگر کسی ایک ماخذ سے اخذ کیا جاسکتا ہے تو وہ کوئی اور نہیں صرف سنت رسول اللہ ﷺ ہے، حتیٰ کہ قرآن بھی اپنی حجت کا کامل اظہار سنت ہی کے ذریعے سے کرتا ہے۔ اس سے انحراف کی مندرجہ ذیل شکلیں ہمارے اندر پائی جاتی ہیں:

عملی انحراف یعنی داڑھی نہ رکھنا، باجماعت نماز کی پابندی نہ کرنا، جہاد کے تصور سے بدکنا، بے پردگی وغیرہ

اعتقادی انحراف: سنت کی جس تعریف پر امت صدیوں سے متفق چلی آرہی ہے، اسے مجروح کرنا۔ اس کی مثالیں تو کئی ایک ہیں مگر نمونے کے طور پر ایک موٹی سی مثال یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے بعض ایسے امور کی انجام دہی یا غیر موکد ترغیب ثابت ہے جس کا اتباع قانونی معنی میں واجب یا جس کا ترک قانونی معنی میں موجب ضرر نہیں ہے۔ ان امور کو ایک جدید قانونی ذہنیت کے ساتھ اس طرح categorize کرنا کہ دین سے انسان کی فطری قوت وابستگی کے وہ تقاضے بھی ملحوظ نہ رہ سکیں جو اس کے امور ثابتہ کی طرف تعظیم کے ساتھ لپکے بغیر پورے نہیں ہو سکتے۔ مختصر یہ کہ دین کے عمومی حقوق کی نگہداری بھی

ایک خاص رویے کی متقاضی ہے جس کی تشکیل محض قانونی ذہن سے ممکن نہیں۔ دین اپنے ماننے والوں میں لامتناہی کمالات کے حصول کو بہر حال ممکن رکھتا ہے۔ وہ رسول اللہ ﷺ سے تمام منسوبات کی شدید تکریم اور ان سے جذباتی وابستگی کے بغیر حاصل تو کیا ہوں گے، ان کا ابتدائی تصور بھی قائم نہیں کیا جاسکتا۔ اس تمہید کے بعد اب خود رائی کے چند بڑے مظاہر کی نشاندہی کی جاتی ہے۔

۱۔ جدید علمی اور سائنسی تحقیقات کو قرآن و سنت پر حکم بنانا۔ یہ خود رائی کی ایک نہایت لطیف لیکن انتہائی عام قسم ہے۔ آدمی جس عہد میں رہتا ہے اس عہد میں مروجہ علمی، اخلاقی اور تہذیبی اقدار کے ساتھ نفسیاتی طور پر کم و بیش ویسا ہی تعلق رکھتا ہے جیسا کہ اپنی ملکیت سے ہوتا ہے۔ ان کی مدد سے وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے قامت میں اضافہ کرتا ہے، لہذا ایسا شخص دین کو اپنی رائے کے تابع کرنے کا جو راستہ سب سے پہلے کھولتا ہے وہ یہی ہے کہ متداول مسلمات کو کسوٹی بنا کر قرآن و سنت کو اس پر پرکھتا ہے۔

دینی مسائل میں اپنی رائے قائم کرنا فی نفسہ کوئی بری چیز نہیں ہے تاہم اس طرح کے عمل میں ایک ضروری اہلیت بھی درکار ہوتی ہے۔ خود رائی والا آدمی اس کے فقدان کے باوجود نہ صرف یہ کہ ایک رائے قائم کر لیتا ہے بلکہ اس رائے پر ایسا وثوق بھی پیدا کر لیتا ہے جو ضروری علم و دانش کے بغیر خلاف فطرت اور غیر انسانی ہے۔

عامۃ الناس میں سے وہ لوگ جو فقہی تقلید کے خلاف تقریریں کرتے نظر آتے ہیں ان کی اکثریت، گمان غالب کی رو سے، یا تو خود رائی میں مبتلا ہوتی ہے یا اس ابتلاء کے بالکل قریب ہوتی ہے، کیونکہ تقلید ایک مستقل دینی عذر ہے اور جو

آدمی یہ عذر رکھنے کے باوجود اس کے معمولی تقاضوں کی تکمیل کی طرف مائل نہیں ہوتا وہ خود رائی میں مبتلا بھی ہے اور غیر مخلص بھی ہے۔

۴۔ تقلید جامد: علم ہو یا نہ ہو، کسی شخص کا کسی خاص شخصیت یا رویے یا مکتب فکر کی تقلید کو ہر حال میں لازم قرار دے لینا، تقلید جامد ہے۔ عموماً ایسا شخص جانتے بوجھتے قرآن و حدیث کی واضح مرادات کو بھی اپنے پسندیدہ امام یا مکتب فکر کے قیاسات کے تابع رکھتا ہے۔ اس رویے کو کئی نام دیئے جاسکتے ہیں جن میں سے سب سے چھوٹا نام خود رائی ہوگا۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ دو اشخاص خود رائی میں ضرور مبتلا ہوتے ہیں ایک وہ جو تقلید کا سرے سے منکر ہے اور دوسرا وہ جو تقلید کو دین کی روح سمجھتا ہو۔

۵۔ علم کے ہوتے ہوئے عمل نہ کرنا: یہ خود رائی کی ایک نفسیاتی قسم ہے۔ دینی معلومات اپنی ماہیت میں محرک عمل ہیں۔ عالم بے عمل گویا اس ماہیت کو منقلب کرنے کا ارتکاب کرتا ہے، لیکن چونکہ یہ ارتکاب ایک خارجی اور اجتماعی دروبست نہیں رکھتا لہذا ہم نے اس رویے کو نفسیاتی خود رائی سے تعبیر کیا ہے۔ تاہم اس کا دینی ضرر بالکل واضح ہے۔

۶۔ مناظرے بازی کا شوق، خصوصاً فرقہ وارانہ مناظرے: اس طرح کے مناظروں کا محرک نصرت دینی نہیں بلکہ اپنے فرقے کی خود ساختہ حقانیت کا اعلان ہوتا ہے۔ جو لوگ دینی مزاج رکھتے ہیں انہیں یہ بات فطری طور پر معلوم ہوتی ہے کہ صحت اور تغلیط کے واضح معیارات دستیاب نہ ہوں تو محض قیاس و استدلال کی بنیاد پر آپس میں جھگڑنے سے تمسک بالقرآن والسنہ کا داعیہ کمزور پڑ جاتا ہے۔ ین میں ضرورت۔ مواقع پر قیاس و استنباط وغیرہ کی ایک اہمیت ضرور ہے تاہم

کسی نص کی غیر موجودگی میں ان کے معارضے کی ایسی صورت جو ایک فریق کے دین کو مشکوک بنادے، سخت ناپسندیدہ ہے۔ قیاس اپنے انتہائی دعوے کے مطابق بھی امکانی صحت ہی کا حامل ہوتا ہے لہذا اس کی بنیاد پر ایک دینی جنگ کی فضا پیدا کر دینا قرآن و سنت کے بنیادی تقاضوں کی ایک بدترین خلاف ورزی ہے۔ مذہبی گروہوں کے درمیان برپا ہونے والے اکثر مناظرے یا تو فقہی ہوتے ہیں، جن کا بیان ہم نے اوپر کیا، یا پھر ان کا تعلق ایمانی امور مثلاً توحید و رسالت وغیرہ سے ہوتا ہے۔ یہ دوسری قسم کے مناظرے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں کیونکہ ان میں ہر مناظرہ قرآن و حدیث کو اپنے تابع کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس طرح کی خرابیوں سے امت کو محفوظ رکھے۔

۷۔ تہذیب، انسانی زندگی کی پیش رفت کا وہ اسلوب ہے جو تغیرات کو قبول کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ بعض لوگ تہذیب اور تہذیبی اوضاع کو ایک سیکولر معنی دیتے ہیں اور اس پر کوئی دینی موقف اختیار کرنے کا جواز نہیں پاتے۔ یہ رویہ انسانی زندگی اور انسانی نفسیات کے تقریباً تمام مظاہر کو دین کی گرفت سے نکالنے کی ایک کوشش میں تبدیل ہو سکتا ہے، لہذا ایسے تمام تصورات قرآن و سنت کے مقابلے میں کھڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہاں تفصیل کا موقع نہیں تاہم ایک اصول اگر پیش نظر رہے تو آدمی اس طرح کی غلط فکری سے بچ سکتا ہے۔ وہ اصول یہ ہے کہ انسان اور اس کے اندرونی و بیرونی ماحول کا ہر جزو لازماً کسی واضح دینی موقف پر استوار ہونا چاہیے ورنہ اس کی من حیث الکل بندگی کا کوئی مفہوم باقی نہیں رہتا۔

س: یہ ایک نازک بات معلوم ہوتی ہے لہذا اس کی کچھ مثالیں دے دی جائیں تو بہتر ہوگا؟

ج: رہن سہن، خوردونوش اور پہننے اوڑھنے کے انداز سے کسی کا مذہبی ہونا یا نہ ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ ہر انسانی وضع اپنی ایک واضح اصل اور نسبت رکھتی ہے۔ مثلاً یہ ہونیہیں سکتا کہ انگریزی لباس دینی پڑمردگی کا سبب نہ بنے۔ جدید رجحان رکھنے والے علمائے مذہبیات نے چونکہ تہذیب کی روحانی ساخت کا مطالعہ نہیں کیا ہے لہذا ان کی اکثریت کے لیے یہ بات خاصی نامانوس ہوگی کہ اپنے دین سے باہر کے معاشروں سے ماخوذ اوضاع، غلط خیالات ہی کے برابر مضرت ہیں۔ مثلاً جدید تہذیب کے لیے آمادگی کا ہر رویہ جس چیز کو سب سے پہلے متاثر کرتا ہے وہ ہے نفس کا سادہ تعلق بالذین۔ اب یہ بات تجربے سے (clinically) ثابت ہو چکی ہے کہ مسلمانوں میں دینی گہرائی کے خاتمے کا ایک بہت بڑا سبب انگریزی لباس ہے۔ تہذیبی اوضاع کس طرح انسان کو اندر سے متاثر کرتے ہیں؟ ان شاء اللہ اس موضوع پر ہم پوری تفصیل سے کسی اور جگہ کلام کریں گے، سردست اتنا ہی کافی ہے۔

س: خود رائی کے نقصانات کیا ہیں؟

ج: خود رائی کا تعلق بھی ان چند خرابیوں میں سے ہے جو انسان کی پوری شخصیت کو لپیٹ میں لے لیتی ہے لہذا اس کے نقصانات آدمی کے تمام رویوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ ان نقصانات کی فہرست خاصی طویل ہے۔ ہم نمونے کے طور پر چند بڑے نقصانات کی نشاندہی کریں گے:

- ۱۔ تکبر، جو ایک طرح سے خود رائی کا اصل سبب ہے۔ اور یہ خرابی پوری طرح جڑ پکڑ لے تو تکبر میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے۔
- ۲۔ اس کے نتیجے میں آدمی حق کو قبول کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتا ہے۔

۳۔ بڑوں کا احترام، چھوٹوں پر شفقت اور مسلمانوں کی خیر خواہی، اسلامی اخلاق و معاشرت کے بنیادی ارکان میں سے ہیں۔ خود رائے آدمی میں ان کا فقدان ہوتا ہے، جس کی وجہ سے وہ اسلامی ماحول میں کھپنے کی صلاحیت نہیں رکھتا اور رفتہ رفتہ کج خلقی، سنگ دلی، سخت کلامی وغیرہ کا نمونہ بن کر رہ جاتا ہے۔

۴۔ خود غرضی: خود رائے خود غرضی ہی کا ایک رویہ ہے۔

۵۔ خود رائے کا غالباً سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ اس میں مبتلا شخص شعور، طبیعت اور ارادے کی روح سے دین کو سمجھنے، دین پر چلنے اور دین سے سچا تعلق رکھنے کے لائق ہی نہیں رہتا، نتیجتاً مکمل بے دینی کا شکار ہو جاتا ہے۔

باقی نقصانات مثلاً قرآن و سنت کو اپنی رائے کے تابع کرنا، بدعت پسندی وغیرہ کی ضروری تفصیل اوپر آچکی ہے، وہاں دیکھ لی جائے۔

س: اس کا علاج کیا ہے؟

ج: خود رائے کا علاج مشکل ہے، چونکہ خود رائے آدمی کو علاج بتانا ایسا ہی ہے جیسے کسی پاگل کو دو اوٹوں کا نسخہ تھما دیا جائے۔ تکبر وغیرہ کی طرح اس کے مریض کا علاج بھی کسی دوسرے ہی کی نگرانی میں ہو سکتا ہے۔ کیونکہ یہ شخص اپنے آپ کو مریض نہیں سمجھتا اس لیے اس کے معاملے میں بڑی حکمت اور نفسیاتی بصیرت درکار ہے۔ تاہم ذیل میں کچھ ایسی چیزیں تجویز کی جا رہی ہیں جنہیں اختیار کر کے خود رائے کے ازالے میں خاصی مدد مل سکتی ہے:

۱۔ ہر خود رائے آدمی کا ایک خاص میدان ہوتا ہے جس میں وہ اپنی رائے چلاتا ہے، اگر کسی طرح اسے یہ باور کرا دیا جائے کہ وہ ان معاملات کے مبادی کا بھی پورا علم نہیں رکھتا تو اس کی خود رائے کی طاقت بڑی حد تک ٹوٹ جائے گی

مثال کے طور پر ایک آدمی ضروری علم کے بغیر قرآن کی من مانی تفسیر کرتا ہو تو اسے کسی بھی حیلے سے اس طرف متوجہ کرنا چاہیے کہ تم تو عربی ہی نہیں جانتے، پھر اس کام میں کیسے پڑ گئے؟

۲۔ خود رائی کا ایک موثر علاج یہ بھی ہے کہ اس میں مبتلا آدمی سے خود اس کی مخالفت میں دلیل طلب کی جائے، یعنی وہ جب اپنی رائے کا اظہار کرے تو اسے اہمیت دینے کے انداز میں سننے کے بعد اس شخص کو اکسایا جائے کہ وہ خود اپنی رائے کو رد کر کے دکھائے۔ اکثر خود رائے لوگ جوش میں آ کر یہ کام بھی کر گزرتے ہیں۔ اس طریقے کو تو اتر سے استعمال کیا جائے تو اس آدمی کو اپنی رائے پر اعتماد نہیں رہے گا اور نفسیاتی طور پر وہ پہلے سے طے شدہ امور میں پناہ لینے پر مجبور ہو جائے گا۔ اس کے نتیجے میں ممکن ہے کہ اس کی ضروری خود اعتمادی بھی مجروح ہو جائے لیکن وہ ایک بڑے مرض سے نجات ضرور پا جائے گا۔

۳۔ خود رائے آدمی میں سب سے بری قباحت یہ ہوتی ہے کہ وہ حس اتباع سے عاری ہوتا ہے۔ اگر بعض اعمال کو چیلنج بنا کر اس کے سامنے پیش کیا جائے تو اس کا دھیان فکر سے عمل کی طرف منتقل ہو سکتا ہے، اور ظاہر ہے عمل کی اساس یعنی حکم اور عمل کی تمام صورتیں پہلے سے موجود ہوتی ہیں، ان میں مشغول ہو کر خود رائی کی گنجائش بہت کم رہ جاتی ہے۔

۴۔ خود رائے آدمی کا مضحکہ اڑانا یا اس سے تحکمانہ انداز سے بات کرنا سخت مضر ہے۔ نہایت نرمی کے ساتھ کچھ ایسے مسائل اس کے سامنے رکھ دینے چاہئیں جو کم از کم اس کے لیے لایخیل ہوں اور خود سوال کرنے والا یا تو ان مسائل کو

حل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو یا اس کی کوئی صورت نکال سکتا ہو۔ یہ طریقہ بہت محفوظ اور مجرب ہے، اسے ضرور اختیار کرنا چاہیے۔

س: اس معاملے میں افراط و تفریط کا بھی امکان ہے۔ خود رائی کی قباحت تو بہر حال واضح ہے، تاہم بعض لوگ ایسے بھی دیکھنے میں آتے ہیں جن کی سرے سے کوئی رائے ہی نہیں ہوتی۔ وہ بس سب کی ہاں میں ہاں ملاتے رہتے ہیں۔ اس رویے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ج: یہ سوال ایک تجزیے کا متقاضی ہے اور اس تجزیے کو چند مراحل میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ اصولی بات یہ ہے کہ اپنی رائے کو ہمیشہ غالب رکھنا بھی ایک نقص ہے اور اسے ہمیشہ مغلوب رکھنا بھی ایک کمی ہے۔ ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ آدمی کے اندر جو رائے بنتی ہے اس کا اصول تشکیل و تکمیل کیا ہے؟ اور اس رائے کے صحیح یا غلط ہونے کا تعین جس معیار سے کیا جائے گا خود وہ معیار کیا ہے؟ یہ دو باتیں اگر کھل جائیں تو ان شاء اللہ گفتگو کے اگلے مراحل سہل اور ہموار ہو جائیں گے۔

جس دائرے میں رہ کر ہم کلام کر رہے ہیں وہاں رائے کو دو قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک وہ رائے جو کسی چیز کو ماننے سے بنتی ہے اور دوسری وہ جو کسی کو جاننے سے پیدا ہوتی ہے۔ ایک مسلمان کے لیے، اس کی ذہنی صلاحیتوں سے قطع نظر، حق کو اس کی ضروری تفصیلات کے ساتھ ماننا بھی لازمی ہے اور جاننا بھی۔ اس تسلیم و ادراک کے بارے میں صحیح اور غلط ہونے کا فیصلہ ذہن سے نہیں بلکہ قرآن و سنت سے ہوگا، جو اس معاملے میں واحد کسوٹی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جو شخص اس کسوٹی کا ناگزیر ہونا تسلیم نہیں کرتا اور حق کو محض اپنے

دلائل کی بنیاد پر ماننے اور جاننے کا دعویٰ کرتا ہے، وہ خود رائے ہے۔ اس کی نظر میں خود قرآن و سنت مداح حق نہیں بلکہ حق کی طرف اشارہ کرنے والی چیزیں ہیں اور اس اشارے کی تکمیل اس کی عقل کرتی ہے۔ دوسری طرف وہ آدمی ہے جو کسی بھی معاملے میں کوئی مضبوط موقف نہیں رکھتا۔ بلاشبہ یہ شخص حق کو جاننے اور ماننے کا قرآنی تقاضا پورا نہیں کرتا اور حق سے وابستگی کی ابتدائی سطح سے بھی محروم ہے۔ مختصر یہ کہ خود رائی ہو یا فقدان رائے دونوں حق سے دوری کے مظاہر ہیں۔



لہو و لعب

حکم ربانی

— ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ ،
وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ فَأُولَئِكَ هُمُ الْخَسِرُونَ﴾ (النافقون ۶۳: ۹)

اے ایمان والو! تمہارے مال اور تمہاری اولاد تمہیں اللہ کی یاد سے غافل نہ
کرنے پائیں۔ اور جو غافل ہو گئے وہ گھالے میں رہیں گے۔

— ﴿وَإِذَا رَأَوْا تِجَارَةً أَوْ لَهْوًا انفَضُّوا إِلَيْهَا وَتَرَكُوكَ قَائِمًا ، فَلَمَّا
عِنْدَ اللَّهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ ، وَاللَّهُ خَيْرُ الرَّازِقِينَ﴾
(الجمعة ۶۲: ۱۱)

اور اے نبی! بعض لوگ جب کوئی تجارت یا کھیل تماشا دیکھتے ہیں تو اس کی
طرف دوڑ پڑتے ہیں اور آپ کو خطبہ پڑھتے کھڑا چھوڑ دیتے ہیں۔ آپ ان سے کہیں
کہ جو اللہ کے پاس ہے وہ کھیل تماشا اور تجارت سے بہتر ہے اور اللہ بہترین
رزق دینے والا ہے۔

فرمان نبوی

— ”يَأْتِي عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ هَمَّتُهُمْ بُطُونُهُمْ وَشَرَفُهُمْ مَتَاعُهُمْ
وَقَبْلَتُهُمْ نِسَاؤُهُمْ ، وَدِينُهُمْ ذَرَاهِمُهُمْ وَدَنَائِيرُهُمْ ، أُولَئِكَ شَرُّ
الْخَلْقِ لَا خَلَاقَ لَهُمْ عِنْدَ اللَّهِ“ (۱)

ایک وقت آئے گا کہ لوگوں کی ساری جدوجہد پیٹ کے لئے ہوگی۔ عزت کا
معیار دولت ہوگی، عورتیں ان کا قبلہ اور روپیہ پیسہ ان کا دین ہوگا۔ یہ بدترین لوگ
ہوں گے جن کا اللہ کے ہاں کوئی اجر نہ ہوگا۔

(۱) رواہ الدیلمی

— ”إِذَا أَرَادَ اللَّهُ بَعْدَ خَيْرٍ أَرْسَلَ إِلَيْهِ مَلَكًا قَبْلَ الْمَوْتِ فَهَيَّاهُ وَأَرْشَدَهُ وَأَصْلَحَهُ حَتَّى يَمُوتَ عَلَى خَيْرِ حَالٍ، فَيَقُولُ النَّاسُ: رَحِمَ اللَّهُ فَلَانَمَاتٍ عَلَى خَيْرِ حَالٍ - وَإِذَا أَرَادَ اللَّهُ بَعْدَ شَرٍّ أَرْسَلَ إِلَيْهِ شَيْطَانًا فَأَغْوَاهُ وَالْهَاهُ حَتَّى يَمُوتَ عَلَى شَرِّ حَالٍ“ (۲)

اگر اللہ تعالیٰ کسی شخص کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتے ہیں تو موت سے پہلے اس کے پاس فرشتہ بھیجتے ہیں، وہ اس سے رہنمائی لیتا اور اپنے معاملات درست کر لیتا ہے تو اس کی موت پر لوگ کہتے ہیں ”فلاں شخص کی موت خیر پر ہوئی، وہ بھلا آدمی تھا۔“ اور جب اللہ تعالیٰ کے ہاں کسی کی بھلائی نہ لکھی ہو تو اس کے پاس شیطان جاتا ہے اور اسے زور غلاتا اور طول اہل میں مبتلا کر دیتا ہے تو اس کی موت پر لوگ کہتے ہیں کہ فلاں تو بری حالت میں مرا۔

س: لہو و لعب کی تعریف؟

ج: فضولیات میں مشغولیت لہو و لعب ہے اور یہ سب آدمی تفریح کی غرض سے کرتا ہے، حالانکہ نہ اس کا کوئی دینی فائدہ ہے اور نہ دنیاوی بلکہ اس کے برعکس نقصان یقیناً ہے۔ یہ خیال رہے کہ کھیل کود، ہنسی مذاق وغیرہ مسلمان کی زندگی میں وہ رنگ بھرتے ہیں جو اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کو پسند ہیں لیکن لہو و لعب کا معاملہ دوسرا ہے اور اس میں جھوٹ سچ، جائز ناجائز ملا ہوا ہے اور اس میں مشغولیت کم از کم اس پہلو سے قطعاً ناروا ہے کہ یہ انسان کو دینی فرائض سے غافل کر دیتی ہے۔ لہذا اس لحاظ سے یہ شرعاً ناروا ہے حسب قولہ تعالیٰ ”وَإِذَا رَأَوْا تِجَارَةً أَوْ لَهْوًا انْفَضُّوا إِلَيْهَا وَتَرَكُوكَ قَائِمًا - قُلْ مَا عِنْدَ اللَّهِ خَيْرٌ مِنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ -

(۲) رواہ الدیلمی

و اللہ خیر الرازقین۔ (الجمعة: ۶۲: ۱۱)

یعنی اے نبی! بعض لوگ جب کوئی تجارت یا کھیل تماشے دیکھتے ہیں تو اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں اور آپؐ کو خطبہ پڑھتے کھڑا چھوڑ دیتے ہیں۔ آپؐ ان سے کہیں کہ ”جو اللہ کے پاس ہے وہ کھیل تماشے اور تجارت سے بہتر ہے اور اللہ بہترین رزق دینے والا ہے۔“

س: لہو و لعب اور تفریح میں کیا فرق ہے؟

ج: تفریح آدمی کی طبیعت میں فرحت، ذہن میں نشاط اور جسم میں قوت پیدا کرتی ہے۔ یہ تینوں چیزیں مطلوب ہیں۔ دوسرے یہ کہ تفریح اس نفسیاتی خشکی کا بھی علاج ہے جو تکبر، خود غرضی اور مریضانہ ذہنیت کا سبب بنتی ہے۔ یہ تفریح، جس کے خصائص ابھی بیان ہوئے، صرف دو شرائط سے مشروط ہونی چاہیے۔ شریعت کے کسی امر کی خلاف ورزی نہ ہو اور اس میں ایسا انہماک نہ ہو جو بعض بہتر مشغولیات سے غافل کر دے۔ ان دو چیزوں کا خیال رکھتے ہوئے یہ بات شرعاً مستحب ہے کہ مسلمان اپنے نفس اور اپنے بدن کے حقوق پورے کرے یعنی انہیں راحت و قوت فراہم کرے تاکہ زندگی کے تمام معاملات میں اس کا دینی کردار بھی تقویت پائے۔ صحت اور فرصت اللہ کی بہت بڑی نعمتیں ہیں جن سے محرومی بعض فضائل سے محرومی بن جاتی ہے۔ لہذا انہیں حاصل کرنے اور محفوظ رکھنے کی ہر کوشش پسندیدہ ہے۔ لہو و لعب کا یہ معاملہ ہے کہ عموماً اس کی صورت تو تفریح کی ہوتی ہے لیکن اس میں مذکورہ بالا دونوں شرائط کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ مثال کے طور پر لہو و لعب کی عادت کئی شرعی احکام کی خلاف ورزی پر منتج ہوتی ہے اور وقت کا ضیاع اس کا لازمہ ہے۔

س: تفریح اور لہو و لعب میں فرق کرنے کے لیے یہ بہتر نہیں ہوگا کہ ان کے الگ الگ مظاہر بیان کر دئے جائیں؟

ج: تفریح کے مظاہر:

۱۔ ہر طرح کی جسمانی ورزش (جس میں آداب ستر ملحوظ رکھے جائیں)۔ (۱)

۲۔ لمبی سیر

۳۔ تیراکی

۴۔ مناظر فطرت کا مشاہدہ، خواہ اس کے لیے سفر ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔

۵۔ عزیزوں دوستوں کے درمیان ایسا نہی مذاق جو کسی کی دلآزاری کا سبب نہ بنے اور اس میں غیبت، فحش گوئی، جھوٹ وغیرہ کی آمیزش بھی نہ ہو۔

۶۔ ایسی کتابوں کا مطالعہ جو طبیعت پر خوشگوار اثر مرتب کرے۔ اس میں بھی وہی احتیاطیں ہیں جو نہی مذاق کے معاملے میں بتائی گئی ہیں۔ البتہ جھوٹ کی آمیزش کی شرط یہاں ساکت ہے کیونکہ اس طرح کا لٹریچر فرضی صورتحال پر مشتمل ہوتا ہے لہذا قاری اس کے مندرجات پر یقین کرنے کی نیت سے ان کا مطالعہ نہیں کرتا۔

تاہم یہ ذہن میں رہے بعض تفریحات جائز ہونے کے باوجود کسی مصلحت اور ثقاہت کے منافی ہو سکتی ہیں۔

لہو و لعب کے مظاہر

وہ تمام کھیل جو غافل اور بے عمل لوگوں کا شعار بن گئے ہیں۔ یہ ملحوظ رہے کہ تفریح اور

لہو و لعب میں طبیعت کی فرحت مشترک ہے لیکن ذرائع اور نتائج مختلف ہیں۔ تفریح

۱۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد، باب اللہو بالحراب و نحوہا

کے ذرائع جائز اور نتائج مطلوب ہیں، جبکہ لہو و لعب کی ایک خطرناک قسم وہ ہے جو دینی رنگ میں اپنا اظہار کرتی ہے مثلاً عید میلاد النبی، بزرگوں کے عرس منانا، قوالیاں، دھمال، اکثر مناظرے اور جاہل عالموں کے وعظ، بزرگوں کے جھوٹے تذکرے سننا سنانا، پراسرار باتوں میں دلچسپی وغیرہ۔ غرض اس طرح کے لہو و لعب کو پہچاننے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ آدمی سنت و بدعت کے فرق کا علم حاصل کرے۔ دینی زندگی میں بدعت ہی لہو و لعب کی ماں ہے۔

س: لہو و لعب کے نقصانات کیا ہیں؟

ج: لہو و لعب کا سب سے بڑا نقصان تو یہی ہے کہ آدمی دینی مزاج سے محروم ہو جاتا ہے۔ باقی نقصانات کی کچھ تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ غفلت

۲۔ اسراف

۳۔ لوگوں کو ایذا پہنچانا

۴۔ وقت کا ضیاع

۵۔ جھوٹ، غیبت، بہتان، فحش گوئی، نفس پرستی وغیرہ کا میلان۔

۶۔ دین کے دو بنیادی فضائل یعنی خشیت الہی اور اتباع رسول ﷺ کا فقدان۔

۷۔ دنیا کی بربادی

۸۔ لہو و لعب کا اس سے بڑا نقصان کیا ہو سکتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے فرمان کے مطابق

اس سے آدمی کی آخرت برباد ہو سکتی ہے اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہو سکتا ہے۔ (۱)

۱۔ جامع الترمذی، ابواب الزہد، باب ما جاء من تکلم بالکلمۃ لیضحک الناس، باب من حسن اسلام المرء ترک ما لا یعنیه

ج: اس کا علاج کیا ہے؟

ج: اس کے علاج کا اصول کوئی مثبت اور مقصدی مصروفیت ہے۔ وہ اختیار کر لی جائے تو ان شاء اللہ اس سے نجات مل جائے گی مثلاً تعلیم و تعلم، کوئی فن سیکھنا سکھانا اور کوئی تفریحی سرگرمی وغیرہ۔



تن آسانی و آرام طلبی

حکم ربانی

— وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لِنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ ﴿٢٩﴾

(العنکبوت ۲۹: ۶۹)

اور جو لوگ ہماری خاطر مشقتیں اٹھائیں گے انہیں ہم اپنا راستہ دکھائیں گے۔
یقیناً اللہ نیکی کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

— وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتَّى يَأْتِيَكَ الْيَقِينُ ﴿١٥﴾ (الحجر ۱۵: ۹۹)

اپنے رب کی عبادت کیا کریں یہاں تک کہ آپ کا آخری وقت آجائے۔

فرمان نبوی

— ”نِعْمَتَانِ مَغْبُونٌ فِيهِمَا كَثِيرٌ مِنَ النَّاسِ الصِّحَّةُ وَالْفَرَاغُ“ (۱)
— دو نعمتیں ہیں، اکثر لوگ (ان کے غلط استعمال کی وجہ سے) خسارے اور گھائے
میں رہیں گے، صحت اور فراغت۔

”عن عائشة رضي الله عنها، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَقُومُ مِنَ اللَّيْلِ
حَتَّى تَنْفَطِرَ قَدَمَاهُ، فَقُلْتُ لَهُ: لِمَ تَصْنَعُ هَذَا يَا رَسُولَ اللَّهِ وَقَدْ غَفَرَ
اللَّهُ لَكَ مَا تَقْدِمُ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ؟ قَالَ: أَفَلَا أَحِبُّ أَنْ أَكُونَ
عَبْدًا شَكُورًا؟“ (۲)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ رات کو (اتنا لمبا)
قیام فرماتے کہ آپ کے پیر مبارک پھٹ جاتے، میں نے آپ سے عرض کیا، آپ
ایسا کیوں کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے تو آپ کے اگلے پچھلے تمام گناہ معاف فرما
دیئے ہیں؟ آپ نے ارشاد فرمایا: ”کیا میں اس کا شکر گزار بندہ نہ ہوں؟“

(۱) صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب ماجاء فی الرقاق وان لاعیش الاعیش الآخرہ

(۲) صحیح بخاری، کتاب التہجد، باب قیام النبی ﷺ

س: اس کی تعریف؟

ج: جہاں مشقت ضروری ہو وہاں بھی اپنی راحت ڈھونڈنا، آرام طلبی ہے۔ اس کا مبنی نفس میں موجود خود غرضی، پست ہمتی، نشاط پسندی اور منفی آزادی ہے۔ گویا آرام طلبی مختلف امراض نفس کی علامت ہے۔

س: اس کے اہم مظاہر کیا ہیں؟

ج: جیسا کہ ہم نے ابھی اوپر عرض کیا کہ آرام طلبی بذات خود کوئی مرض نہیں ہے بلکہ ایک مظہر (Symptom) ہے جس سے متعدد امراض کی طرف اشارہ ہوتا ہے، اس لیے اس کے مظاہر بھی خاصے متنوع ہوتے ہیں اور کسی نہ کسی نفسی خرابی پر دلالت کرتے ہیں مثلاً:

— کسل

— جبن

— خود غرضی

— دین کے نظام العمل سے مکمل مغایرت

— معاشرے سے لاتعلقی

— محبت کا فقدان

— اسراف..... وغیرہ

س: اس کے نقصانات کیلئے ہیں؟

ج: اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ آدمی وہ دینی جذبہ، طرز احساس اور مزاج نہیں پیدا کر سکتا جو مسلمان ہونے کے لیے ضروری ہے۔ بندگی سخت کوشی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ آرام طلب آدمی اس لازمی شرط ہی کو پورا نہیں کرتا۔ اس لیے

غالباً یہ کہا جاسکتا ہے کہ آرام طلبی دینداری کی ضد ہے یعنی مسلمان بہت سی غلطیاں کر سکتا ہے لیکن آرام طلب نہیں ہو سکتا۔ البتہ یہ خیال رہے کہ بعض مشقتیں عظمت کے مطالبے سے پیدا ہوتی ہیں، ان مشقتوں سے جی چرانا آرام طلبی نہیں ہے۔ آرام طلب آدمی شریعت کی واجب کردہ محنت و مشقت سے منہ موڑتا ہے۔ باقی نقصانات اس کے مذکورہ بالا مظاہر سے واضح ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ دینی احکام پر کما حقہ عمل ایک گونہ مجاہدے اور مشقت کا متقاضی ہے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی یہ صفت بیان فرمائی کہ یہ وہ لوگ ہیں جو راتوں و آرام دہ بستروں سے اٹھ کر عبادت کی مشقت اٹھاتے ہیں (السجدہ ۲۳: ۱۶) اور اللہ کی راہ میں سبسہ پلائی دیوار کی طرح جم کر لڑتے ہیں (الصّف ۶۱: ۴) اور آنحضرت ﷺ قیام اللیل میں اتنی مشقت اٹھاتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کو مدخلت کرنا پڑی کہ اس مشقت کو کم کرو (الزمر ۷۳: ۱۰) اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ وہ آرام طلبی اور عیش کوشی سے بچیں کہ یہ انہیں زیبا نہیں (۱) اور انہیں عیش کوشی کے مظاہر سے بچنے کا حکم دیا جیسے فرمایا کہ ریشمی لباس نہ پہنو (۲)، اپنے کام خود کرو، کسی سے نہ کہو (۳) اور رزق الکفاف (جس سے بمشکل گزر بسر ہو سکے) پر مطمئن رہو (۴)۔

س: اس کا علاج کیا ہے؟

ج: اس کے علاج کی چند سادہ تدابیر ہیں جن پر ذمہ داری سے عمل کر لیا جائے تو

۱۔ مسند احمد بن حنبل، ج ۵ ص ۲۴۳، المکتب اسلامی، بیروت ۱۹۸۳ء

۲۔ صحیح مسلم، کتاب اللباس، باب تحریم لبس الحریر وغیر ذلک للرجال

۳۔ صحیح مسلم، کتاب الزکاة، باب کراهة المسألة للناس

۴۔ سنن ترمذی، ابواب الزهد، باب ما جاء فی الکفاف

ان شاء اللہ تعالیٰ اس مرض کا مکمل خاتمہ ہو سکتا ہے:

- ۱۔ نماز باجماعت کی پابندی
- ۲۔ تہجد کی کوشش
- ۳۔ دو چار مہینوں میں کچھ نفلی روزے
- ۴۔ کثرتِ تلاوت
- ۵۔ سخت جگہ پر سونا
- ۶۔ باقاعدگی سے ورزش کرنا



فریب دہی

حکم ربّانی

— وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ بَغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوا

فَقَدْ اخْتَمَلُوا بُهْتَانًا وَإِثْمًا مُّبِينًا ﴿٥٨﴾ (احزاب ۳۳: ۵۸)

اور جو لوگ مومن مردوں اور مومن عورتوں کو ایذا پہنچائیں بغیر اس کے کہ انہوں نے کچھ کیا ہو تو انہوں نے بہتان کا اور صریح گناہ کا بوجھ اٹھایا۔

— اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ۚ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ﴿٢١﴾ (تكاثر ۱۰۲: ۲۱)

لوگو! تمہیں بہت زیادہ حرص نے غافل کر دیا ہے یہاں تک کہ تم قبروں میں جا پہنچتے ہو۔

فرمان نبوی

— ”مَنْ غَشَّ فَلَيْسَ مِنَّا.....“ (۱)

جس نے ہم سے دھوکا کیا وہ ہم میں سے نہیں۔

— ”بُئْسَ الْعَبْدُ عَبْدُ تَخِيلٍ وَ اخْتَالٍ وَ نَسَى الْكَبِيرَ الْمُتَعَالِ.....“ (۲)

بدترین بندہ وہ ہے جو اللہ کی کبریائی کو بھول جائے اور تکبر کرے اور لوگوں کو دھوکہ دے۔

(۱) صحیح مسلم، کتاب ایمان، باب من غشا فلینس منا

(۲) جامع الترمذی، کتاب صفة القيامة، باب حديث اضاعة الناس الصلاة وحديث ضمانهم العباد

فریب دہی

س: اس کی تعریف؟

ج: دھوکے کی تعریف تو دھوکے کے نام میں موجود ہے البتہ اس کی کچھ اقسام ہیں جنہیں الگ الگ بیان کر دینا چاہیے؟

۱۔ جھوٹ: اس کا دھوکا ہونا ظاہر ہے۔

۲۔ نفاق: یہ دھوکے کی وہ قسم ہے جو آدمی اپنے آپ کو بھی دیتا ہے اور دوسروں کو بھی۔ یعنی غلط بات کو صحیح جان کر خود کو فریب دیتا ہے اور صحیح بات پر یقین نہ رکھتے ہوئے زبان سے اس کا اظہار کر کے دوسروں کو۔ نیز نفاق کی ایک سطح وہ بھی ہے جو انسان کی معاشرت میں کارفرما ہو۔ ہم کسی کے بارے میں جو رائے رکھتے ہیں اگر اس کے برعکس رائے کا اظہار کریں گے تو یہ بھی نفاق کی ایک علامت ہے۔ اس طرح کے نفاق میں چونکہ بہت سے لوگ مبتلا ہیں لہذا اس کے کچھ عملی مظاہر بتائے جاتے ہیں تاکہ انہیں پہچاننے میں آسانی ہو اور ان سے بچنے کی تدبیر کی جاسکے:

(۱) کسی شخص کو دل سے برا جاننا مگر زبان سے اس کی مدح کرنا: اس کی ایک تفصیل ہے۔ کسی ظالم کے ظلم سے بچنے کے لیے تو یہ کیا جاسکتا ہے بلکہ بعض مصلحتوں کی وجہ سے کہیں کہیں ایسا کرنا ضروری بھی ہو جاتا ہے، یہ نفاق نہیں ہے۔ نفاق یہ ہے کہ طمع اور بزدلی وغیرہ کی وجہ سے کسی کو ناپسند کرنے کے باوجود اسے یہ باور کروانے کی کوشش کی جائے کہ میں تمہارے بارے میں اچھی رائے رکھتا ہوں۔ اسی لیے مبالغہ آمیز مداحی اور خوشامد کو شریعت برا سمجھتی ہے۔ مذکورہ نفاق کا درجہ تو

ان دونوں سے بڑھا ہوا ہے۔ اسی طرح کسی شخص کے بارے میں اگر دل میں تکدر محسوس ہو تو اس سے حسن اخلاق کا مظاہرہ کرنا نفاق نہیں ہے۔ خواہ یہ تکدر بالکل صحیح

بنیاد پر ہی کیوں نہ ہو، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کے اسوۂ حسنہ سے پتہ چلتا ہے (ا)

(ب) خوشامد: یہ نفاق کی وہ قسم ہے جو ہماری معاشرت میں بہت عام ہے۔ خوشامد کرنے والا عموماً زبان اور دل میں ایک نہیں ہوتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ خوشامد کے کچھ مظاہر اس طرح کے نفاق سے خالی ہو سکتے ہیں تاہم ان کی قباحت دوسری ہے مثلاً جھوٹ، لالچ وغیرہ

(ج) تواضع اور خوش اخلاقی میں مبالغہ بھی نفاق ہے جس سے لوگ دھوکہ کھاتے ہیں اور اس میں مبتلا شخص بھی عموماً اپنے آپ کو متواضع اور خوش اخلاق سمجھتا رہتا ہے حالانکہ وہ اندر سے ایسا ہوتا نہیں ہے۔ اس خرابی میں مبتلا شخص کی ایک آسان سی پہچان یہ ہے کہ اس میں دینی حمیت نہیں ہوتی، یہ دین کے استخفاف پر بھی اپنی مصنوعی خوش اخلاقی کے خول سے نکلنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ نیز ایسا آدمی اکثر اپنے گھر میں اور زبردستوں کے ساتھ تکبر اور بد خلقی کا مظاہرہ کرتا ہے۔

(د) ریا: اس کی مفصل تعریف تو بیان کی جا چکی ہے۔ یہ فریب کاری کی ماں ہے۔ یہاں ہمارے لیے اتنا ہی جان لینا کافی ہوگا کہ ایسا شخص ظاہر اور جلوت معمور رکھتا ہے جبکہ اس کا باطن اور خلوت ویران ہو چکی ہوتی ہے۔ اس انتہائی بڑی خرابی میں دینداروں کی ایک قابل لحاظ تعداد مبتلا ہے۔

۳۔ ناپ تول میں کمی

۴۔ کسی آدمی کو اپنے فائدے کے لیے خوش فہمی میں مبتلا کر کے نقصان پہنچانا یا یہ عمل

صحیح بخاری، کتاب الادب، باب لم یکن النبی فاحشاً ولا متفاحشاً

محض تفریح طبع کے لیے کرنا۔

۵۔ بچوں کو بہلانے کے لیے جھوٹا وعدہ کرنا یا جھوٹا عذر گھڑنا وغیرہ حتیٰ کہ جانوروں کو چکمہ دینا بھی اسی قبیل میں آتا ہے۔

۶۔ کام چوری بھی ایک دھوکا ہے کیونکہ آدمی اپنے آجریا افسر کو اس سے بے خبر رکھتا ہے۔

۷۔ حکومتی محصولات سے بچنے کے لیے غلط اعداد و شمار دینا۔

س: فریب دہی کے نقصانات؟

ج: ۱۔ ایک دھوکا کئی گناہوں کا مجموعہ ہوتا ہے، مثلاً جھوٹ، نفاق، ریا، کسب حرام، ایذائے مسلم وغیرہ، لہذا اس ایک عمل سے کئی گناہوں کی سزا کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔

۲۔ دھوکا دہی کی عادت کئی بڑی خرابیوں کا سبب بن سکتی ہے۔ ان خرابیوں کو گناہ کے معنی میں لیا جائے تو ان کا بیان اوپر ہو چکا اور انہیں نقصان کے معنی میں لیا جائے تو اس کی ایک لمبی فہرست بنائی جاسکتی ہے مثلاً دنیا و آخرت کی رسوائی، لوگوں کی نظر میں بے اعتباری، بے غیرتی وغیرہ۔

۳۔ اس کا ایک نقصان ایسا ہے جس کا الگ سے ذکر کرنا ضروری ہے، اور وہ یہ کہ ایسا آدمی بندگی کے کسی بھی عمل میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ یہ لاکھ نمازیں بھی پڑھ لے تو ان میں ایک نماز بھی شریعت کے کم از کم معیار پر پوری نہیں اترے گی اور یہ شاخسانہ ہے طبیعت کی اس کجی کا جو اس عادت سے لازماً پیدا ہوتی ہے۔

س: اس کا علاج کیا ہے؟

ج: اس کا سادہ سا علاج تو یہی ہے کہ جنہیں دھوکا دیا ہے، ان سے معافی حاصل کی جائے خواہ وہ معافی دھوکے کا ازالہ کر کے ہو خواہ ان کے آگے رونے ٹڑٹڑانے سے حاصل ہو۔ اس کے بعد اس بری عادت سے توبہ کر کے اس سے باز رہنے کا پختہ عزم کر لیا جائے۔ کچھ اور علاج بھی ہیں جو بظاہر براہ راست نہیں ہیں تاہم ان کا موثر ہونا تجربے اور مشاہدے سے ثابت ہے مثلاً:

— سبحان اللہ و بحمدہ، سبحان اللہ العظیم اور استغفار کی کثرت

— لوگوں سے کم میل جول رکھنا۔

— جو چیز معاشرے میں امتیازی حیثیت رکھتی ہو، صلاحیت اور قدرت ہونے کے باوجود اسے اختیار نہ کرنا۔

— کفایت شعاری اور قناعت

— زیارتِ قبور، ہفتے میں کم از کم ایک مرتبہ۔



مایوسی اور ڈپریشن

حکم ربانی

﴿وَإِذَا أَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً فَرِحُوا بِهَا وَإِنْ تُصِيبُهُمْ سَيِّئَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ
أَيْدِيهِمْ إِذَا هُمْ يَقْنَطُونَ﴾ (الروم: ۳۶)

لوگوں کو جب ہم نعمت دیتے ہیں تو وہ اس پر پھول جاتے ہیں اور اگر ان کے اعمال
کی وجہ سے انہیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو مایوس ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔

﴿لَا يَسْتَسْمِ الْإِنْسَانُ مِنْ دُعَاءِ الْخَيْرِ وَإِنْ مَسَّهُ الشَّرُّ فَيُئْسِرْ﴾
قَنُوطُ ﴿حَمَّ السَّجْدَةِ، ۴۱: ۴۹﴾

انسان اپنے لیے بھلائی مانگتے نہیں تھکتا لیکن اگر اسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو
مایوس اور دل شکستہ ہو جاتا ہے۔

فرمان نبوی

— ”ضحک ربنا من قنوط عبادہ وقرب غیرہ“ (۱)

اللہ تعالیٰ اس شخص (کی نادانی) پر ہنستے ہیں جو اس سے مایوس ہو کر غیر سے امیدیں
وابستہ کرتا ہے۔

— ”دخلنا على النبي ﷺ وهو يعالج شيئاً فاعناه عليه، فقال:

لا تياسا من الرزق ماتهنزت رؤسكما، فان الانسان تلده امه احمر

ليس عليه قشر، ثم يزرقه الله عز وجل“ (۲)

دو صحابی کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس گئے۔ آپ اس وقت گھر کا
کچھ کام کر رہے تھے، ہم نے آپ کا ہاتھ بٹایا۔ آپ نے فرمایا رزق کے معاملے
میں کبھی اللہ سے مایوس نہ ہونا خواہ تمہاری حالت کتنی ہی کمزور ہو۔ تم دیکھتے نہیں کہ
جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو کتنا کمزور اور عاجز ہوتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ اس کے رزق کا
انتظام کرتے ہیں۔

(۱) سنن ابن ماجہ، کتاب السنۃ، باب فیما انکرت الجہمیہ

(۲) سنن ابن ماجہ، کتاب الزہد، باب التوکل والیقین

س: مایوسی سے کیا مراد ہے؟

ج: کسی عمل کے مطلوبہ نتائج نہ نکلنے سے بعض لوگوں پر ایک کیفیت طاری ہو جاتی ہے جو ان سے وہ عمل بھی ترک کروادیتی ہے۔ اس کیفیت کو مایوسی کہتے ہیں۔ مایوسی کی کئی قسمیں اور کئی اسباب ہیں تاہم ترک عمل اس کا بنیادی خاصہ ہے۔ مایوس آدمی ترک عمل کے ساتھ ساتھ بعض حالات میں اللہ سے شکا کی بھی ہو جاتا ہے۔ یہ وہ صورت ہے جو دینی اعتبار سے انتہائی خطرناک ہے۔

س: مایوسی کے اسباب کیا ہیں؟

ج: مایوسی کے چند بڑے اسباب و محرکات یہ ہیں:

- ۱۔ ارادے کا پورا نہ ہوسکنا: مثلاً ایک آدمی نماز پڑھنے کی خواہش رکھتا ہے اور تھوڑی بہت کوشش بھی کرتا ہے لیکن اس میں کامیاب نہیں ہو پاتا۔ یہ ناکامی اسے مایوسی کی طرف دھکیل دیتی ہے اور وہ یہ سوچ کر اپنی کوششیں چھوڑ دیتا ہے کہ میں کچھ بھی کر لوں نمازی نہیں بن سکتا۔
- ۲۔ کسی عمل کے مطلوبہ نتائج نہ برآمد ہونا: مثلاً نماز پڑھنا مگر خشوع و خضوع حاصل نہ ہونا، ذکر کرنا لیکن اطمینان قلب سے محروم رہنا، رزق حلال کا اہتمام رکھنا مگر افلاس سے نجات نہ پانا۔ قرآن پڑھنا مگر طبیعت پر اس کا اثر نہ ہونا، کوئی پسندیدہ دینی منصوبہ بنانا مگر اسے رو بہ عمل لانے میں مسلسل ناکامیوں کا سامنا کرنا، کسی چیز کے لیے دعائیں کرنا مگر وہ چیز حاصل نہ ہونا وغیرہ۔
- ۳۔ دنیاوی زندگی کا غلط تصور یعنی دنیاوی مسائل اور مشکلات کی وجہ سے یہ خیال پیدا ہونا کہ دین پر چلنے کا دنیا میں کوئی فائدہ نہیں۔ یہ خیال رفتہ رفتہ آدمی میں مایوسی کا مستقل حال پیدا کر دیتا ہے۔

۴۔ انسانی کمزوریوں اور خرابیوں کا شدید تاثر: یعنی ایک شخص کو اتفاق سے زیادہ تر ایسے لوگ ملتے ہیں جو بددیانت، وعدہ خلاف، ظالم..... وغیرہ ہوتے ہیں۔ مسلسل پیش آنے والے اس تجربے سے بھی مایوسی کی وہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جو اسے گرم جوشی کے ساتھ دین سے وابستہ نہیں رہنے دیتی۔

۵۔ غمگین طبیعت اور قنوطی ذہنیت: یہ نفسیاتی عوارض ہیں جن میں مبتلا ہو کر آدمی مستقبل کی ہر صورت اور اپنے پورے حال سے مایوس رہتا ہے۔

س: مایوسی کے نقصانات کیا ہیں؟

ج: اس کے چند بڑے نقصانات یہ ہیں:

۱۔ مایوسی کا کم سے کم نقصان بھی بندگی میں ضعف پیدا کرتا ہے اور انتہائی نقصان یہ ہے کہ آدمی کفر تک جا پہنچتا ہے۔ گویا مایوسی کی ہر سطح پر ایک چیز مشترک ہے اور وہ یہ کہ اس سے اللہ کے ساتھ تعلق کمزور پڑ جاتا ہے۔

۲۔ اللہ کی رحمت، نعمت اور قدرت کا عدم استحضار: مایوسی کی انتہا یہ ہوتی ہے کہ آدمی یہ سمجھنے لگتا ہے کہ مایوسی کے سبب کو کوئی نہیں بدل سکتا۔ یہ خیال اتنا غالب آ جاتا ہے کہ اسے یہ احساس بھی نہیں رہتا کہ اللہ اس پر قادر ہے یا اس کی مہربانی عام ہے یا اس کی نعمتوں کا اندازہ بھی نہیں لگایا جاسکتا۔ یہ وہ حالت ہے جس کے بارے میں مشہور ہے کہ مایوسی کفر ہے۔ اس حالت کی دو پہچانیں ہیں۔ اس میں مبتلا شخص دعا کرنے کے تصور ہی سے بیزاری محسوس کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے شکایت کا اعلان کرتا پھرتا ہے مثلاً (نعوذ باللہ) اللہ نے میرے ساتھ بڑا ظلم کیا،

”کیا امتحان کے لیے میں ہی رہ گیا تھا؟“ ”سمجھ میں نہیں آتا کہ اللہ نے مجھے پیدا کیوں کیا؟“..... وغیرہ وغیرہ۔

۳۔ ناشکری یعنی اللہ کی بے شمار نعمتوں کا احساس نہ رہنا۔

- ۴۔ خود غرضی: ایسا آدمی ہمیشہ اپنے ہی بارے میں سوچتا رہتا ہے اور دوسروں کے کام آنے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتا ہے۔
- ۵۔ سنگ دلی اور بے حسی: جو لوگ معاشرے وغیرہ کی طرف سے مایوس ہو جاتے ہیں وہ طبعاً سنگ دلی کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ مایوسی میں اضافے کے ساتھ ساتھ اس خرابی میں بھی زیادتی ہوتی رہتی ہے۔ ایسے لوگ اپنے ارد گرد کی خرابیاں تو گنوا دیتے ہیں مگر انہیں دور کرنے میں خود جو کردار ادا کر سکتے ہیں نہیں کرتے۔
- ۶۔ خود کشی کا میلان: یہ نفسیاتی مایوسی کا لازمی اثر ہے۔
- ۷۔ منشیات کا استعمال: مایوس آدمی تسکین کے ایسے ذرائع ڈھونڈتا ہے جنہیں اخلاق اور معاشرہ قبول نہیں کرتا۔ اس لیے اس حالت میں مبتلا لوگوں کی اکثریت منشیات کی طرف چلی جاتی ہے۔
- ۸۔ انتقام پسندی: مایوسی کی اکثر قسمیں آدمی کے اندر انتقام اور تخریب کے جذبات پیدا کر دیتی ہیں۔
- ۹۔ انسانوں خصوصاً والدین اور بھائی بہنوں سے نفرت: مایوس آدمی کی ایک نفسیات یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ ان چیزوں سے چڑنے لگتا ہے جو اس کے قریب ہوں اور اس کی دسترس میں ہوں۔ اس لیے ایسا شخص سب سے پہلے ان لوگوں کو نشانہ نفرت و تحقیر بناتا ہے جو اس کے ہمدرد اور خیر خواہ ہوں اور اس سے محبت کرنا جن کی مجبوری ہو۔ ایسے لوگ ظاہر ہے کہ والدین، بھائی بہن، بیوی بچے یا قریبی دوست ہی ہو سکتے ہیں۔
- ۱۰۔ بے عملی
- ۱۱۔ ہر چیز کو منفی انداز میں دیکھنا۔

۱۲۔ پاگل پن: مایوسی اپنی جگہ ایک ایسا مرض ہے جو ذہنی خرابی سے پیدا ہوتا ہے۔ جیسے جیسے اس میں شدت پیدا ہوتی جاتی ہے یہ خرابی بڑھتی جاتی ہے یہاں تک کہ مکمل دیوانگی کی نوبت آ جاتی ہے۔

س: مایوسی کے بعض اسباب حقیقی اور واقعی ہوتے ہیں کیا اس صورت میں بھی مایوسی گناہ ہے؟
ج: بلاشبہ مایوسی کا سبب زیادہ تر حقیقی ہوتا ہے لیکن اس سے ہمیں کوئی بحث نہیں ہے۔ ہماری گفتگو کا موضوع یہ ہے کہ مایوسی کا محرک نارمل اور حقیقی نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر ہر آدمی جانتا ہے کہ بعض خرابیوں یا محرومیوں کا ازالہ ضروری ہونے کے باوجود ناممکن ہے لیکن یہ احساس چند لوگوں کو مایوسی کی طرف دھکیل دیتا ہے جب کہ باقی لوگ کام میں لگے رہتے ہیں یا تنگ آ کر متعلقہ کوشش کو چھوڑ کر کوئی اور ہدف تلاش کر لیتے ہیں یا اور کچھ نہیں تو ہاتھ پر ہاتھ دھر کے اللہ کی رحمت کے انتظار میں بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ تینوں رد عمل بالکل نارمل ہیں اور آدمی کو اس کی معیاری سطح پر قائم رکھتے ہیں جبکہ وہ شخص جو مایوس ہو گیا، مایوسی کا مضبوط سبب تو یقیناً رکھتا ہے لیکن اس کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں کہ اس سبب نے اسے امید کے بیشمار اسباب سے منقطع کیوں کر دیا۔ اس کا اصلی جواب یہ ہے کہ مایوسی کا غلبہ عام طور پر ایسے لوگوں پر ہوتا ہے جو انسانیت، انسانی ذمہ داری اور زندگی کا نہایت محدود بلکہ غلط تصور رکھتے ہیں۔ امید سے خالی ہو جانا کسی بھی دلیل اور سبب سے انسانی حال نہیں ہے، خاص طور پر مسلمان کے لیے تو یہ اس کا دینی فریضہ ہے کہ مسلسل ناکامیاں بھی اسے کم از کم ناامید نہ ہونے دیں، چاہے کامیابی کی لگن اور اس کے لیے درکار کوشش کمزور ہی کیوں نہ پڑ جائے۔

مختصر یہ کہ مایوسی سمجھ میں آنے والے اسباب کے باوجود ذہن اور طبیعت کے

رد عمل کی وہ قسم ہے جو آدمی کو اپنی فطرت پر استوار نہیں رہنے دیتی۔ یہاں فطرت سے مراد انسان کے وہ مجموعی حدود ہیں جن سے تجاوز کرنا انسانی فعل یا حال نہیں کہلائے گا۔ اپنی استعداد پر نظر کر کے کسی مطلوب کام کے نہ ہو سکنے کا یقین مایوسی نہیں ہے، البتہ یہی یقین جب اہمیت اختیار کر جائے اور معاملہ اپنی استعداد اور صلاحیت سے بڑھ کر اللہ کی قدرت و انصاف وغیرہ تک پہنچ جائے تو اس سے جو شکایت آمیز حالت پیدا ہوتی ہے وہ کسی بھی دلیل سے بندگی کی حالت نہیں کہلا سکتی۔ گویا مایوسی بندگی کے لازمی احوال اور شعور کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ اس کا تسلط اول تو آدمی کو ضروری عمل کے قابل ہی نہیں چھوڑتا اور اگر تھوڑے بہت عمل کی صورت پیدا بھی ہو جائے تو اس سے وہ ضروری تعلق باقی نہیں رہتا جو بندے اور اس کے اعمال کے درمیان ہونا لازمی ہے۔ اس پہلو سے دیکھیں تو مایوسی صرف عمل ہی نہیں بلکہ اس کی نیت اور اس کے شعور کو بھی مسخ کر دیتی ہے۔ عمل کی نیت اور شعور ہمیں اس کی نتیجہ خیزی کا یقین دلاتا ہے۔ یہ یقین ہی نہ رہے تو عمل کرنا یا نہ کرنا برابر ہے۔

مایوسی کے انہی نقصانات کی وجہ سے اللہ تعالیٰ (۱) اور اس کے رسول ﷺ (۲) نے بار بار فرمایا ہے کہ انسان کو کسی حالت میں بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے اور اسے انسان کی تھڑ دلی قرار دیا ہے کہ وہ ذرا تکلیف آئے تو اللہ کی ساری نعمتوں کو بھلا کر مایوس ہونے لگتا ہے۔ (۳) اور انسان کو بار بار یہ یقین دلانے کے بعد کہ اللہ ہر وقت انسان کی مدد کرنے پر قادر ہے (۴) اور وہ اپنی طرف لوٹنے والوں کو پسند بھی کرتا ہے (۵)

۱۔ یوسف ۱۲: ۸۷، الزمر ۳۹: ۵۳

۲۔ صحیح مسلم، کتاب التوبہ، باب فی رحمة اللہ تعالیٰ وانہا تغلب غضبہ، ومن ابن ماجہ، کتاب الزہد، باب التوکل والیقین

۳۔ بنی اسرائیل ۱۷: ۸۳، فصلت ۴۱: ۴۹

۴۔ النمل ۲۷: ۶۲، النساء ۴: ۴۵، وغیرہ

۵۔ التوبہ ۹: ۱۰۴

یہ انداز بھی کیا ہے کہ اس کے باوجود جو مایوس ہو کر اللہ سے منہ موڑتے ہیں وہ گمراہ (۱) اور کافر ہیں (۲) اور دنیا میں ذلت و نامرادی کے علاوہ آخرت میں بھی ان کا ٹھکانا دوزخ ہو گا۔ (۳)

س: مایوسی کے بارے میں کافی سخت باتیں ہو گئیں۔ تجربے میں آیا ہے کہ مایوسی کی کئی قسمیں ہیں۔ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ پہلے ان قسموں کو بیان کر دیا جائے تاکہ تشخیص اور علاج میں آسانی رہے؟

ج: اصولی طور پر مایوسی کی دو ہی قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک ترک عمل تک پہنچا دیتی ہے جبکہ دوسری میں عمل کی صورت بدل جاتی ہے۔ وہ مایوسی جو بے عملی کا سبب بنتی ہے مضر ہے جب کہ دوسری قسم بعض شرائط کے ساتھ تو مضر ہو سکتی ہے لیکن اگر وہ شرائط نہ پائی جائیں تو اس کا کوئی دینی ضرر نہیں ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک ضروری دینی عمل سے مطلوبہ نتائج حاصل نہ ہونے کی صورت میں ایک آدمی خود اس عمل کی افادیت اور اہمیت کا منکر ہو جاتا ہے اور اسے چھوڑ بیٹھتا ہے جبکہ دوسرا آدمی اسی صورت حال میں اس عمل کی کسی دوسری افادیت کو اپنا ہدف بنا لیتا ہے اور اس عمل پر قائم رہتا ہے۔ وہ شرائط جن کی موجودگی اس دوسرے آدمی کے لئے مضر ہے، ان میں بنیادی طور پر ایک چیز پائی جاتی ہے اور وہ ہے اس عمل کے درجے کو نہ ماننا، یعنی ایک آدمی نماز کے مطلوبہ اثرات سے محروم ہو کر نماز تو پڑھتا رہتا ہے لیکن ساتھ ہی یہ تصور بھی رکھتا ہے کہ نماز تو بس ایک عادت ہے ورنہ اس میں کچھ رکھا نہیں۔ یہ وہ خرابی ہے جو ایمان کے خاتمے تک لے جاسکتی ہے اور اس

۱۔ الحجۃ: ۱۵

۲۔ یوسف: ۱۲

۳۔ العنکبوت: ۲۹

کے سامنے مایوسی کی پہلی قسم قدرے کم خطرناک ہے۔ شکایت بہر حال نفاق یا انکار سے کم مضر ہوتی ہے۔

اب ہم دونوں صورتوں کی ٹھوس مثالیں پیش کرتے ہیں۔ فرض کریں ایک شخص کی نماز طویل کوشش کے باوجود اچھی نہیں ہو رہی اور نماز کے جونتائج زندگی میں نکلنے چاہئیں وہ نہیں نکل رہے تو اس صورت میں اس شخص کے اندر کئی طرح کے رد عمل پیدا ہو سکتے ہیں مثلاً

- ۱۔ وہ یہ کہہ کر نماز چھوڑ سکتا ہے کہ نماز میرے بس کی بات نہیں۔

- ۲۔ وہ نماز تو نہیں چھوڑتا لیکن یہ سمجھنے لگتا ہے کہ نماز کی خوبی اور تاثیر کے بارے میں مبالغہ کیا گیا ہے۔ یہ چیزیں عملاً قابل حصول نہیں ہیں۔

- ۳۔ یہ آدمی نماز بھی چھوڑ دیتا ہے اور نماز کے حکم کا بھی انکار کر دیتا ہے۔

یہ مایوسی کے وہ نمونے ہیں جو شرعاً خطرناک ہیں اور آدمی کو کسی بولناک انجام تک لے جاسکتے ہیں۔ البتہ ایک مثال اور بھی ہے جو کم مضر ہونے کی وجہ سے ہم نے اوپر نقل نہیں کی، وہ یہ کہ ایسا آدمی یہ تصور کر کے کہ اللہ تعالیٰ اس کی نماز سے خوش نہیں ہے، نماز کو چھوڑ کر کسی اور نیک کام مثلاً خدمت خلق وغیرہ میں لگ جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے خوش ہو جائے گا۔ اس فیصلے کی غلطی واضح ہے تاہم ایک بات یقینی ہے کہ یہ آدمی اللہ تعالیٰ سے اپنے تعلق کو برقرار رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اجمالاً کہا جائے تو شرعی نقطہ نظر سے مایوسی ایک بڑا نقص ہے جو شدید کفر و نفاق میں بدل سکتا ہے ورنہ اپنی معمولی حالت میں بھی یہ بندگی کی کسی نہ کسی مضبوط بنیاد کو کمزور کر دیتا ہے۔

س: مایوسی کا علاج کیا ہے؟

ج: مندرجہ ذیل امور مایوسی کو ختم یا کم کر سکتے ہیں:

- ۱۔ صرف عمل کے ہو جانے کو کافی سمجھنا اور اس کی کوالٹی کو وقتی طور پر فراموش کر دینا۔

کو ایسی ظاہر میں بھی ہو سکتی ہے یعنی حسن ادائیگی کی صورت میں اور باطن میں بھی ہو سکتی ہے یعنی کیفیت۔

۲۔ اس یقین کو ایک مانوس پیرائے میں پختہ کرنے کی کوشش کہ بندے کا اللہ تعالیٰ سے تعلق اس وقت بے معنی ہو جاتا ہے جب بندہ اپنی شرائط پر اصرار کرتے لگے۔

۳۔ اس یقین کا بار بار اعادہ کہ میری بہتری کی حتمی صورت کو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے اور وہ میرے لیے جو کچھ کرتا ہے اچھا کرتا ہے خواہ یہ اچھائی اس زندگی میں تکلیف دہ صورت میں کیوں نہ ظاہر ہو۔

۴۔ دنیا محض دارالعمل ہے۔ نتائجِ آخرت میں سامنے آئیں گے۔ عمل اپنی روح میں مشقت، امتحان، اطاعت اور تسلیم کا نام ہے۔ اس سے عافیت، راحت، تسکین وغیرہ کا مطالبہ نہیں رکھنا چاہیے۔ یہ تمام چیزیں نتائج کے اوصاف ہیں جو عمل سے فارغ ہو کر میسر آئیں گے۔

۵۔ قرآن سے ایسا تعلق پیدا کرنے کی مسلسل کوشش کہ اس کا ذوق اس کے فہم پر غالب آجائے اور اللہ کا کلام نہ صرف یہ کہ عمدہ اور محفوظ طریقے سے سمجھ میں آنے لگے بلکہ دل پر اثر بھی کرے۔ اس کے بغیر وہ دینی احوال نہیں پیدا ہو سکتے جن سے محروم ہو کر مسلمان ہونے کا کوئی حقیقی مطلب نہیں ہے۔ یہ بات اچھی طرح یاد دینی چاہیے کہ دین سے دور لے جانے والے احوال پر اگر کوئی چیز حاوی آسکتی ہے تو وہ تعلق بالقرآن اور حب رسول اللہ ﷺ ہے۔

۶۔ رسول اللہ ﷺ کی سیرت طیبہ کا زیادہ سے زیادہ مطالعہ بلکہ یہ بندگی کی تمام قوتوں کا سرچشمہ ہے اور اس سے مناسبت پیدا کر کے انسانی طبیعت اپنے اندر واقع ہونے والی ہر خرابی پر غالب آسکتی ہے۔

- ۷۔ ایسے لوگوں کی سرگزشت کا مطالعہ جو پے درپے ناکامیاں اور مصائب جھیل کر بالکل نیچے سے اوپر آئے اور انسانی تاریخ کو ایک فیصلہ کن موڑ دینے والے کی حیثیت سے اپنا نام منوا گئے مثلاً حضرت سلمان فارسیؓ، حضرت ابوذر غفاریؓ، سیدنا بلال حبشیؓ، تیمور لنگ، ظہیر الدین بابر، سٹیفن ہانگنز وغیرہ۔
- ۸۔ تفریح خصوصاً ایسے کھیل کود جو جسم کو تھکاتے ہیں۔ ان کا بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی مشقت اور اس کے اچھے نتیجے کے تصور سے عملاً مانوس ہو جاتا ہے۔
- ۹۔ خدمت خلق یعنی لوگوں کے مسائل حل کرنا۔ اس کے نتیجے میں اس خود مرکزیت کا خاتمہ ہو جاتا ہے جو مایوسی وغیرہ کی ماں ہے۔ لوگوں کے مسائل حل کرنے کی تگ و دو کرنے والا اپنی طرف متوجہ ہونے کا وقت ہی نہیں نکال سکتا۔ مایوس آدمی کو یہ چیز شدت سے درکار ہوتی ہے۔
- ۱۰۔ اگر کوئی نفسیاتی عدم توازن ہو تو ماہر نفسیات کے پاس ضرور جانا چاہیے۔



لوگوں کے حقوق غصب کرنا

حکم ربانی

— ﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا﴾ (النساء: ۵۸)
 اے مسلمانو! اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے حق داروں کو پہنچا دو۔
 — ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَخُونُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ وَتَخُونُوا أَمْنَكُمْ
 وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ﴾ (الانفال: ۸: ۲۷)

اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ بے ایمانی نہ کرو اور نہ اپنی
 امانتوں میں خیانت کرو جبکہ تم جانتے ہو کہ یہ برا فعل ہے۔

فرمان نبوی

— ”قال الله تعالى: ثلاثة انا خصمهم يوم القيامة، رجل اعطى بي ثم
 غدر، ورجل باع حوراً فاكل ثمنه ورجل استأجر اجيراً فاستوفى منه
 ولم يعطه اجره“ (۱)

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تین آدمی ایسے ہیں جن کے خلاف قیامت کے دن میں حق
 طلبی کا دعویٰ کروں گا۔ ایک وہ شخص جو میرا نام لے کر عبد باندھے پھر اسے توڑ
 دے، اور وہ جو آزاد شخص کو بیچے اور اس کی قیمت ہڑپ کر جائے اور وہ جو کسی کو ملازم
 رکھے، اس سے پورا کام لے اور پھر اسے اجرت نہ دے۔

— ”ملعون من ضار مومنأو مكره“ (۲)

وہ لعنتی ہے جو مسلمان کو نقصان پہنچائے اور اس کے ساتھ مکر کرے۔

(۱) صحیح بخاری، کتاب البیوع، باب اثم من باع حوراً

(۲) بیع الترمذی، ابواب البر والصلة، باب ما جاء فی الخیانة والغش

س: تعریف؟

ج: اس کی تعریف تو واضح ہے البتہ اتنی وضاحت ضروری ہے کہ حقوق کی چند قسمیں ہوتی ہیں۔ مسلم معاشرت میں ان تمام حقوق کی پاسداری یکساں طور پر لازمی ہے اور ان میں سے ہر ایک کی خلاف ورزی شرعاً بڑا گناہ ہے۔ ایک انسان کے دوسرے پر جو حقوق ہوتے ہیں ان میں سے چند اہم یہ ہیں:

۱۔ اس کے مال میں ناجائز تصرف نہ کیا جائے۔ چوری، فریب، خیانت، جان بوجھ کر غلط مشورہ دینا وغیرہ ناجائز تصرف کی ذیل میں آتے ہیں۔

۲۔ اس کی آبرو کو مجروح نہ کیا جائے۔

۳۔ اس کو جانی یا بدنی نقصان نہ پہنچایا جائے۔

۴۔ اس کو ایسی اذیت نہ دی جائے جس کا وہ مستحق نہ ہو۔

۵۔ اس سے جھوٹ نہ بولا جائے، وعدہ خلافی نہ کی جائے اور مشورہ دینے کی اہلیت نہ

ہونے پر مشورہ نہ دیا جائے۔ تعلیم وغیرہ کے معاملے میں بھی یہی اصول ہے۔

نااہل معلم یا مربی اپنے شاگردوں کا ایک بڑا حق غصب کرتا ہے۔

۶۔ اس کی خوشامد اور جھوٹی تعریف نہ کی جائے یعنی اس کے بگڑنے کا کوئی سامان نہ

کیا جائے۔

۷۔ اس سے تعلق اور گفتگو میں دین کو مقدم رکھا جائے۔

ان میں سے کسی ایک کی خلاف ورزی بھی یا تو گناہ ہے یا ایسی کوتاہی ہے جس کا

آخر میں حساب دینا ہوگا۔ ان کے علاوہ حقوق کی ایک ذاتی قسم بھی ہے۔ آدمی پر لازم ہے

کہ وہ اپنی ہدایت کا سامان کرے اور اپنے نفس پر اس کی برداشت سے زیادہ بوجھ، بلا ضرورت نہ ڈالے۔ اس ضابطے کو فراموش کرنا گناہ بھی ہے اور نفسیاتی کجی بھی۔ اسی طرح شریعت نے اہل حقوق کے مختلف طبقات بھی مقرر کر دیئے ہیں مثلاً والدین، اولاد، رشتہ دار، پڑوسی، دوست احباب، شوہر اور بیوی، عام مسلمان، غیر مسلم وغیرہ۔ ان کے حقوق بھی متعین ہیں اور ہر مسلمان انہیں ادا کرنے کا پابند بھی ہے۔

حقوق کی پوری تفصیل کو ہم اپنی سہولت کے لیے دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد۔ ان کی ادائیگی کی طاقت اور جذبہ ایک ہی مرکز سے پھوٹتا ہے لہذا یہ بات کسی بھی درجے میں قابل قبول نہیں ہے کہ آدمی اللہ کے حقوق ادا کرے اور بندوں کی طرف سے غافل ہو جائے یا بندوں کا خیال رکھے اور اللہ کی پرواہ نہ کرے۔ یہ اصول جاننا بہت ضروری ہے کہ حقوق و فرائض کا پورا نظام اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع ہے۔ اس بنیاد کو بھول کر یہ سارا قصہ محض بے معنی ہے اور شرعاً کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ مختصر یہ کہ اصل چیز اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی فرماں برداری ہے۔ یہ ہر نیکی اور خیر کی بنیاد ہے جس سے کٹ کر کوئی چیز خواہ کتنی بھی بھلی معلوم ہو، بیکار ہے۔

س: اس تمہید میں بہت سی باتیں آپس میں الجھ گئی ہیں کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم حقوق اللہ سے بات شروع کریں اور پھر ہر جزو کی علیحدہ علیحدہ تفصیل بیان کریں؟

ج: تمہید ہمیشہ بحث کے خلاصے کو بیان کرتی ہے۔ اس لیے وہاں ساری باتیں یکجا ہو گئی ہیں اب ہم آپ کی بتائی ہوئی ترتیب کے مطابق آگے بڑھیں گے۔ سب سے پہلے حقوق اللہ کی طرف آتے ہیں۔ ان کی ضروری تفصیل درج ذیل ہے:

اللہ کا بندوں پر سب سے بڑا حق یہ ہے کہ اس کی عبادت کی جائے، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا جائے اور اس کے احکام کی پوری اطاعت کی جائے۔ مختصر یہ کہ

بندے کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ اللہ پر خود اسی کی بتائی ہوئی تفصیل کے مطابق ایمان رکھا جائے اور اس ایمان کے تمام تقاضے، خواہ وہ علمی ہوں یا عملی، پورے کیے جائیں۔ باقی اللہ کے حقوق کی فرداً فرداً تفصیل سب کو معلوم ہے، الگ سے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

س: غالباً رسول اللہ ﷺ کے حقوق بھی یہاں مجملہ بیان کیے جاسکتے ہیں؟

ج: جی ہاں! رسول اللہ ﷺ کے حقوق کے معاملے میں بھی اصول یہی ہے کہ آپؐ پر شریعت کی بتائی تفصیل کے مطابق ایمان رکھا جائے اور محبت و اطاعت یا تعلق کی کسی بھی سطح پر آپؐ کے مقابلے میں کسی کو ترجیح نہ دی جائے بلکہ کسی کو آپؐ کے برابر بھی نہ لایا جائے۔ عملی نقطہ نظر سے دیکھیں تو امت پر رسول اللہ ﷺ کا سب سے بڑا حق یہ ہے کہ آپؐ کے لائے ہوئے دین کو اس کی صحیح صورت میں محفوظ رکھا جائے اور اس پر پوری طرح عمل کرنے کی کوشش کی جائے۔

س: یہاں ایک خیال پیدا ہوا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے حقوق کا بیان حقوق العباد کے ساتھ کرنا مناسب تھا یعنی حقوق العباد کا آغاز اس سے کیا جاتا؟

ج: رسول اللہ ﷺ کے حقوق اصولی طور پر حقوق العباد ہی ہیں لیکن آپؐ کے امتیاز کو اشتراک پر فوقیت دینا ضروری ہے۔ اسی لیے ہم نے آپؐ کے حقوق کو حقوق العباد کی ذیل میں بیان کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ ویسے بھی یہ سامنے کی بات ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے حقوق کی تعمیل پر دین کا دار و مدار ہے۔ یہ حیثیت حقوق العباد کی کسی بھی قسم کو حاصل نہیں۔

س: یہ بات تو سمجھ میں آگئی اب حقوق العباد کی بھی کچھ تفصیل بیان کر دیں؟

ج: اپنے نفس کے حقوق:

۱۔ اس میں سے امارگی زائل کرنے کی کوشش کی جائے یعنی دین پر چلتے ہوئے اس کا تزکیہ کیا جائے۔

۲۔ نفس کے دو حصے ہیں ایک طبیعت اور دوسرے ذہن۔ طبیعت کو اللہ اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سچے تعلق کے احوال فراہم کرنے کی کوشش کی جائے اور ذہن کو دین کا صحیح فہم مہیا کیا جائے۔

۳۔ نفس کا وہ حصہ جو طبیعت کہلاتا ہے، اسے دین کے حالی فضائل سے اس طرح مانوس کیا جائے کہ ہر فضیلت سے مناسبت رکھنے والا ایک ماحول اس کو دے دیا جائے مثلاً نفس میں تعلق باللہ کا سب سے سریع التأثير حال شکر کا ہے۔ جائز ذرائع سے اس کی راحت کا سامان کر کے اس میں یہ کیفیت پیدا کی جاسکتی ہے۔ اسی طرح مثال کے طور پر صبر کو لے لیں تو یہ چیز بھی اسے شکر کے زور پر سکھائی جاسکتی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے جہاں اتنی نعمتیں عطا فرمائی ہیں وہاں اگر میری ایک آدھ خواہش پوری نہیں ہوتی تو کیا ہوا؟

اسی طرح نفس کا وہ حصہ جو ذہن ہے، اس کے دینی Content کو بالکل واضح، فیصلہ کن اور صحیح صورت میں رکھا جاسکتا ہے۔ بس اصول یہ ہے کہ طبیعت کو حوی اور ذہن کو رائے کے تابع نہ ہونے دیا جائے۔

۴۔ اس کی برداشت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالا جائے، خواہ وہ بوجھ اٹھانا موجب فضیلت ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ اگر نفس تنگی میں پڑ گیا تو ایک بڑا عمل تو ممکن ہے وہ کر گزرے لیکن پھر یہ روزمرہ کے معمولی اعمال خیر کے بھی قابل نہیں رہتا۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ نفس کی خوئے انکار اور سرکشی کو ابھرنے کا بہانہ نہیں دینا چاہیے۔ خواہ اس کے لیے رخصت ہی پر عمل کیوں نہ کرنا پڑے۔ یہ عام مشاہدہ ہے کہ لوگ بڑی بڑی

دینی ذمہ داریاں خود پر لا دیتے ہیں لیکن ابھی تھوڑی ہی مدت گزرتی ہے کہ فرائض ادا کرنے کے لائق بھی نہیں رہتے۔

۵۔ نفس بمعنی ذات کے بھی کئی حقوق ہیں جن سے غفلت برتا شرعاً ناروا ہے مثلاً خود کو ہلاکت میں نہ ڈالنا، اپنے مال و جان و عزت کی حفاظت کرنا، اپنی صحت کا خیال رکھنا، خود کو صاف ستھرا رکھنا وغیرہ۔

باقی رہے وہ اہل حقوق جن کی فہرست اوپر بتائی گئی ہے تو ان کے حقوق معروف ہیں اور ان کے اعادے کی ضرورت نہیں۔ البتہ یہ بات ملحوظ رہے کہ دو چیزیں ادائے حقوق کی روح ہیں، خوفِ خدا اور ایثار۔ ان کی نگہداشت اور نشوونما کی کوشش کرنے والا، لوگوں کے حقوق اچھی طرح پورے کر سکتا ہے۔

س: حقوق تلفی کے نقصانات کیا ہیں؟

ج: اس خرابی کے متعدد نقصانات گنوائے جاسکتے ہیں لیکن ان میں سے دو بنیادی ہیں: ایک: آدمی کے دل سے اللہ تعالیٰ کا خوف نکل جاتا ہے۔ دوسرے: انسانیت کے بنیادی اوصاف باقی نہیں رہتے یا کمزور پڑ جاتے ہیں۔

جو شخص دوسروں کی حق تلفی کو اپنی عادت بنا لیتا ہے وہ دین سے مجموعی وابستگی کا کوئی ایک تقاضا بھی پورا کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ اس کی عبادات دکھاوا ہیں اور اس کے تمام اعمال بے روح، کیونکہ یہ ایک ایسی لعنت ہے جو آدمی کے پورے وجود کو لپیٹ میں لے لیتی ہے، یہ نہیں ہوتا کہ ایک حصہ خراب ہو گیا تو باقی بھی محفوظ ہے۔ گویا اس خرابی کی زد آدمی کے تمام دینی و انسانی اوصاف پر پڑتی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اس کے بعد نقصانات کی فہرست گنونا غیر ضروری ہے، یہی کافی ہے۔

س: اس بری عادت کا علاج کیا ہے؟

ج: اس کا بس ایک علاج ہے، بہت سادہ اور واضح، جو حقوق تلف ہوئے ہیں، ان کی تلافی کریں اور اس معاملے کو اس طرح نمٹائیں جس طرح کوئی دیانت دار شخص اپنے قرضے چکاتا ہے۔ یعنی یا تو متاثرہ لوگوں سے اپنی کوتاہی اور زیادتی معاف کروائی جائے یا پھر اس کے کفارے کی کوئی متفقہ صورت اختیار کی جائے۔ اس کے علاوہ اس کا نہ کوئی نفسیاتی علاج ہے نہ عملی۔ یہ ضرور ہے کہ اس عزم تک پہنچنے کے لیے کچھ محرکات درکار ہیں، ان میں سب سے بڑا محرک اللہ تعالیٰ کا خوف ہے۔ اسے پیدا کرنے کی مختلف تدابیر کی جاسکتی ہیں: مثلاً آخرت میں اللہ تعالیٰ کے جلال کا تصور، دوزخ کا خیال، عذابِ قبر کا تصور اور یہ کہ اس خرابی کی وجہ سے میں رسول اللہ ﷺ کی نفرت کا نشانہ بنوں گا۔ یہ آخری خیال طبیعت کے لیے بہت موثر ہے۔

س: کیا ادائی حقوق میں کوتاہی اور غصب حقوق میں فرق ہے؟

ج: دوسروں کے حقوق کی ادائی میں کوتاہی اور ان کے حقوق غصب کرنا ایک لحاظ سے مختلف چیزیں ہیں۔ چوری، ڈاکے، خیانت وغیرہ کا تعلق غصب حقوق سے ہے اور یہ حق تلفی یعنی دوسرے کے حقوق نہ ادا کرنے سے بڑا گناہ ہے۔ جیسے کسی کی رقم ضائع کر دینا بھی گناہ ہے لیکن وہ رقم چھین لینا بلاشبہ اس سے بھی بڑا گناہ ہے۔



کسب حرام

حکم ربانی

﴿وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ لِنَأْكُلُوا

فَرِيقًا مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ﴾ (البقرہ: ۱۸۸)

اور یاد رکھو! ایک دوسرے کا مال ناجائز طور پر نہ کھاؤ، رشوت کو حاکموں تک رسائی کا ذریعہ نہ بناؤ اور جان بوجھ کر دوسروں کا مال ہڑپ نہ کرو۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَكُونُوا

تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ.....﴾ (النساء: ۲۹)

اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق طور پر نہ کھاؤ۔ البتہ باہمی رضامندی سے تجارت کے ذریعے جو مال حاصل کرو وہ کھا سکتے ہو۔

فرمان نبوی

— ”کل المسلم على المسلم حرام دمه وماله وعرضه“ (۱)

ہر مسلمان پر دوسرے مسلمان کی جان، مال اور عزت حرام ہے۔

— ”أشد الناس حسرة يوم القيامة رجل كسب مالا من غير حله

فدخل به النار“ (۲)

قیمت کے دن سب سے حسرت ناک انجام اس شخص کا ہوگا جس نے دنیا میں حرام مال کمایا ہوگا اور وہ اسے جہنم میں لے جائے گا۔

(۱) جامع الترمذی، ابواب البر، باب ماجاء فی شفقة المسلم علی المسلم

(۲) مسند احمد بن حنبل، ۳: ۷۰، ۷۲

س: تعریف؟

ج: کسب حرام کی تعریف تو واضح ہے، اسے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم اس کے مختلف النوع نقصانات اور اس کے علاج کی تدابیر تک محدود رہیں گے۔

س: یہ تو ٹھیک ہے کہ حلال و حرام پوری طرح واضح ہیں تاہم موجودہ صورتحال بر لحاظ سے اتنی پیچیدہ ہو چکی ہے کہ طرح طرح کے حیلوں سے ناجائز کو جائز بنانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ اس لیے مناسب ہوگا کہ کسب حرام کی ان صورتوں کو واضح کر دیا جائے جن کے بارے میں مجموعی طور پر عوام حتیٰ کہ بعض اہل علم بھی غلط فہمی کا شکار ہیں؟

ج: اس سوال کے جواب میں بعض انتہائی تکنیکی مباحث اٹھ سکتے ہیں۔ ہم اس طرف نہیں جانا چاہتے، البتہ ہمارے یقین کی حد تک موجودہ نظام معیشت میں بعض چیزیں حرام اور ناجائز ہیں جنہیں حکومتی سرپرستی اور بعض اکادمیوں کی تائید سے امت میں یا تو جاری کر دیا گیا ہے یا جاری کرنے کی کاوش کی جا رہی ہے۔ ان میں سے چند یہ ہیں:

۱۔ تمام بینک اکاؤنٹس کا منافع

۲۔ تمام انعامی سکیمیں جن کا فیصلہ قرضہ اندازی سے کیا جاتا ہے۔

۳۔ حرام اور ممنوع چیزوں کی تجارت مثلاً ایسی وڈیو آڈیو شاپس جن میں فلموں اور

گانوں کے کیسٹ بیچے جاتے ہیں۔

- ۴۔ انشورنس سکیموں کے فوائد
 - ۵۔ اسٹاک مارکیٹ کا کاروبار
 - ۶۔ اکثر کمپنیوں کے شیئرز پر ملنے والا منافع
 - ۷۔ لہو و لعب کو ترویج دینے والے سامان کی تجارت
 - ۸۔ تراویح پڑھانے کی اجرت
 - ۹۔ عورتوں کی وہ تمام ملازمتیں جن میں بلا ضرورت بے پردگی لازمی ہو جائے۔
 - ۱۰۔ عورتوں کی تصویر والی چیزوں کی خرید و فروخت
 - ۱۱۔ بازاروں میں ڈالی جانے والی کمیٹیاں
 - ۱۲۔ فحش اور لادینی کتابوں اور رسالوں کا کاروبار
 - ۱۳۔ داڑھی مونڈنے کی اجرت
 - ۱۴۔ فلموں کا کاروبار
 - ۱۵۔ منشیات کی خرید و فروخت
 - ۱۶۔ عورتوں کے لیے باریک کپڑے تیار کرنے اور انہیں غیر سائٹرز ڈیزائن میں سینا۔
 - ۱۷۔ کثرت رزق کے لیے کافر ممالک کے غیر اسلامی ماحول میں جا کر ملازمت کرنا۔
 - ۱۸۔ بینک سے سود پر روپیہ لے کر کاروبار کرنا
 - ۱۹۔ ملازم کا اپنا کام دیانت داری سے نہ کرنا..... وغیرہ وغیرہ
- س: اس میں بعض چیزوں کی حرمت پر خود علما کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے آپ نے انہیں بھی محرمات کی قبیل میں شمار کر لیا ہے۔ کہیں یہ غیر ضروری تشدد تو نہیں؟
- ج:۔ اول تو یہ روایتی معنوں میں اس طرح کے اختلافی مسائل نہیں جن میں ہر فریق کو یہ احتمال ہوتا ہے کہ دوسرا بھی صحیح ہو سکتا ہے۔ جدید دنیا میں مسلمانوں کا ایک بڑا

المیہ یہ ہے کہ اخلاقی، تہذیبی اور معاشرتی معاملات میں علما کا ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا ہے جو انسانی زندگی کے بارے میں دینی موقف کو سمجھنے کی یا تو اہلیت نہیں رکھتا یا ان حمیت سے محروم ہے جس کے بغیر دینی سوچ پنپ نہیں سکتی۔ مذکورہ بالا مسائل میں امت کے مجموعی موقف سے اختلاف یا انحراف کرنے والے لوگ اسی قبیل سے ہیں۔ ان لوگوں کے نزدیک دنیاوی ترقی اور خوشحالی گویا مدارحق بن گئی ہے اور دین سے پیدا ہونے والی انسانی تہذیب اور اس کے بنیادی عوامل ان حضرات کی نظر سے بالکل اوجھل ہیں یا پھر یہ ان کی طرف دیکھنے سے کتراتے ہیں۔ البتہ حسن ظن کا تقاضا پورا کرنے کے لیے ہم اپنے مشاہدے اور تجربے کے برعکس، یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ بعض ایسے علما بہر حال ہو سکتے ہیں جو حق طلبی اور حق جوئی کی نیت رکھنے کے باوجود بعض مہلک غلطیوں میں پڑ گئے ہوں، تاہم اصول کی بات یہی ہے کہ امت کو اگر اپنی بیت اجتماعی کو برقرار رکھنا ہے تو پھر مشتبہات کے پھیلاؤ سے بھی بچنا پڑے گا۔ اس کے بغیر دین اپنی قطعیت کے ساتھ انسانوں میں سرایت نہیں کر سکتا۔

س: کسب حرام کے نقصانات کیا ہیں؟

ج: ۱۔ انسان کے جوہر میں غیرت اور حیاء کا ایک مادہ ہوتا ہے، رزق حرام سے پہلی ضرب اسی پر پڑتی ہے۔ یہ بات محتاج دلیل نہیں کہ ایک دینی شخصیت کی تشکیل میں حمیت اور عفت ستون کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کسب حرام سے یہ ستون گر جاتے ہیں۔

۲۔ حرام کمائی کے نتیجے میں معیار زندگی کے اندر جو بلندی پیدا ہوتی ہے وہ فخر اور تکبر کا یقینی سبب بنتی ہے۔ حرام کی دولت اور املاک پر اکڑنا سچ پوچھیں تو اسلام سے

نکلنے کے مترادف ہے۔ اس میں اور ابو جہل کی اکڑ میں کوئی فرق نہیں ہے۔

۳۔ شرک اور تکبر کے بعد اسلام جس چیز کو پہلے ہی قدم پر ختم کرنے کا تقاضا کرتا ہے وہ حب دنیا اور حب مال ہے۔ اسلام اور حب دنیا اسی طرح متضاد ہیں جس طرح ایمان اور کفر۔ رزق حرام کمانے والا دین کے اس بنیادی ترین مطالبے یعنی حب دنیا کے ترک کو نہ صرف یہ کہ نظر انداز کرتا ہے بلکہ اس ام المعاصی کو حالاً اور عملاً دین پر ترجیح دینے کا عادی بن جاتا ہے۔

۴۔ مسلمان اور رزق حلال میں وہی نسبت ہے جو مرد اور مردی میں ہے۔ رزق حرام کی دلدل میں دھسنے والا فتوت کے تمام اوصاف سے دست برداری اختیار کرتا ہے اور ایک ایسے نفسیاتی ٹائپ میں ڈھل جاتا ہے جہاں آدمی ہر چیز کا سودا کر سکتا ہے۔

۵۔ کسب حلال اور اس کے لیے کی جانے والی کوششیں آدمی کو بندگی کی فطری اسپرٹ کے ساتھ اپنے رب کے ساتھ متعلق رکھتی ہیں۔ اس کی خلاف ورزی کرنے سے اللہ سے تعلق کی حقیقی اساس منہدم ہو جاتی ہے اور شکر، صبر، توکل وغیرہ جیسے اوصاف معدوم ہو جاتے ہیں۔

۶۔ اس کی نحوست تمام زیر کفالت افراد کو بھی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔

۷۔ اس کا ہر دینی عمل یقیناً بے سود اور بے معنی ہو جاتا ہے۔

۸۔ دعا قبول نہیں ہوتی۔

۹۔ مال میں سے برکت اٹھ جاتی ہے۔

۱۰۔ عبادت میں دل نہیں لگتا اور ایمان کی حلاوت محسوس نہیں ہوتی۔

س: اس کا علاج کیا ہے؟

ج: چونکہ یہ ارادی عمل ہے لہذا اس کا علاج بھی اختیاری ہے۔ یہ علاج بالکل سادہ ہے اور اس کے دو جز ہیں:

۱۔ توبۃ النصوح

۲۔ تمام حرام اموال و املاک سے فوری دست برداری اور ان سے جتنا فائدہ اٹھایا جا چکا ہو اس کا کفارہ۔

اس علاج میں ہرگز کوئی حرج اور مشقت نہ سمجھیں۔ آخرت میں جو پکڑ ہوئی ہے اس کے مقابلے میں یہ کوئی چیز نہیں۔



باب چہارم

ذہنی امراض اور ان کا علاج

تشکیک

بے یقینی

مکاری و عیاری

حیلہ جوئی

عبادت میں عدم یکسوئی

بے یقینی

حکم ربانی

— ﴿وَارْتَابَتْ قُلُوبُهُمْ فَهُمْ فِي رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُونَ﴾ (التوبہ: ۹: ۴۵)

ان کے دل شک میں پڑے ہوئے ہیں اور وہ اپنے شک ہی میں بھٹک رہے ہیں۔

— ﴿وَأَننَالِفِي شَكِّ مَمَاتِدُ غَوْنَا إِلَيْهِ مُرِيبٌ﴾ (هود: ۱۱: ۶۲)

تم جس چیز کی طرف ہمیں بلا تے ہو اس کے بارے میں ہمیں شبہ ہے اور ہم سخت الجھن میں گرفتار ہیں۔

فرمان نبوی

— ”عَنْ أَبِي بَكْرٍ الصِّدِّيقِ قَالَ: نَظَرْتُ إِلَى أَقْدَامِ الْمُشْرِكِينَ وَنَحْنُ فِي

الْغَارِ وَهُمْ عَلَى رُؤُوسِنَا فَقُلْتُ: يَا رَسُولَ اللَّهِ لَوْ أَنَّ أَحَدَهُمْ نَظَرَ تَحْتَ

قَدَمَيْهِ لَأَبْصَرَنَا فَقَالَ: وَمَا ظَنُّكَ يَا أَبَا بَكْرٍ بِأَيْنِ اللَّهِ ثَالِثُهُمَا“ (۱)

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا، میں نے مشرکوں کے قدموں کی

طرف دیکھا جب ہم غار ثور میں تھے اور وہ ہمارے سروں پر تھے۔ پس میں نے کہا،

یا رسول اللہ! اگر ان میں سے کوئی اپنے قدموں کی طرف دیکھ لے، تو یقیناً وہ ہمیں

دیکھ لے گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا، اے ابو بکر! ان دو کے متعلق تمہارا کیا گمان ہے کہ

جن کا تیسرا اللہ ہو (یعنی ہم دو ہی نہیں بلکہ تیسرا ہمارے ساتھ اللہ ہے اور جن کے

ساتھ اللہ ہو ان کا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے؟)

(۱) صحیح بخاری، کتاب التفسیر، باب قوله (ثانی اثین اذہما فی الغار)

بے یقینی کے اسباب

عام طور پر دیکھنے میں آیا ہے اور غالباً ہر دوسرے مسلمان کا ذاتی تجربہ بھی ہے کہ ہم جن چیزوں پر ایمان رکھتے ہیں وہ ہمارے یقین کا حصہ نہیں ہیں۔ ہمارا عقیدہ اس لحاظ سے غیر موثر ہو کر رہ گیا ہے کہ اس کی پہنچ ہمارے اس مرکز تک نہیں ہے جہاں ہم کسی چیز پر ایسا یقین اور اعتماد پیدا کر لیں جس کو کسی طرح زائل نہ کیا جاسکے۔ یہیں سے وہ قوت پیدا ہوتی ہے جو ہمیں ذہنی، طبعی اور عملی طور پر اس فضا کے تحت رکھتی ہے جو ہمارے اس مرکز سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر ہمارا عقیدہ یا علم ہمیں عمل پر نہیں اکساتا تو اس کا سب سے واضح مطلب یہ ہے کہ وہ عقیدہ یا علم ہمارے لیے ایک ایسی سطح پر لائق یقین نہیں ہے جس کو ہمارا روزمرہ کا شعور اپنی گرفت میں لے سکے۔ اکثر اوقات آدمی کا کسی چیز کو مان لینا اس بات کو لازم نہیں کرتا کہ وہ اس چیز پر یقین بھی رکھتا ہے۔ ذہن بعض امور میں مختلف اسباب کی بنا پر سمجھوتا بھی کر لیتا ہے، یعنی اپنے آپ کو مشقت سے بچانے کے لیے یا حقیقت تک پہنچنے کی صلاحیت نہ رکھنے کی وجہ سے یا عرف عام کو مجبوراً قبول کر لینے کی بنا پر یا محض دوسروں کی دیکھا دیکھی انسانی ذہن اکثر مسلمات اور عقائد کو قبول کر لینے کا تاثر دیتا ہے درآں حالیکہ ذہن کی مرکزی قوت جو اپنے تسلیم کردہ خیالات وغیرہ کو انسان کی تمام استعداد پر نافذ کرتی ہے، اس عمل اثبات سے لا تعلق رہتی ہے۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اس صورت میں کس چیز کو ماننے کا بیشتر ذہنی عمل ایک مضبوط فیصلہ نہیں بلکہ محض ایک سمجھوتا ہوتا ہے۔ دماغ جن چیزوں کو اہمیت نہیں دیتا انہیں کسی رد و قدح میں پڑے بغیر قبول کر لیتا ہے۔ پھر یہ چیزیں اپنی معاشرتی قدر و قیمت کے مطابق اظہار تو پاتی رہتی ہیں لیکن چونکہ ذہن اندر سے قائل نہیں ہوتا اس لیے یہ انسانی زندگی کے بنیادی دھارے میں شامل نہیں ہوتیں۔ ہم لوگوں

میں سے اکثر کا یہی حال ہوتا ہے کہ مشقت سے بچنے یا دباؤ کوٹالنے کے لیے دین کو اس کی تمام معلوم اور نامعلوم تفصیلات سمیت مان تو لیتے ہیں لیکن اسے اپنی شخصیت کی نشوونما کا واحد ذریعہ اور زندگی کی تنہا اساس بنانے سے قاصر رہتے ہیں۔

اس صورت حال کی نقشہ کشی قرآن حکیم میں کئی جگہ کی گئی ہے ایک جگہ اللہ تعالیٰ

نے فرمایا:

”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ“ (النساء: ۱۳۶)

”اے لوگو جو ایمان لانے کے مدعی ہو، سچ سچ ایمان لاؤ اللہ پر اور اس

کے رسول پر“

اور دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

”قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا، قُلْ لَمْ تُؤْمِنُوا وَلَكِنْ قُولُوا أَسْلَمْنَا

وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ.....“ (الحجرات ۱۴: ۱۳۹)

”یہ بدو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے۔ اے نبی! ان سے کہیے کہ تم

ایمان نہیں لائے بلکہ محض مطیع ہوئے ہو اور ایمان ابھی تک تمہارے

دلوں میں جاگزیں نہیں ہوا۔“

علم نفسیات کی رو سے یہ صورت حال دراصل ذہن کا تراشا ہوا ایک فریب ہے

جس میں ہم خود کو اور دوسروں کو مبتلا رکھتے ہیں۔ اس طرح کا ایمان اور اقرار دراصل انکار نہ

کر سکنے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ جب سے دین کی قانونی تعبیر نے ہمارے اندر اجتماعی سطح

پر ایک رسوخ پیدا کر لیا ہے، ہم دین سے وابستگی کی بعض لازمی شرائط فراموش یا نظر انداز

کرنے کے عادی بن گئے ہیں۔ مسلمان ہونا یا نہ ہونا اب ایک فقہی مسئلہ بن کر رہ گیا ہے جو

اکثر مقامات پر دین کی روح سے مناسبت نہیں رکھتا۔ اگر ہم دینی فہم اور ذوق کے لیے صحابہ کہ

معیار بنائیں تو غالباً یہ سمجھنے اور محسوس کرنے میں کوئی مشکل نہیں رہے گی کہ عمل ایمان کی تصدیق کا واحد معیار ہے۔ عمل کے بغیر ایمان کسی بھی دلیل سے قابل تسلیم نہیں۔ ہم جس چیز کو بے یقینی کہہ رہے ہیں وہ دراصل یہی ہے کہ ایمان محرک عمل نہ بن سکے، یعنی میں آخرت کو ماننے کا دعویٰ تو کرتا ہوں لیکن میری دنیاوی زندگی اس دعوے کی تصدیق نہیں کرتی۔ انسان میں یقین کے تمام درجات میں باہمی تفاوت تو ہو سکتا ہے لیکن یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ اس کا عمل اس کے یقین کی مخالف سمت میں ہو۔ ایسی صورت میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ یہ آدمی یقین نہیں رکھتا بلکہ یقین کے التباس میں مبتلا ہے۔ ہم دو ٹوک انداز میں اس پوری بات کا خلاصہ نکالنا چاہیں تو وہ یہ ہوگا کہ ایسا ایمان جسے عمل کی شہادت میسر نہ ہو ایمان نہیں بلکہ بے یقینی ہے۔

س: مذکورہ بالا گفتگو میں بے یقینی کے اسباب و محرکات کا ذکر آگیا ہے اس لئے ان کے اعادے کی ضرورت نہیں، تاہم اس کے چند بڑے بڑے مظاہر بتا دیے جائیں تو بات سمجھنے میں آسانی ہو جائے گی؟

ج: ممکن ہے اوپر بیان کردہ تفصیلات کچھ لوگوں کے لیے آسانی سے قابل فہم نہ ہوں اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نسبتاً سادہ لفظوں میں بتا دیا جائے کہ بے یقینی ذہن کی وہ حالت ہے جو عقیدے کو شعور کے لیے ایک رسمی چیز سے زیادہ حیثیت نہیں دیتی اور ذہن جن مراحل سے گزر کر اور جس طرح کی قوت تسلیم کے ساتھ سامنے کی چیزوں پر ایک اٹل یقین پیدا کرتا ہے وہ عقائد کے باب میں مفقود ہوتے ہیں۔ اس سطح پر دماغ کسی وجہ سے اقرار تو کر لیتا ہے مگر اس اقرار کو ارادہ و عمل کا مقصود بننے کی اہلیت فراہم نہیں کرتا۔ ذہن کا یہ نام نہاد اقرار عموماً مندرجہ ذیل اسباب سے پیدا ہوتا ہے:

— بے پروائی

— نا اہلی

— معاشرتی دباؤ

— مشقت سے گریز کا داعیہ

— رسمی تقلید

اب ہم اس کے مظاہر کی طرف آتے ہیں جو یہ ہیں:

— خود رائی

— بے عملی

— تقدیر پرستی، اور

— تجدد پسندی

ان میں سے ہر ایک کی اپنی اپنی تفصیلات ہیں:

خود رائی: ایمان کے بارے میں غیر سنجیدہ لوگ خود رائے ضرور ہوتے ہیں۔ ان کی رائے بھی ان کی خواہش کے تابع ہوتی ہے اور اسے وہ جب چاہیں بدل لیتے ہیں۔ اس طرح کا رویہ، ظاہر ہے، کہ ایمان کی ماہیت سے متصادم ہے۔ ایمانیات مفہوم اور تعبیر کی سطح پر بھی زیادہ سے زیادہ غیر متغیر ہوتے ہیں۔ انہیں اگر تبدیلی کی لہر میں چھوڑ دیا جائے تو یہ ذہن کے ایجاد کردہ تصورات بن کر رہ جائیں گے۔ خود رائے آدمی کا ذہن دراصل ایمان کی صورت برقرار رکھتے ہوئے اس کے معنی تبدیل اور مسخ کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے اور اس طرح سے اپنی اس مجبوری کا ازالہ کرتا ہے جو اس نے کسی داخلی یا خارجی دباؤ کی وجہ سے خود پر عائد کر رکھی ہو۔

بے عملی: بے عملی کا معاملہ واضح ہے اس میں کسی تفصیل کی حاجت نہیں۔

تقدیر پرستی: یہ دراصل ایمان کی عائد کردہ ذمہ داری سے بچنے کا ایک بڑا بہانہ ہے۔ باقی اس کی تمام تر مناسبت بے عملی کے ساتھ ہی ہے۔ اس کے ذریعے سے بے عملی پر بھی استدلال ہو جاتا ہے اور حقیقی ایمان کی غیر موجودگی پر بھی پردہ پڑ جاتا ہے۔

تجدد پسندی: تجدد پسندی اور خود رائی بنیادی طور پر ایک ہی رویے کے دو نام ہیں۔ فرق یہ ہے کہ خود رائی سے معنی بدلتے ہیں اور تجدد پسندی سے صورت۔ یہی وجہ ہے کہ روایتی طور پر خود رائی کا ہدف قرآن ہوتا ہے اور تجدد پسندی کا سنت۔

س: بے یقینی کے نقصانات کیا ہیں؟

ج: بے یقینی بجائے خود اتنا بڑا نقصان ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی دینی نقصان سوچا بھی نہیں جاسکتا، تاہم نفسیاتی نقطہ نظر سے بے یقینی کی حالت انسانی شخصیت میں ایسے نقائص پیدا کر دیتی ہے جو دینی اعتبار سے بھی مہلک ہیں مثلاً:

۱۔ نفاق

۲۔ ریا

۳۔ جھوٹ

۴۔ کم عقلی

۵۔ بعض ضروری انسانی اوصاف مثلاً غیرت، بہادری، مجاہدہ، بلند اخلاقی وغیرہ سے محرومی۔

۶۔ انسان کو اپنے آپ پر گرفت لازمہ کار ہے، بے یقینی اسے قائم نہیں رہنے دیتی۔

یہ ایسی خامی ہے جس کی موجودگی میں انسان ہونا بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔

س: بے یقینی کا علاج کیا ہے؟

ج: بے یقینی کی عموماً دو قسمیں ہوتی ہیں، ایک تو وہ جس کی بنیاد عقل اور عقل کے مروجہ استدلال پر ہو اور دوسری قسم وہ ہے جو ایک وہم اور سو سے کی طرح ذہن پر غالب آجاتی ہے۔ پہلی قسم یعنی مدلل بے یقینی کا بظاہر تو یہی علاج نظر آتا ہے کہ دلیل کا جواب دلیل سے دیا جائے لیکن عملاً ایسا ممکن نہیں ہوتا۔ عقل ایک بار جو دلیل گھڑ لیتی ہے پھر کسی اور استدلال کے مقابلے میں اس سے دستبردار نہیں ہوتی۔ یہاں دلیل سے ہمارا مطلب ہے کسی غائب چیز کا عقلی اثبات یا انکار۔ حق کے سلسلے میں عقل کا اثبات ہو یا انکار، بہت زیادہ لائق اعتماد نہیں۔ اس کی تفصیل چونکہ بہت تکنیکی ہے لہذا اس میں پڑنے کی بجائے ہم اپنی بات اس طرح کہیں گے کہ بے یقین ذہن کی اصلاح کے لیے ضروری ہے کہ اس کا عقل اور عقلی استدلال پر انحصار ختم کر دیا جائے یعنی عقل کو حکم کی بجائے شارح وغیرہ کے منصب پر رکھا جائے تو دین میں جس سطح کا اقرار یا انکار مطلوب ہے اس کا حصول ذہن کے لیے فطری اور آسان ہو جاتا ہے۔ حق ذہن کی فطری استعداد سے ثابت ہوتا ہے نہ کہ عقلی قوت سے۔ ذہن کا عقل پر انحصار ختم کرنے کے لیے پہلے اسے اس دعوے کی طرف متوجہ کرنا چاہیے کہ عقل غیب پر کوئی حکم نہیں لگا سکتی، کیونکہ عقل کا تعلق محض محسوسات سے ہے۔ اگر یہ دعویٰ ذہن پر ثابت ہو جائے تو بے یقینی کی اس قسم کا علاج سہولت کے ساتھ ممکن ہو جائے گا۔

نیز امام غزالیؒ اور امام ابن تیمیہؒ کی بعض تحریریں (جیسے احیاء العلوم، تہاتۃ الفلاسفہ، الرد علی المنطقیین وغیرہ) اس معاملے میں فیصلہ کن افادیت رکھتی ہیں۔ کم و بیش یہی مرتبہ متاخرین میں مولانا اشرف علی تھانویؒ کی بعض تحریروں (مثلاً اسلام اور عقلیات وغیرہ) کا ہے۔ ان سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ چونکہ اس طرح کی بے یقینی میں مبتلا حضرات فلسفیانہ

ذوق کے بھی حامل ہوتے ہیں اس لیے مناسب ہوگا کہ ایمانوں کا نت کی مشہور کتاب The Critique of Pure Reason (عقیدہ عقل محض) کا غور سے مطالعہ کر لیا جائے۔ اس کتاب میں عقل کی دینی مداخلت کی تمام صورتوں کا ہمیشہ کے لیے قلع قمع کر دیا گیا ہے۔

بے یقینی کی دوسری قسم شبہ، وہم اور وسوسہ ہے۔ عین ممکن ہے کہ آدمی دین پر پختہ ایمان رکھتا ہو مگر کسی عقیدے یا حکم کے صحیح معنی اور مصلحت نہ سمجھنے کی وجہ سے شبہ اور وسوسہ میں مبتلا ہو جائے۔ یہ شبہ عقلی بھی ہو سکتا ہے اور طبعی بھی۔ اس کا علاج سادہ ہے۔ شبہ کی وجہ عقلی ہو تو کسی موثر استدلال سے دور کر دینا چاہیے اور اگر طبعی ہو تو دین کے بنائے ہوئے مزاج اور اس کے کامل نمونوں کی سند پر اس غلجھان کا آسانی سے ازالہ کیا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک مسلمان آفات و مصائب کی بھرمار سے متاثر ہو کر اللہ کی رحمت کی طرف سے شبہ کا شکار ہو جاتا ہے، ایسے شخص کو رحمت کے تفصیلی معانی سمجھا کر اس شبہ سے نکالا جاسکتا ہے یا کوئی آدمی اپنی یا مسلمانوں کی مسلسل ناکامی اور بد حالی سے گھبرا کر پورے دین کی طرف سے ایک نامعلوم وسوسہ محسوس کرنے لگتا ہے، اس کے سامنے رسول اکرم ﷺ اور صحابہ کا انداز زندگی رکھ دیا جائے تو اس کی یہ طبعی الجھن باقی نہیں رہے گی۔

یہاں ہم نے بالکل اجمال سے کام لیا ہے کیونکہ ہمارے پیش نظر محض یہ دکھانا تھا کہ مسلمان رہتے ہوئے بھی کوئی شخص دین کے کسی جز پر مشتبہ ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ کیفیت اس کے لیے تکلیف دہ ہوتی ہے اور وہ دل سے چاہتا ہے کہ اس کا ازالہ ہو جائے۔ یہی آمادگی علاج کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ لیکن بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو زبان سے تو یہ کہتے ہیں کہ یہ میرا شبہ ہے یا اشکال ہے، لیکن دراصل وہ لوگ دین پر اعتراض کر رہے ہوتے ہیں۔ چونکہ اشکال اور اعتراض صورتاً ایک جیسے ہوتے ہیں اس لیے وہ اس یکسانی سے فائدہ

اٹھالیتے ہیں۔ شبہ اور اعتراض میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ شبہ میں مبتلا ہونے والا شخص پریشان، مضطرب اور غمگین ہوتا ہے جبکہ معترض ایک طرح کا فاتحانہ یقین رکھتا ہے۔ سردست ہمارا مقصود معترضین اور ان کے اعتراضات کا تجزیہ نہیں ہے اس لیے ہم اسے چھوڑتے ہیں یہاں تک کہ گفتگو کا کوئی مناسب موقع نکل آئے۔

مختصر یہ کہ شبہ اور وسوسہ ایمان ہی کی نشانی ہے۔ اس کے علاج کے لیے حکمت، نرمی، اور خیر خواہی درکار ہے، سختی اور رد سے کام نہیں لینا چاہیے۔ یہ تو ایک مریض کی وہ حالت ہے جو وہ خود اپنے علاج کے لیے بیان کرتا ہے۔ یہ حالت اس کے ایمان اور اسلام میں کسی نقص کا ثبوت نہیں ہے محض کسی ذہنی کمزوری یا ناسمجھی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔



تشکیک

حکم ربانی

﴿الَّذِينَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ إِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ إِيمَانًا وَقَالُوا حَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ ۝ فَانْقَلَبُوا بِنِعْمَةِ رَبِّهِمْ إِلَىٰ دِيَارِهِمْ فَأَتَىٰ خِثْلَ مَسْجِدِهِمْ وَأَنزَلَ الْأَمْثَلُ عَلَيْهِمْ ۝﴾
(آل عمران ۳: ۱۷۳، ۱۷۴)

یہ وہ ہیں جنہیں لوگوں نے خبر دی کہ دشمن نے تمہارے خلاف بڑی طاقت جمع کر لی ہے، اس سے ڈرو لیکن اس چیز نے ان کے ایمان میں اور اضافہ کر دیا اور وہ بول اٹھے کہ ہمارے لئے اللہ ہی کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔ پھر وہ نکلے اور اللہ کی نعمتیں اور اس کا فضل سمیٹ کر واپس آئے۔ انہیں کوئی نقصان نہ پہنچا۔ وہ اللہ کی رضامندی پر چلے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

﴿وَإِذْ أَقْبَلَ أَنْ وَعَدَ اللَّهُ حَقًّا ۖ وَالسَّاعَةُ لَارِيبَ فِيهَا قُلْتُمْ مَآذِرِي مَا السَّاعَةُ إِنْ نُنْظَنُ إِلَّا ظَنًّا وَمَا نَحْنُ بِمُتَّبِعِينَ﴾ (الحاشیہ ۳۵: ۳۲)
اور جب تمہیں کہا گیا کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور قیامت کے آنے میں کوئی شک نہیں تو تم نے کہا ہم نہیں مانتے قیامت کیا ہے؟ اور ہم اس کے آنے کے بارے میں متردد ہیں اور ہمیں یقین نہیں کہ وہ آئے گی۔

فرمان نبوی

”عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا قَالَ: حَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ، قَالَهَا إِبْرَاهِيمُ عَلَيْهِ حِينَ أُلْقِيَ فِي النَّارِ، وَقَالَهَا مُحَمَّدٌ ﷺ حِينَ قَالُوا: إِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ إِيمَانًا وَقَالُوا: حَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ“ (۱)

(۱) صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورۃ آل عمران، باب ﴿ان الناس قد جمعوا لكم فاخشوهم﴾

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حسبن اللہ ونعم الوکیل (ہمیں اللہ کافی ہے اور وہ اچھا کارساز ہے) اس وقت کہا جب انہیں آگ میں ڈالا گیا اور حضرت محمد ﷺ نے بھی یہ کلمہ اس وقت کہا جب کافروں نے کہا کہ بے شک لوگ تمہارے مقابلے کے لئے جمع ہو گئے ہیں، ان سے ڈرو! پس اس بات نے ان کے ایمان میں اضافہ کر دیا اور انہوں نے کہا: حسبن اللہ ونعم الوکیل۔

س: دیکھنے میں آیا ہے کہ جدید تعلیم کے زیر اثر عقائد وغیرہ میں کچھ شکوک و شبہات پیدا ہو جاتے ہیں جنہیں جدید تعلیم یافتہ ذہن یا تو حل کرنے پر قادر نہیں ہوتا یا پھر ان کی طرف ایک میلان پیدا کر لیتا ہے۔ یہ خرابی یعنی تشکیک ہماری رائے میں تیزی سے پھیل رہی ہے لہذا اس کی طرف توجہ دینا بہت ضروری ہے؟

ج: تشکیک بے یقینی ہی کی ایک قسم ہے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ بے یقینی کا بڑا حصہ اسی پر مبنی ہوتا ہے۔ تشکیک کا سیدھا سا مطلب یہ ہے کہ آدمی جن امور کو فہم عام کی روشنی میں سمجھ نہ سکے یا حواس کی مدد سے انہیں محسوس نہ کر سکے، ان امور کے بارے میں جب وہ انکار کی دلیل یا طاقت نہیں پاتا تو ان کے حوالے سے ایک گمراہ تذبذب کا شکار ہو جاتا ہے۔ عام طور پر یہ تذبذب دو چیزوں خوف اور خواہش کا مجموعہ ہوتا ہے۔ بعض لوگوں میں خوف نہ ماننے کا ہوتا ہے اور خواہش ماننے کی، جبکہ بعض میں یہ ترتیب الٹ بھی ہو سکتی ہے یعنی انسان کسی ماورائے عقل و حواس چیز کو ماننا یا نہ ماننا چاہتا ہے مگر اس کے نتائج سے خوفزدہ بھی ہوتا ہے۔ تشکیک کے مرض میں مبتلا لوگوں کی عموماً دو قسمیں ہوتی ہیں: ایک وہ جنہیں ایمانیات پر خود کو قائل کر دینے والی دلیل نہیں ملتی اور دوسرے وہ جو ایمانیات کا

استدلال سمجھنے کے لائق نہیں ہوتے۔ بالفاظ دیگر شک میں یا تو ذہن آدمی مبتلا ہوتا ہے یا پھر بالکل ہی احمق۔

جدید تعلیم خصوصاً موجودہ سائنسی اور عقلی علوم نے ذہن اور طبیعت کا ایک خاص مزاج بنادیا ہے۔ اس مزاج کا خاصہ یہ ہے کہ یہ غیب اور کسی مطلق اتھارٹی کو قبول نہیں کرتا۔ آخرت، رسالت اور خدا اس کے تصور علم اور خوئے اثبات سے مناسبت نہیں رکھتے۔ جدید سائنس گو کہ مذہبی عقائد کے معاملے میں خاموشی کا رویہ اختیار کرتی ہے لیکن اس کا تصور کائنات اور انداز تحقیق ایسا ہے کہ آگے چل کر کسی بھی مرحلے میں یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ کسی ایسے مقام پر پہنچے گی جہاں عقائد کے اثبات کی راہ کھل سکتی ہو۔ اس کی پیش رفت کی ہر سمت مذہب کے عین مخالف ہے۔ اسی طرح سے نظری علوم مثلاً فلسفہ وغیرہ متفقہ طور پر ایک تصور علم رکھتے ہیں جس میں ان حقائق کے لیے کوئی جگہ نہیں جو مابعد الطبیعی یعنی عقل و حواس اور زمان و مکاں سے ماوراء ہوں۔ ان کی رو سے وہی حقیقی ہے جو محسوس ہو۔ محسوسات سے اوپر اٹھ کر کسی چیز کو موجود ماننا محض ایک واہمہ ہے۔

بد قسمتی کی بات یہ ہے کہ جدید تعلیم اور اس کا پورا نظام جن بنیادوں پر کھڑا ہے وہ دین سے براہ راست متصادم ہے۔ تفصیل کا موقع نہیں کیونکہ گفتگو اداق ہو جائے گی۔ اس لیے ہم صرف یہ کہنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ اس نظام تعلیم نے مجموعی طور پر جو ذہنیت اور طبیعت پیدا کی ہے وہ واضح طور پر دینی عقائد اور اخلاق کی قبولیت کی ابتدائی استعداد بھی نہیں رکھتی، کیونکہ اس کا بنایا ہوا تصور انسان اور تصور کائنات خدا اور آخرت وغیرہ پر ایمان کو عملاً محال بنادیتا ہے۔

ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہماری دینی فکر ہر لحاظ سے پسماندہ ہے اور ذہن جدید میں اٹھنے والے شبہات اور علوم جدیدہ کے اٹھائے ہوئے سوالات کا سامنا کرنے کی سکت نہیں

رکھتی۔ ہمارا سارا نظام استدلال فرسودہ اور بے اثر ہے۔ یہ جس منطق پر کھڑا ہوا ہے وہ پوری طرح رد ہو چکی ہے لیکن افسوس کہ دین میں عقل کے کردار کی نمائندگی کا دعویٰ کرنے والے، معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعے سے بے خبر ہیں۔ اس صورت حال میں تشکیک کا ہر عمل یک طرفہ طور پر شدت پکڑ لیتا ہے کیونکہ اس کے آگے بند باندھنے کی کوئی صلاحیت اور قوت معاصر دینی فکر میں موجود نہیں ہے۔ ہم نے جدید علما اور دینی مفکرین کی نمائندہ چیزیں دیکھ رکھی ہیں۔ ہم عقیدگی اور ہم خیالی کے باوجود ان کے بارے میں ہمارا تاثر یہی ہے کہ ادنیٰ درجے کی تیاری اور اہلیت کے بغیر ایک بڑے نازک معاملے میں ہاتھ ڈال دیا گیا ہے اور نتیجتاً دین کی جگہ ہنسائی کا ذریعہ پیدا کر دیا گیا ہے۔ ہماری رائے میں جدید مذہبی تحریریں، خاص طور پر وہ تحریریں جو مذہب کے عقلی دفاع میں لکھی گئی ہیں، بالکل بچکانہ ہیں اور تشکیک کو کم کرنے کی بجائے بڑھا دیتی ہیں۔ اب معاملہ یہ ہے کہ عقل نے اپنی انتہائی ترقی یافتہ حالت میں پوری قوت اور تیاری کے ساتھ مذہب کے انکار کا رویہ اختیار کر لیا ہے۔ جدید مسلمانوں میں پیدا ہونے والی تشکیک اسی کی ایک پرچھائیں ہے۔ دوسری طرف مذہبی فکر میں جو عقل کا رفرماد کھائی دیتی ہے وہ ہر اعتبار سے کمزور، ناقص اور بے ساز و سامان ہے۔ اس عدم توازن سے نمٹنے کا سر دست کوئی ایسا فارمولا نہیں ہے جسے اجتماعی طور پر آزمایا جاسکے۔ ایسی صورت میں ہمارے پاس لے دے کر ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ ہم اس بنیادی نکتے کو سمجھنے کی کوشش کریں کہ وحی دراصل عقل کی ناکامی اور کوتاہی کو بویدا کرتی ہے۔ عقل اپنے طور پر نہ حقیقت عالم سمجھ سکتی ہے، نہ نظام عالم چلا سکتی ہے اور نہ انسان کے اخلاقی اور غیر مادی مطالبات اور ضروریات کی تکمیل کر سکتی ہے۔ عقل کے بارے میں یہ تمام دعوے محض الزامات نہیں ہیں بلکہ خود جدید علوم ان کی تائید کرتے ہیں۔ اندریں صورت

مذہبی ذہن کی تشفی اور مضبوطی کے لیے یہی بات کافی ہے کہ ایمانیات عقل کے دائرے میں نہیں آتے۔ عقل کا تعلق محض عالم محسوسات سے ہے، جس کی تحقیق و تفتیش کی ذمہ داری دین نے اپنے اوپر نہیں لی۔ گویا دین اور عقل اپنے اہداف و مقاصد میں کسی بھی مرحلے پر ایک دوسرے سے ٹکراؤ نہیں رکھتے۔ جس طرح زمین کی حرکت یا سکون قرآن سے نکالنا غلط ہے اسی طرح خدا کا وجود محض عقل کی عینک لگا کر ڈھونڈنا بھی غلط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عقل کا نکتہ آغاز ہمیشہ کوئی نہ کوئی مفروضہ ہوتا ہے جس سے وہ سمجھوتہ کر کے اپنی سمت عمل متعین کرتی ہے اور آگے بڑھتی ہے۔ یہ ماتحتی جو عقل کی بناوٹ میں داخل ہے دینی امور میں بھی برقرار رہنی چاہیے۔ یہ از روئے عقل بھی ایک فطری بات ہوگی۔



حیلہ جوئی

حکم ربّانی

﴿فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ تَرَاجَعَا إِنْ ظَنَّا أَنْ يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ.....﴾
(البقرہ: ۲۳۰)

اور اگر شوہر نے تیسری طلاق دی تو پھر جدائی ہوگئی۔ اب وہ عورت اس کے لئے حلال نہیں لیکن اگر وہ عورت کسی اور مرد سے نکاح کرے اور پھر وہ اپنی مرضی سے اسے طلاق دیدے تو ایسی صورت میں پہلے شوہر سے اس عورت کا دوبارہ نکاح جائز ہے، بشرطیکہ دونوں کو اللہ کی حدود پر قائم رہنے کی توقع ہو۔

فرمان نبوی

”الاخبركم بالتيس المستعار؟ قالوا: بلى يا رسول الله (ﷺ)“

قال: هو المحلل، لعن الله المحلل والمحلل له“ (۱)

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: کیا میں تمہیں کرائے کے سانڈ کے بارے میں نہ بتاؤں؟ صحابہ نے کہا: کیوں نہیں یا رسول اللہ (ﷺ)؟ آپؐ نے فرمایا: وہ حلالہ کرنے والا ہے اور اللہ تعالیٰ نے لعنت فرمائی ہے جو حلالہ کرے اور کروائے دونوں پر۔

(۱) سنن ابن ماجہ، کتاب النکاح، باب المحلل والمحلل له

حیلہ جوئی یا بہانے بازی ایک ایسا مرض ہے جو اخلاقی بھی ہے اور نفسیاتی بھی اور اس کے ساتھ ساتھ یہ آدمی کے پورے اندرونی اسٹرکچر کی کسی بڑی خرابی پر دلالت بھی کرتا ہے۔ یعنی حیلہ جو شخص کسی جزدی خرابی میں نہیں بلکہ مکمل بگاڑ میں مبتلا ہوتا ہے۔ انسانوں میں اس طرح کے بگاڑ کی ایک قسم یہ ہے کہ کسی چیز کے ساتھ سچی وابستگی کی شرائط پوری کرنے سے پہلو تہی کی جائے۔ انسانوں کو جتنی خرابیاں لاحق ہو سکتی ہیں ان میں سب سے بنیادی خرابی وہی کہلائے گی جو اس کی صلاحیت تعلق میں فساد پیدا کرے۔ حیلہ جوئی ایسی ہی ایک خرابی ہے۔ اس میں مبتلا شخص بالکل غیر مبہم انداز میں یہ اظہار کرتا ہے کہ وہ دین سے سچا اور سنجیدہ تعلق نہیں رکھتا یا نہیں رکھنا چاہتا۔

حیلہ جوئی کی تعریف یہ ہے: گناہ اور غلطی کی طرز ادائی میں کوئی غیر معمولی تبدیلی کر کے ایک چالاکی کے ساتھ اسے قانونی اعتبار سے قابل قبول بنالینا۔ یعنی حیلہ یہ ہے کہ خوب دھڑلے سے گناہ کرو کہ نعوذ باللہ خود اللہ چکر جائے اور مجبور ہو جائے کہ اسے گناہ نہ سمجھے۔ اس منطق کی لغویت بلکہ شیطنت اتنی ظاہر ہے کہ اسے رد کرنے کے لیے کوئی دلیل لانے کی بھی ضرورت نہیں۔ خالص دینی معاملات کے علاوہ دیگر معاشرتی معاملات وغیرہ میں بھی یہ بیماری طرح طرح سے ظہور کرتی ہے۔ وعدہ خلافی کر کے بہانے گھڑنا، کام چوری کے طریقے ڈھونڈنا، اپنی خرابیوں کو ڈھانپنے کی کوشش کرنا، غرض جھوٹ کو سچ بنانے کا ہر عمل اسی کا مظہر ہے۔

س: آپ نے فقہی حیلہ جوئی اور عمومی بہانے بازی کو ایک ہی صف میں لاکھڑا کیا ہے۔ بلکہ زیادہ واضح لفظوں میں انہیں ایک ہی بیماری قرار دیا ہے اور ایک ہی خرابی کے دو پہلو باور کرایا ہے، جب کہ بظاہر ان میں خاصا فرق نظر آتا ہے؟

ج: ہاں! یہ ٹھیک ہے کہ بظاہر یہ دو مختلف خرابیاں معلوم ہوتی ہیں تاہم اپنے ظاہری روپ میں بھی ان کے درمیان کچھ گہری مماثلتیں پائی جاتی ہیں۔ ہم نے اس امتیاز یا مماثلت پر تکیہ نہیں کیا بلکہ ایک نفسیاتی حقیقت بتائی ہے کہ فقہی حیلہ جوئی اور عمومی بہانے بازی کا مبداء اور محرک ایک ہوتا ہے۔ نفسیاتی اعتبار سے یہ ایک ہی مرض کے دو اظہار ہیں۔ آپ اگر ذرا غور سے دیکھیں تو آسانی سے پتہ چل جائے گا کہ دونوں میں بنیادی چیزیں مشترک ہیں، مثلاً تعلق میں سچانہ ہونا، ذمہ داری سے بھاگنا، غیر سنجیدہ پن، جھوٹ، دھوکا، چالاکی وغیرہ۔ مطلب یہ کہ دونوں کی تعمیر یکساں عناصر سے ہوئی ہے۔ حیلہ کر کے آدمی دین میں ان سب اوصاف کا مظاہرہ کرتا ہے اور بہانہ گھڑ کے دنیا میں۔ ویسے آپ کی آسانی کے لیے ان کی ایک مشترک بنیاد بتائی جاسکتی ہے تاکہ پوری یکسوئی کے ساتھ ان کی ماہیت سمجھ میں آسکے۔ وہ مشترک بنیاد ہے: جھوٹ کو سچ بنانا۔

س: بڑے بڑے علما حیلے کے قائل ہوئے ہیں اور تاحال ہیں، آپ کی یہ بات ان کے موقف سے متصادم نظر آتی ہے؟

ج: آپ نے بہت بر محل سوال کیا۔ ہم اسی کی طرف آنے والے تھے۔ دیکھیے! حیلہ جوئی اور چیز ہے اور فقہی حیلہ اور چیز۔ حیلہ جوئی ایک بڑی انسانی خرابی ہے مگر کسی خاص صورتحال میں گھر جانے پر مجبور کسی حیلے پر عمل کرنا نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ بعض اوقات ضروری بھی ہو جاتا ہے۔ دین میں حیلے کا مطلب ہے شدید عذر

کی حالت میں خود دین کی دی ہوئی رخصت اور لچک سے فائدہ اٹھانا۔ ظاہر ہے کہ اس سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا کہ بعض حالات میں ناجائز عمل کا عدم جواز ساقط ہو جاتا ہے مثلاً کسی مسلمان کی جان بچانے کے لیے جھوٹ بول دینا وغیرہ۔ بلکہ یہ تو قرآن سے ثابت ہے (دیکھیے النحل ۱۶: ۱۰۶ اوص ۳۸: ۴۴)، ہمارا کہنا یہ ہے کہ حیلے کی ضرورت ناگہانی طور پر پیش آتی ہے۔ آدمی کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ حیلے کے جھوٹے سچے مواقع تلاش کرتا پھرے۔ ایسا کرنا شریعت کے ساتھ مذاق کے مترادف ہوگا اور یہی حیلہ جوئی ہے۔

س: دین کی دی ہوئی رخصت اور لچک سے فائدہ اٹھانے والی آپ کی بات سمجھ میں نہیں آئی؟

ج: سامنے کی بات ہے کہ جیسے حالت اضطرار میں مرد ارکھانا جائز ہو جاتا ہے (البقرہ ۲: ۱۷۳)، اسی طرح جھوٹ بولنا وغیرہ بھی جرم نہیں رہتا۔ لیکن اضطرار کا التباس پیدا کر کے حرام کو حلال بنالینا بدترین نافرمانی ہے۔ مثال کے طور پر شریعت کا قانون ہے کہ طلاق یافتہ عورت کا اگر دوسرے نکاح میں بھی نباہ نہ ہو سکے تو وہ طلاق لے کر پہلے شوہر سے دوبارہ نکاح کر سکتی ہے۔ اس قانون کی بنیاد پر حلالے کا پورا ضابطہ گھڑ لیا گیا۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ حلالے کا تصور اپنے ہر جز میں اور ہر صورت حال میں غلط ہے، تاہم اسے جس طرح ایک عمومی ضابطے کی شکل دے دی گئی ہے وہ اس کو قابل قبول حیلہ نہیں رہنے دیتی کیونکہ حلالے کو ایک مستقل ضابطہ مان لیا جائے تو عورت کے نکاح ثانی کا شرعی قانون خود رانی اور نفس پرستی کی نذر ہو جائے گا۔ یہی کیفیت بعض دوسرے فقہی حیلوں کی بھی ہے۔ مختصر یہ کہ جائز حیلہ مقاصد شریعت کے تحفظ کے لیے ہوتا ہے اور اس میں ضروری ہے کہ

اصلی حکم کی روح برقرار رہے۔ حلالے وغیرہ کی صورت میں وہ روح مردہ ہو جاتی ہے۔
 س: حیلہ جوئی پر آپ کی گفتگو وضاحت کے ساتھ آگئی۔ گو کہ بہانے بازی اور اس کے مظاہر واضح ہیں تاہم اس سلسلے میں بھی آپ کچھ ضروری باتیں بیان کر دیں تو بہتر ہوگا؟

ج: بہانے بازی کی تعریف اوپر بیان کی جا چکی ہے اور اس کے مظاہر بہت معروف ہیں، اس لیے ہمارا خیال ہے کہ اس کے دینی اور نفسیاتی ضرر کی نشاندہی کر دی جائے۔

انسان کی ساری بندگی انسان کی قوت تعلق پر منحصر ہے۔ یہ قوت کمزور پڑ جائے تو بندگی کمزور پڑ جاتی ہے۔ اس میں نقص پیدا ہو جائے تو انسان اپنی کلّیت میں ناقص ہو جاتا ہے۔ ہماری تمام صلاحیتیں دراصل اسی قوت تعلق کی تکمیل اور تشکیل کرتی ہیں۔ بہانے بازی کی عادت اسی اہم ترین اور بنیادی ترین وصف کو مجروح کر دیتی ہے۔ نتیجتاً انسانی کمالات کی تمام سطحیں، خواہ دینی ہوں یا نفسیاتی یا معاشرتی، متاثر ہو جاتی ہیں۔ یہی ایک اتنا بڑا نقصان ہے کہ باقی نقصانات کی لمبی فہرست بھی اس کے آگے کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ اصل نقصان تو یہ ہے باقی اسی کی تفصیل ہے مثلاً خود غرضی، مکاری، بے وفائی، جھوٹ، فریب، نفس پرستی، کسل، وعدہ خلافی وغیرہ۔

س: اس کا علاج کیا ہے؟

ج: حیلہ جوئی اور بہانے بازی کا تعلق ان خرابیوں سے ہے جنہیں آدمی قصداً اختیار کرتا ہے لہذا ان سے چھٹکارا پانا بھی اختیاری ہوگا۔ مندرجہ ذیل تدابیر پر عمل کرنے سے اس خرابی کا علاج ممکن ہے:

- کسی بھی قیمت پر وعدہ خلافی نہ ہونے دینا
- ہر حال میں سچ بولنا
- محنت کی عادت ڈالنا
- لوگوں کے ایسے کام کرنا جن میں اپنا کوئی مفاد نہ ہو
- نماز کی پابندی کرنا
- کبھی کبھی نفلی روزے رکھنا



مکاری و عیاری

حکم ربّانی

﴿بَلْ زَيْنَ لِّلَّذِينَ كَفَرُوا مَكْرَهُمْ وَضُوَاعِنِ السَّبِيلِ ، وَمَنْ

يُضِلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ﴾ (الرعد ۱۳: ۳۳)

(اصل بات یہ ہے کہ) کافروں کی نگاہوں میں ان کی مکاریاں خوشنما بنا دی

گئی ہیں۔ وہ راہِ حق سے محروم ہیں اور جسے اللہ گمراہ کر دے اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔

﴿..... وَالَّذِينَ يَمْكُرُونَ السَّيِّئَاتِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ.....﴾ (فاطر ۳۵: ۱۰)

(اور اے نبی!) جو لوگ آپ کے خلاف مکر رہے ہیں (یعنی بری چالیں چل

رہے ہیں) ان کے لئے سخت عذاب ہے۔

فرمان نبوی

— ”ملعون من ضار مومناً أو مكرهه“ (۱)

جو کسی مومن کو نقصان پہنچائے اور اس کے ساتھ مکر کرے وہ لعنتی ہے۔

— ”من ضار ضار الله به ، ومن شاق شاق الله عليه“ (۲)

جو کسی مسلمان کو نقصان پہنچائے گا، اللہ اسے نقصان پہنچائے گا اور جو کسی

مسلمان کے ساتھ سختی کرے گا اللہ اس پر سختی کرے گا۔

(۱) جامع الترمذی، کتاب البرّ والصلة، باب ما جاء فی الخیانة

(۲) جامع الترمذی، کتاب البرّ والصلة، باب ما جاء فی الخیانة

مکاری اصل میں سچ کی آڑ میں جھوٹ کی پرورش کرنے کا نام ہے، یعنی مکار آدمی وہ ہوتا ہے جو اپنے کسی غلط مقصد کو حاصل کرنے کے لیے صحیح باتوں کا سہارا لے۔ گویا مکر کا شجرہ جھوٹ، فریب اور نفاق سے ملتا ہے بلکہ اس میں یہ تینوں خاصیتیں پائی جاتی ہیں۔ نیز مکاری کا ایک گہرا تعلق دنیا پرستی سے بھی ہے۔ مکار شخص اصلاً دنیا پرست ہوتا ہے اور اس کی ساری تگ و دو کا محور دنیا ہی ہوتی ہے۔ دنیاوی نقصان سے بچنا اور دنیاوی فائدے حاصل کرنا اس کا بنیادی ہدف ہوتا ہے۔ مکاری میں کم از کم دو چیزیں مذکورہ بالا خرابیوں کے مقابلے میں زائد ہوتی ہیں۔ ذہانت اور سفاکی۔ اہل مکر ذہین اور ظالم ہوتے ہیں۔ مکر کا شمار ان خرابیوں میں کرنا چاہیے جو آدمی ارادے اور شعور کے ساتھ اختیار کرتا ہے۔ اسی لیے یہ تو کہا جاسکتا ہے کہ فلاں آدمی جھوٹ یا نفاق میں مبتلا ہے لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ مکر اور عیاری میں مبتلا ہے۔ یہ جملہ ہی غلط ہے۔ اس لیے مکاری کے علاج کی تدبیریں بتانا بے معنی ہے۔ ہاں! یہ ہو سکتا ہے کہ ہم مکر کا زور توڑنے کی چند صورتیں نکال لیں اور انہیں عمل میں لائیں تاکہ کسی مکار آدمی کا مکر ہم پر نہ چل سکے۔ نفسیاتی اعتبار سے مکار آدمی کی اصلاح تقریباً ناممکنات میں سے ہے، یعنی کسی کو مکاری سے دست بردار ہونے پر آمادہ کرنا محال ہے۔ چونکہ مکاری بے حسی کی انتہا کا نام ہے لہذا ایسا آدمی کوئی اثر قبول کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ اس کے مکر کا پردہ چاک بھی ہو جائے تو بھی وہ شرمندہ اور تائب ہونے کے بجائے دوسری چالیں سوچنے لگتا ہے۔ اس کے رد عمل کا یہ انداز لامتناہی

ہے۔ مکار آدمی میں تبدیلی پیدا ہونے کی بس دعا ہی کی جاسکتی ہے، کوشش کارگر نہیں ہوتی۔
 س: اس کا مطلب یہ ہوا کہ کسی مکار آدمی میں کوئی تبدیلی پیدا ہونے کی کوئی امید نہیں
 اور یہ بھی کہ اس میں خود کو بد لئے کی خواہش بھی پیدا نہیں ہو سکتی۔ کیا آپ کی گفتگو
 سے یہ نتیجہ نکالنا درست ہوگا؟

ج: جی ہاں! ہم نے یہی کہا ہے مگر ایک اضافے کے ساتھ اوزوہ یہ کہ مکار آدمی کے
 اندر تبدیلی کسی تدبیر سے پیدا نہیں ہو سکتی البتہ بشرط قبولیت دعا سے ضرور پیدا ہو
 سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے کہ جس کا دل چاہے پھیر دے۔
 س: ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ آخر کمر میں ایسی کیا بات ہے کہ اس کا ازالہ کسی بھی
 تدبیر سے نہیں کیا جاسکتا؟

ج: آسان سی بات ہے۔ جب ذہن خود کو بگاڑ کر ارادے اور طبیعت کو اپنے تابع کر
 لے تو اس سے پیدا ہونے والی کسی بھی خرابی کا معالجہ محال ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے
 کہ ذہن، ارادہ اور طبیعت مل کر انسان کو مکمل کرتے ہیں۔ ان تینوں میں پیدا
 ہونے والا ایک ہی بگاڑ انسان کے کل کو مسخ کر دیتا ہے۔ جو خرابی انسان کو
 پورے کا پورا اپنی لپیٹ میں لے لے وہ کسی تدبیر سے دور نہیں کی جاسکتی۔ یاد
 رکھیں علاج کا پہلا اصول مریض کی آمادگی ہوتا ہے۔ مریض آمادہ نہ ہو تو ہر دوا
 اور ہر تدبیر بے اثر ہے۔ مگر ایک ایسا مرض ہے جو مریض کی آمادگی کی ہر صلاحیت
 کو فنا کر دیتا ہے، یعنی طبیعت پر اس کا غلبہ ہے، ارادے پر یہ حاکم ہے، ذہن پر
 اس کا تسلط ہے۔ ایسی صورت میں آمادگی کہاں سے پیدا ہو؟ یہ ہے سارا مسئلہ
 جس نے ہم سے اوپر کبھی گئی باتیں کہلوائیں۔

س: مکمل مایوسی کا اظہار کرنے کی بجائے کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ مکر کو براہِ راست ہدف بنائے بغیر آدمی کے اندر دبے ہوئے کسی داعیہ خیر کو ابھار دیا جائے۔ اس کے ابھرنے سے کیا یہ ممکن نہیں کہ اسے اس لعنت سے نجات مل جائے؟

ج: ہماری نظر میں یہ جذبہ ٹھیک ہے مگر جو تدبیر آپ تجویز کر رہے ہیں وہ بہت اچھی اور نہایت سادہ ہونے کے باوجود مکاری کی خرابی پر شاندار انداز نہ ہو سکے۔ پہلے اس کی وجہ سن لیں۔ جیسا کہ ہم اوپر کہہ آئے ہیں کہ مکر وہ بگاڑ ہے جو آدمی کے وجود میں دور دور تک کسی ایسی قوت کو باقی نہیں رہنے دیتا جو اس کے خلاف اٹھ سکے۔ یہ چیز مکر کی بناوٹ میں داخل ہے، البتہ ہمیں اپنے خیال میں اتنی چٹک ضرور پیدا کر لینی چاہیے کہ ہم اس امکان کو تسلیم کر لیں کہ انسانی لاشعور میں خیر اور نیکی کی کچھ نامعلوم اور نامحسوس صلاحیتیں یا قوتیں چھپی ہوتی ہیں۔ اگر حکمت، بصیرت اور صوفیا کی زبان میں روحانی تصرف کے ساتھ ان صورتوں کو بیدار کر کے شعور میں لے آیا جائے تو مکر کے غلبے کا توڑ ہو سکتا ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہوگا کہ ایسے آدمی کے بعض مفادات پورے کر دیے جائیں اور ساتھ ساتھ اس میں حس تعلق پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہ حس جو انسانیت کی بنیاد ہے، پیدا ہو گئی تو مکر کے پھیلانے ہوئے جال میں ایک بڑا رخنہ پڑ جائے گا۔ اس رخنے سے آہستہ آہستہ فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ جیسے جیسے حس تعلق قوی ہوتی جائے گی مکر کا زور ٹوٹا جائے گا۔ یہ بات آپ کے سوال سے سوچھی ہے، اس کے لیے آپ کا شکریہ۔

دوسری چیز یہ بھی دیکھ لینی چاہیے کہ بعض اوقات آدمی میں مکاری و عیاری کے

عدم یکسوئی

حکم ربانی

— ﴿قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ﴾
(المؤمنون ۲۳: ۲۴)

وہ ایمان والے یقیناً فلاح پائیں گے جو اپنی نمازیں خشوع کے ساتھ پڑھتے ہیں۔
— ﴿وَيَخْرُونَ لِلْأَذْقَانِ يَسْكُونُونَ وَيَزِيدُهُمْ خُشُوعًا﴾ (الاسراء ۱۰۹: ۱۱۰)
اور وہ منہ کے بل اللہ کے حضور گر گڑاتے ہیں، ان کی آنکھیں اشک باریبوتی
ہیں اور قرآن ان کے خشوع کو بڑھا دیتا ہے۔

فرمان نبوی

— ”سئل النبي ﷺ عن الوسوسة، قال: تلك محض الايمان“ (۱)
نبی کریم ﷺ سے وسوسہ کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ وہ تو
ایمان کی نشانی ہے۔

— ”عن ابی ہریرۃ ان رسول اللہ دخل المسجد فدخل رجل
فصلی فسلم علی النبی ﷺ فرد، فقال: ارجع فصل فانک لم تصل،
فرجع فصلی کما صلی، ثم جاء فسلم علی النبی ﷺ. فقال: ارجع فصل
فانک لم تصل ”ثلاثاً“، فقال، والذي بعثک بالحق ما احسن غیره
فعلمنی۔ فقال: اذا قمت الی الصلوۃ فکبر، ثم اقرأ ما تيسر معک من
القرآن، ثم اركع حتى تطمئن راكعاً، ثم ارفع حتى تعتدل قائماً، ثم
اسجد حتى تطمئن ساجداً، ثم ارفع حتى تطمئن جالسا، وافعل ذلك

(۱) صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان الوسوسة فی الایمان

فی صلاة کھلا“ (۱)

حضرت ابو ہریرہ فرماتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ مسجد میں تشریف لائے۔ اسے میں ایک آدمی مسجد میں آیا، نماز ادا کی اور آکر آپؐ کو سلام کیا۔ آپؐ نے اسے فرمایا: جاؤ جا کر نماز ادا کرو، تم نے نماز ادا نہیں کی۔ وہ واپس گیا اور اسی طرح نماز ادا کی جیسے پہلے ادا کی تھی۔ پھر وہ آپؐ کے پاس آیا اور سلام کیا آپؐ نے فرمایا واپس جاؤ اور نماز ادا کرو، تم نے نماز ادا نہیں کی۔ اس طرح تین دفعہ ہوا تو اس آدمی نے کہا: یا رسول اللہ ﷺ مجھے اس سے بہتر نماز پڑھنی نہیں آتی، آپ مجھے سکھا دیجیے۔ اس پر آپؐ نے فرمایا: جب تم نماز کا ارادہ کرو تو اللہ اکبر کہہ کر نماز شروع کرو پھر (الحمد کے بعد) قرآن کریم کا کچھ حصہ تلاوت کرو، پھر رکوع کرو اور پورے اطمینان سے رکوع کرو، پھر کھڑے ہو جاؤ اور پوری طرح سیدھے ہو کر اطمینان سے کھڑے رہو، پھر سجدہ کرو اور مکمل اطمینان سے سجدہ کرو، پھر سجدے سے اٹھو تو (دوسرا سجدہ کرنے سے پہلے) اطمینان سے بیٹھو۔ اور اسی طرح ساری نماز ادا کرو۔

یکسوئی خصوصاً عبادات میں یکسوئی کی تین قسمیں ہیں: ۱۔ ذہنی ۲۔ طبعی اور ۳۔ ارادی۔ اگر ان میں سے کوئی قسم بھی بندے کو نماز وغیرہ میں میسر ہو تو اس کی عبادت مائل بہ کمال کہلائے گی۔

موجودہ زمانے میں آدمیوں کی ساخت کچھ ایسی ہو گئی ہے کہ یکسوئی کے تینوں مدارج کا بیک وقت حاصل ہو جانا تقریباً ناممکن ہو کر رہ گیا ہے۔ اس صورتحال میں اگر کوئی شخص محض ارادی یکسوئی پر بھی قادر ہو تو وہ عبادت کے بنیادی حق کو ایک لحاظ سے پورا کر لیتا ہے۔ ایسے آدمی کو یکسوئی نہ ہونے کا مریض نہیں کہا جائے گا۔ مشکل اس وقت پیدا ہوتی ہے جب ہم یکسوئی کا آئیڈیل مفہوم اپنے عمل پر منطبق کر کے دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس سے تشویش

(۱) صحیح بخاری، کتاب الاذان، باب وجوب القراءة للامام.....

اور خلفشار پیدا ہوتا ہے اور اچھی بھلی عبادت کی ناقدری کا خطرہ رونما ہو جاتا ہے۔ اس لیے یہ بات پہلے ہی ذہن میں محفوظ ہونی چاہیے کہ یکسوئی کا وہ فقدان جو شرعاً مذموم ہے دراصل یکسوئی کی مذکورہ بالا تینوں قسموں کے فقدان کا نام ہے۔

اگر کوئی شخص نیت اور قصد کی قوت سے اپنے معبود کی طرف یکسو ہے لیکن یہ یکسوئی خیالات کی آمد اور طبیعت کی بیزاری وغیرہ کو ختم نہیں کر پاتی تو بھی شرعی معیار سے اس آدمی کو اپنی عبادات میں یکسو رہنے والا کہا جائے گا۔ ہاں! اگر اس کا ارادہ بھی یکسو نہیں ہے تو پھر گویا وہ عبادت نہیں کر رہا۔ اس کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی شخص نماز پڑھے مگر اپنے معبود کو فراموش کر کے۔ ظاہر ہے کہ اس فعل کو عبادت کا نام برگر نہیں دیا جاسکتا۔ عبادت کا لازمی مطلب اپنے معبود کی طرف رخ کرنا ہے خواہ ارادے سے ہو، خواہ ذہن اور طبیعت سے۔ اس اصول کی روشنی میں عبادات اپنی تمام تر عظمت اور گہرائی کے ساتھ بالکل فطری اور سہل ہو جاتی ہیں۔ یہ اصول یاد رہے کہ سچا بندہ اپنی عبادات کی طرف سے بلاوجہ کے وسوسوں کا شکار نہیں ہوتا۔ یہاں ہمارا موضوع یہ ہے کہ آج کل بہت سے نمازی ایسے ہیں جنہوں نے خود کو اس فطری یکسوئی کی استعداد سے بھی محروم کر لیا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے پورے شعور اور ارادے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے منہ موڑ رکھا ہے۔ ان کی تمام عبادات کسی اور محرک اور سبب کی بنا پر ہیں، بندگی کا تقاضا ان سے غائب ہے۔

مختصر یہ کہ عبادات میں یکسوئی نہ ہونے کا قطعی اور حتمی مطلب یہ ہے کہ دوران عبادت بندہ اپنے معبود سے غافل رہے اور اس غفلت کا اسے علم اور احساس بھی نہ ہو۔ یعنی یہ وہ آدمی ہے جو اپنے رب کو بھلانے پر راضی ہے اور یہ غفلت بھی ارادی ہے۔ یہ صورت بہت خطرناک ہے اور افسوس کی بات یہ ہے کہ یہ ایک وبا کی طرف پھیلتی بھی جا رہی ہے۔

جن خرابیوں کو آدمی خود اختیار کرتا ہے ان کا علاج اس پر نہیں چھوڑا جاسکتا، البتہ ہم حفظ ماقدم کے طور پر کچھ ایسی تدابیر کو اپنا معمول بنا سکتے ہیں جن کی برکت سے اس بیماری کے حملے سے محفوظ رہا جاسکتا ہے۔ وہ تدابیر یہ ہیں:

۱۔ نماز کو اس کے پورے آداب کے ساتھ ادا کرنا یعنی اطمینان، سکون اور اہتمام سے۔

۲۔ قرآن سے زندہ تعلق پیدا کرنے کی کوشش کرنا۔ اس کی سادہ سی ترکیب یہ ہے کہ تلاوت کے دوران میں اپنی زبان میں سہی مگر خوب تکلف سے رُٹا کر یہ دعا مانگنا کہ یا اللہ! اس کتاب کو میری زندگی کا مرکز، میری امیدوں کا محور، میرے اعمال کا مدار اور میری آخرت کا نور بنادے۔ یا اس طرح کی حسب حال دیگر دعائیں۔ یہ یقین رکھیں کہ ایسا کبھی ہو ہی نہیں سکتا کہ آدمی پوری طرح ڈوب کر قرآن پڑھنے کی کوشش کرے اور بیچ بیچ میں اللہ تعالیٰ کو پکارے اور اس کے بعد بھی قرآن اس کا حال نہ بنے۔

۳۔ ہر عبادت کے آغاز اور دوران میں حدیث احسان کو ذہن میں تازہ کرنا۔ عبادات میں یکسوئی کا یہ موثر ترین ذریعہ ہے۔

۴۔ وقتاً فوقتاً اللہ تعالیٰ کو پکارنے کی عادت ڈالنی چاہیے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ سے تعلق میں بے تکلفی اور دوام پیدا ہوتا ہے۔

۵۔ گھروالوں اور بے تکلف دوستوں میں بیٹھ کر دینی باتیں کرنی چاہئیں۔ اس طرح دین ایک زندہ اور سب پر ترجیح رکھنے والی حقیقت کی حیثیت سے شعور، ارادے اور طبیعت میں قائم ہو جاتا ہے اور اس میں محبوبیت کا رنگ بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ اور یہ بات محتاج تشریح نہیں کہ دین کی محبت حاصل ہو جائے تو

عبادات میں یکسوئی نہ ہونے کا امکان بھی باقی نہیں رہتا۔

۶۔ رسول اللہ ﷺ کی سیرت طیبہ اور صحابہ کرامؓ اور سلف کے تذکروں کا مطالعہ آدمی کی اندرونی بناوٹ کو بندگی کی روح سے ہم آہنگ کر دیتا ہے۔ ہماری رائے میں ایسے علم و تحصیل اکثر فنی علوم سے زیادہ افضل اور نافع ہے۔

س: عبادات میں یکسوئی کا فقدان کسی نفسیاتی عدم توازن سے بھی تو پیدا ہو سکتا ہے۔ اس کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

ج: نفسیاتی عارضے سے پیدا ہونے والی عدم یکسوئی شرعاً عذر ہے اور عبادات کی قبولیت کو متاثر نہیں کرتی۔ یہ ضرور ہے کہ ایسا شخص اپنی عبادات کی طرف سے مطمئن نہیں رہتا اور یہ بے اطمینانی اسے عبادات سے دور بھی کر سکتی ہے تاہم یہ کوئی شرعی خرابی نہیں ہے۔ ہم اس کے علاج میں کچھ باتیں عرض کر سکتے ہیں لیکن عام طور پر نفسیاتی بیماریاں بہت پیچیدہ اور انفرادی ہوتی ہیں، اس لیے ایسے آدمی کو چاہیے کہ وہ کسی نفسیاتی معالج سے رجوع کرے۔

س: اوپر آپ نے یکسوئی کی تین قسمیں بیان کی ہیں یعنی ذہنی، طبعی اور ارادی۔ ایک عام آدمی شائد انہیں نہ سمجھ سکے لہذا بہتر ہوگا کہ ان کی کچھ وضاحت کر دی جائے۔

ج: ذہنی یکسوئی کا مطلب ہے عبادات میں کوئی ایسا خیال نہ آنا جو اس عبادت کی مجموعی فضا سے خارج ہو مثلاً اپنے کسی مسئلے کا، کسی کام کا یا کسی چیز کا خیال۔ طبعی یکسوئی کا مطلب ہے عبادت کے دوران میں عبادت کی طرف راغب رہنا اور اس سے مختلف کیفیات قبول نہ کرنا۔ ارادی یکسوئی کا مطلب ہے عبادت کی نیت کا حاضر رہنا۔

س: بعض لوگوں کا خیال ہے کہ نماز وغیرہ میں جو وساوس آتے ہیں وہ یکسوئی کے فقدان پر دلالت کرتے ہیں، کیا یہ خیال صحیح ہے؟

ج: یہ خیال بالکل غلط ہے۔ وساوس غیر اختیاری ہوتے ہیں اور غیر اختیاری چیزیں شرعاً قابل مواخذہ نہیں ہوتیں۔ ان کی وجہ سے بس یہ ہو سکتا ہے کہ بندہ کمالات عبادت تک رسائی حاصل نہ کر سکے۔ جب تک آدمی وسوسوں پر راضی نہیں ہے اسے عدم یکسوئی سے حفاظت حاصل ہے جو عبادت کی روح کو غارت کر دیتی ہے، لہذا یہ کوئی ایسا مرض نہیں ہے جس کے علاج کو لازمی گردانا جائے۔ یہ ٹھیک ہے ایسی کوشش کرتے رہنا چاہیے جن سے وساوس کا راستہ بند ہو سکے لیکن یہ کوششیں گناہ سے بچنے سے زیادہ کمالات کے حصول کے لیے ہوتی ہیں۔ ان کوششوں کی ایک مختصر سی فہرست یہ ہے:

— عبادات کی ادائی سے پہلے وساوس سے محفوظ رہنے کی دعا کرنا

— نماز اور تلاوت میں الفاظ کی صورت کو تصور میں لانا

— عبادات میں رونے کی کوشش کرنا

www.KitaboSunnat.com

— نماز میں لمبا رکوع اور لمبا سجدہ کرنا

— وساوس کی آمد پر دل کی زبان سے اللہ کا شکر ادا کرنا کہ ان پر پکڑ نہیں ہوگی

وسوسے کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے یہ ذہن میں رہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس کی مذمت نہیں فرمائی بلکہ الٹا اسے ایمان کی نشانی قرار دیا ہے (۱) البتہ اسے نقیض کمال قرار دیتے ہوئے (۲) اس سے تعوذ کا حکم دیا ہے۔ (۳)

۱۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان الوسوسة فی الایمان

۲۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوة، باب کراهیة الوسوسة

۳۔ جامع ترمذی، ابواب الدعوات، باب دعاء المعرفة

یہ کتاب

ایک مسلمان کا ہدف اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتا ہے کہ وہ معصیت اور رذائل سے بچ جائے لیکن جھوٹ، غیبت اور کبر جیسے بہت سے گناہ ایسے ہیں جن میں انسان مبتلا ہوتا ہے لیکن اسے ان کا شعوری احساس نہیں ہوتا اور بسا اوقات علم ہو بھی جائے تو اسے سمجھ نہیں آتی کہ وہ ان پر قابو کیسے پائے اور ان سے کیسے بچے؟ 'ترک رذائل' ایک کوشش ہے ان لوگوں کو مدد دینے کی جو رذائل سے بچنا چاہتے ہیں۔ اسے پڑھ کر انہیں ان رذائل کا شعوری احساس ہوگا، ان میں مبتلا ہونے کے نفسیاتی اسباب اور نقصانات کا پتہ چلے گا اور ان سے بچنے کی تدبیریں معلوم ہوں گی۔ ان تدبیروں پر عمل کر کے وہ رذائل سے بچ سکتے ہیں۔ کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ ڈاکٹر محمود احمد غازی مرحوم نے مرتبہ کوفون پر بتایا کہ انہوں نے اس کتاب سے بہت استفادہ کیا ہے۔ 'ترک رذائل' کے بعد اکتساب فضائل بھی زیر تصنیف ہے۔

احمد جاوید

محقق صوفی، مربی، عالم، دانشور، ادیب، شاعر، ماہر اقبالیات۔ احمد جاوید صاحب کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ جدید نفسیات و فلسفہ کے بھی ماہر ہیں اور تزکیہ نفس کی کلاسیکی صوفی روایت کے بھی شناور ہیں۔ تربیت اور انسان سازی ہی ان کا اور ڈھنا بچھوتا ہے۔ تزکیہ و تربیت کے جدید و قدیم علوم و اسالیب کے حامل ہونے کے علاوہ جس چیز نے انہیں منفرد بنا دیا ہے وہ یہ امر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں تصوف کی مروجہ خرابیوں سے بچنے کی توفیق دے رکھی ہے۔ ان کی سادگی اور بے نفسی کا یہ عالم ہے کہ ان میں اور ایک عام آدمی میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر محمد امین

ڈاکٹر محمد امین قدیم و جدید کے ماہر اور علوم اسلامی کے استاد، محقق اور مصنف ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی کے دائرہ معارف اسلامی سے وابستہ رہے۔ آج کل یونیورسٹی آف مینجمنٹ و ٹیکنالوجی لاہور میں اسلامی فکر و تہذیب کے صدر شعبہ ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی سے آپ کی پی ایچ ڈی اسلام اور تزکیہ نفس کے موضوع پر ہے جسے اردو سائنس بورڈ نے طبع کیا ہے۔ پچھلی ربع صدی سے اصلاح تعلیم کی تحریک چلا رہے ہیں جس میں ان کے پیش نظر نسل نو کی اسلامی تربیت ہی ہے۔

تحریک اصلاح تعلیم (ٹرست)

71-A فیصل ٹاؤن، لاہور

0300-4609522, 0300-4354673

Rs. 350.00

محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ